مجلۂ عثمانیہ

طلبۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیر:- محمد یونس سلیم

بی اے (جامعۂ عثمانیہ)

نائب مدیر:- محمد افضل الدین

متعلم سال چہارم

مطبوعۂ شمس المطابع مشین پریس حیدرآباد دکن

مجلس انتظامی

جلد (۱۱) — سال تعلیمی ۱۳۴۸ف — شمارہ ۱ اور ۲

(صدر)

قاضی محمد حسین صاحب

ایم اے۔ ال ال بی کینٹب

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصہ اردو)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بی اے (علیگ) ڈی لٹ

پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام اے پی ایچ ڈی (لندن)

مددگار پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصہ انگریزی)

مسٹر ایف۔ جے۔ اے ہارڈنگ ام اے (آکسن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب بی ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد)

محمد یونس سلیم متعلم ال ال بی (آخری) مہتمم مدیر؛ مدیر حصہ اردو مجلہ عثمانیہ

(اراکین)

محمد بن عمر صاحب بی اے صدر انجمن اتحاد

محمد فضل الدین صاحب نائب مدیر حصہ اردو متعلم سال اول علم

محمد عبدالجبار صاحب مدیر حصہ انگریزی متعلم ال ال بی (آخری)

مسٹر پدمنابھ نائب مدیر حصہ انگریزی متعلم ام ایس سی

مجلّہ عثمانیہ

جلد (۱۱) شمارہ (۱) اور (۲)

مجلس مشاورت

قاضی محمد حسین صاحب

ایم اے ال ال بی (کینٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مشیر حصۂ اردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بی اے علیگ (ڈی لٹ) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) مددگار پروفیسر جامعہ عثمانیہ

مشیر حصۂ انگریزی

مسٹر ایف۔ جے۔ اے ہارڈنگ ام اے (آکسن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمٰن صاحب بی۔ ایس سی پروفیسر طبیعیات

معتمد اعزازی

محمد یونس سلیم متعلم ال ال بی (آخری)

مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

چندہ سالانہ پیشگی

(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ سے	۵ ۱۲ روپے
(۲) ارباب جامعہ اصحاب مقتدر اور اداروں سے	عہ ,,
(۳) عام خریداروں سے	۶ ,,
(۴) طلبائے قدیم ”رفاہیہ انجمنوں اور دار المطالعوں سے	صہ ,,
(۵) طلبائے کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	للعہ ۴ ,,
(۶) ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
(۷) بلاد یورپ کے طلبائے قدیم کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ شلنگ
(۸) فی رسالہ	۲ عہ روپے

ملنے کا پتہ

دفتر ”مجلہ عثمانیہ“ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۲ الف)

فہرست مضامین مجلّہ عثمانیہ

جلد یازدہم شمارہ اول و دوم

(ب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دو آتشہ

(۱)

آٹھ پہر کی یہ بے چینی یہ بیتابی کیا کہیے
حد سے گذری دل کی خرابی دل کی خرابی کیا کہیے

تم کیا جانو کیا شے ہے طوفان سرشکِ خونیں کا
تم نے چھلکتی ہی نہیں دیکھی دل کی گلابی کیا کہیے

ہائے وہ پہلی نظروں میں ہر موج کا ساحل بن جانا
بحرِ بے پایانِ محبت کی پایابی کیا کہیے

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انھیں معلوم نہیں
پھولوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہیے

ہوش جنھیں دل بنکر آیا اُن کی تڑپ کا کیا کہنا
غم نے جنھیں بیدار کیا، ان کی بیخوابی کیا کہیے

کتنے فتنے جمع کیے ہیں ان کی ایک جوانی نے
چال قیامت، کافر نظریں، آنکھ شرابی کیا کہیے

خاکِ وطن ہی راس نہ آئی غربت تو پھر غربت ہے
فانیؔ اپنی خانہ بدوشی خانہ خرابی کیا کہیے

(۲)

کچھ ہوش گنوانے کے چرچے کچھ ہوش میں آجانے کے
یہ دونوں عالم کچھ بھی نہیں ٹکڑے ہیں مرے افسانے کے

کچھ حسرت کے آثار سے ہیں کچھ دل سا ٹھہرا جاتا ہے
وحشت سے گذرتے جاتے ہیں انداز ترے دیوانے کے

دل کی بہ حقیقت ہی کیا کہیے حسن بھی دل ہے عشق بھی دل
ہر شمع جلائی جاتی ہے پردہ میں کسی پروانے کے

بیداد پہ کہیے اف نہ کریں کہیے تو تڑپ کر دم دیدیں
کچھ شغل ہمیں بھی آتے ہیں سرکار کا دل بہلانے کے

وہ پرسشِ حال نہ فرمائیں تو جرأتِ عرضِ حال کہاں
آج اُن کے نہ فرمانے میں شاید تیور تھے فرمانے کے

پیغامِ سکوتِ مرگ آیا جب ہجر کی پچھلی رات ڈھلی
اب جاگنے والی آنکھوں پر آثار کھلے نیند آنے کے

وہ جادۂ ہستی ہو فانی یا راہِ محبت ہو کچھ ہو
ہر غم کے لئے دو رستے ہیں اور وہ بھی مرے غمخانے کے

فانی بدایونی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

الحمدللہ مجلہ عثمانیہ کی گیارھویں جلد کا پہلا اور دوسرا مشترک شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے ۳۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو ہمیں جائزہ دیا گیا اور یہ مارچ کا دوسرا ہفتہ ہے کہ تقریباً تین سو صفحہ کا رسالہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہے ہیں۔ اس قلیل مدت میں مجلہ کو کامیابی کے ساتھ شایع کرنے کی جو کوششیں ممکن تھیں اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا اور ہم اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ خود آپ ہی کریں گے۔ اگر امتحان کی کشمکش اور شہر کار سرکار کی مہربانیاں دامنگیر نہ ہوتیں تو شاید مجلہ کچھ دن اور پہلے اس سے بہتر صورت میں شایع ہو چکا ہوتا۔

اس مجلہ میں جو مضامین شایع ہو رہے ہیں ان کے متعلق بھی ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔ سب سے زیادہ سعی ہم نے اس بات کی کی کہ مجلہ میں ایسے مضامین شایع ہوں جو زبان کے لحاظ سے بلند ہوں اور اپنے میں عمومی دلچسپی کا سامان رکھتے ہوں۔ صرف ادبی معاشی اور سیاسی مضامین تمام طلبا کے لئے یکساں تفریح کا باعث نہیں ہو سکتے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ جامعہ میں جتنے شعبے قائم ہیں ان سب شعبوں کے مضامین مجلہ کے لئے فراہم کئے جائیں تاکہ ہر طالب علم کو اپنے ذوق کے مطابق کوئی نہ کوئی مضمون پڑھنے کے لئے مل سکے مگر ہمیں بڑی نا امیدی ہوئی جب ہماری پیہم استدعاؤں کے بعد بھی بعض شعبوں سے مضامین نہیں وصول ہوئے اور آئے بھی تو ایسے مضامین جن کی ان سے توقع نہیں کی جاتی تھی۔ مثلاً کلیہ انجینیری اور کلیہ طبیہ سے رباعیات اور افسانے مجلہ میں شایع کرنے کے لئے بھیجے گئے ہمیں ان

سلسلہ میں اپنے تمام اہل قلم برادران جامعہ سے یہ عرض کرنا ہے کہ ہم مجلہ میں بالعموم صرف ایسے ہی مضامین شایع کرتے ہیں جو علمی اور تحقیقی ہوں اور طلبا سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے مضامین تحریر فرمائیں گے تاکہ ہم اپنی جامعہ کے تمام شعبوں کی نمایندگی مجلہ کے ذریعہ سے کرسکیں اور اپنے ہر قسم کے علوم وفنون کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوں افسانے اور غزلیں شایع کرنے والے رسالے ہندوستان میں بہت ہیں۔ اگر مجلہ عثمانیہ بھی اس قسم کے مضامین کی اشاعت شروع کرے تو دوسرے "ہلکے قسم" کے رسالوں میں اور اس میں فرق ہی کیا باقی رہے گا۔ اس سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم افسانے اور غزلیں بالکل شایع ہی نہیں کرنا چاہتے۔ اگر مجلہ کے شایان شان غزلیں اور افسانے ہم کو ملیں تو ہم نہایت مسرت سے ان کی اشاعت کے لئے آمادہ ہیں چنانچہ اس مرتبہ ہمیشہ سے زیادہ غزلیں مجلہ میں شایع ہو رہی ہیں اور کوئی شک نہیں کہ ادبی افادیت کے لحاظ سے غزل کی اہمیت نظم سے کسی طرح کم نہیں ہے جو لوگ اردو میں غزل گوئی کے مخالف ہیں وہ شاید غزل کی خوبیوں کو سمجھ نہیں سکے۔

ہم کو جتنے افسانے وصول ہوئے ان میں صرف ایک ہی افسانہ ایسا تھا جس پر درحقیقت لفظ "افسانہ" کا اطلاق ہو سکتا ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ افسانہ "کلیۂ اناث" کی ایک طالبہ کا ہے۔ یہ افسانہ بیشک ایک معیاری افسانہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشاق افسانہ نگار کے قلم سے نکلا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور مضامین کلیۂ اناث کی طالبات کے شایع ہو رہے ہیں جس میں سے ایک "کارپنٹر" کے کسی ادبی شاہکار کا ترجمہ ہے۔ اور بہت کامیاب ترجمہ ہے۔ دوسرا مضمون "ادب لطیف" کے دو ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ جو افسانے شایع نہیں کئے گئے وہ یا تو زبان کے لحاظ سے اس قابل نہ تھے کہ مجلہ میں جگہ پا سکیں یا آرٹ کے لحاظ سے ان میں خامیاں تھیں۔ بقیہ مضامین جو اس شمارہ میں شایع ہو رہے ہیں وہ سب علمی یا تحقیقی ہیں اور ان میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مضمون "اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں" اپنی نوعیت کا بہترین مضمون ہے اور ہم اس مقالہ کو فخر کے ساتھ شایع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

حصہ نظم میں جہاں تک طلبا کی نظموں کا تعلق ہے ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نظمیں اتنی معیاری نہیں جتنی کہ ہونا چاہئیں اور یہ کمزوری مجلہ کے گذشتہ شماروں میں بھی پائی جاتی ہے یہ امر ایک حد تک باعث افسوس ہے کہ جامعہ عثمانیہ نے دو چار اصحاب کے علاوہ اب تک کچھ زیادہ اچھے شاعر پیدا نہیں کئے۔ ہر چند کہ اچھے شاعر پیدا کرنا کسی یونیورسٹی کے فرائض میں داخل نہیں ہے لیکن جامعہ عثمانیہ ایسے تعلیمی مرکز میں جو اردو علم ادب کا گہوارہ ہو اعلیٰ مصنفین اور بہترین انشا پردازوں کے ساتھ ساتھ اچھے شاعروں کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے تاہم ناامیدی کی ضرورت نہیں ہے ہمارے جامعہ میں بعض خوش فکر طالب علم ایسے ہیں جو اگر بے راہ روی میں نہ پڑ گئے تو مادر جامعہ کے لئے باعث افتخار ثابت ہوں گے۔

دکن نے اہل کمال کی ہمیشہ قدر شناسی کی ہے۔ اور اس کو جغرافی حدود تک کبھی محدود نہیں رکھا ہے، قزلباش خاں امید اور موسوی خاں حیدرآبادی نہ تھے لیکن بانی دولت آصفیہ کو ہمیشہ ان پر فخر رہا موسوی خاں کی قابلیت سے متاثر ہو کر بادشاہ نے جب ان کو لینا چاہا تو

نواب مغفرت مآب نے عذر کیا کہ ابوالفضل کے بعد دربار اکبری میں کیا رہ گیا۔ ذوق کے استاد شاہ نصیر اپنے زمانہ میں ادب اردو کے شاید سب سے بڑے محسن تھے۔ حیدرآباد نے ان کی منزلت کی دل کھول کر داد دی جس کی داستانیں مہاراجہ چندو لال کی بارہ دری کو اب تک یاد ہوں گی شاہ صاحب کو یہ ادا ایسی بھائی کہ آخر یہیں کے ہو رہے اور آج تک رود موسیٰ کے کنارے نئے پل کے قریب موسیٰ شاہ قادری کی درگاہ میں خواب عدم میں غرق ہیں۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصف سابع خلد اللہ سلطانہ کی شان جلالت آج اس وقت تیرہ سو برس کی جلالت شان کی یادگار ہے۔ اس درخشندہ و تابناک عہد گوہرین میں بدون کسی تفریق کے ہر ملک کے اہل کمال فراہم ہیں اور بہ قدر حال ان سب کے افادات سے ملک مستفید ہو سکتا ہے۔ انھیں مایۂ ناز نفوس ادبیہ میں ایک علامہ عبداللہ العمادی اور دوسرے مولوی شوکت علی خاں فانی کی ذات مجمع الصفات بھی ہے علامہ موصوف کا ایک مضمون اور حضرت فانی کی دو غزلیں ابھی ابھی نظر افروز ہوں گی جن کے لئے ہم ان دونوں حضرات کے دلی سپاس گذار ہیں۔

اس سال جامعہ الہ آباد نے ہماری دولت ابد مدت کے تین معزز و محترم اصحاب کو اعزازی ڈگریاں عنایت کیں۔ رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کی علمی اور معاشری خدمات کا اعتراف ابھی چند ماہ قبل آکسفورڈ یونیورسٹی میں کیا جا چکا ہے۔ انگلستان کے بعد الہ آباد یونیورسٹی نے بھی نواب مستطاب کو ال ال ڈی کی اعزازی ڈگری دے کر "اس اعتراف خدمات" پر شمالی ہند کے باشندوں کی طرف سے بھی مہر توثیق ثبت کر دی۔

ہر وہ شخص جو اردو سے ذرا بھی مناسبت رکھتا ہے مولوی عبدالحق صاحب کا نام ضرور جانتا ہوگا۔ مولوی صاحب نے معمار اردو کی حیثیت سے "ایوان اردو" کی تعمیر اور اس کی آرائش و زیبائش میں جتنا حصہ لیا ہے وہ اندازہ میں نہیں آ سکتا۔ ان کی خاموش محنت اور پر خلوص خدمت اگرچہ نشر و اشاعت سے مستغنی رہی پھر بھی جو جوہر شناس ہیں وہ جانتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ اگر آج مولوی صاحب نہ ہوتے تو اس "اردو ہندی" کے قضیے نے خدا معلوم کتنی نازک صورت اختیار کر لی ہوتی۔ مولوی صاحب نے جس سہولت اور رواداری سے اس گتھی کو سلجھایا ہے وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مولوی عبدالحق صاحب سے زیادہ جامعہ الہ آباد قابل مبارکباد ہے کہ اس نے سب سے پہلے ان کی خدمات کو سراہ کر تمام ہندوستانی جامعات میں طرۂ امتیاز حاصل کیا۔

سرزمین حیدرآباد کے لئے یہ امر بھی کچھ کم باعث فخر نہیں کہ وہ مسز سروجنی نائڈو ایسی شیرین زبان مقررہ اور جادو بیان شاعرہ کا مولد و مسکن ہے۔ مسز نائڈو نہ صرف سحر آفریں مقررہ اور انگریزی زبان کی بلند پایہ شاعرہ ہیں بلکہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی سیاست داں بھی ہیں جس سے ہندوستان کا ہر فرد واقف ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی نے انھیں بھی ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دے کر ان کی "بزرگی" اور شخصیت کا اعتراف کیا ہے۔ ہم ان تینوں اصحاب کی خدمت میں ایک تہ

اور ہدیہ مبارکباد پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ ہماری جامعہ کا جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا تھا اور اس جلسہ میں ملک کے چار افراد کی خدمتوں میں اعزازی ڈگریاں پیش کی گئیں۔ ان میں بہت نمایاں شخصیت ہماری جامعہ کے قدیم سرپرست اور سابق امیر جامعہ صدر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کی تھی۔ مہاراجہ بہادر میں ان کی علمی ادبی خصوصیات کے علاوہ سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ قدیم مشرقی تہذیب تمدن کی ہندوستان میں یکتا یادگار ہیں۔ اور ان کی ایک ذات میں اتنی خوبیاں اکٹھا ہو گئیں ہیں کہ کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ نے ان کو ال ال ڈی کی اعزازی ڈگری دے کر گویا ان کے احسانوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔

رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو اپنی قانونی استعداد سیاسی معلومات اور علمی و ادبی دستگاہ کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور اور سر اقبال نے دنیا کے سامنے اپنی شاعری اور علمی معلومات کے جو خزانے لٹائے ہیں اس کا اعتراف کرنا حیدرآباد جیسی قدر شناس اور جوہر آشنا سرزمین کے لئے لازمی تھا چنانچہ اس سال جامعہ عثمانیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کی یہ تاریخی اہمیت کبھی بھلائی نہیں جاسکتی کہ اس نے ملک کے ان یگانۂ روزگار افراد کی خدمتوں میں اعزازی سندیں پیش کر کے اپنی علم نوازی اور جوہر شناسی کا ثبوت دیا۔

آخر میں ہم اپنی جامعہ کے اہل قلم طلبا کو ایک خوش خبری سنانا چاہتے ہیں وہ یہ کہ حسب تحریک جناب محمد بن عمر صاحب صدر انجمن اتحاد مجلۂ عثمانیہ کی مجلس انتظامی نے اپنے گذشتہ اجلاس میں اس امر کا تصفیہ کیا ہے کہ مجلۂ عثمانیہ کی جانب سے سال میں دو انعام ایسے طالب علموں کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے جو اردو میں سب سے بہتر مضامین مجلہ کے لئے روانہ کریں گے اور اسی طرح دو انعامات ان طالب علموں کو دئیے جائیں گے جو حصۂ انگریزی کے لئے سب سے اچھے مضامین لکھیں گے۔ مضامین کے لئے کوئی عنوان مخصوص نہ ہوگا۔ اس کے متعلق تفصیلی اطلاع بعد میں شایع کی جائے گی۔

اس شمارہ کے مقالات و منظومات کے لئے زبان شکر اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی شان تحقیق حد سپاس سے بلند تر ہے حصۂ نظم میں مولانا صدق جائسی مولوی علی اختر، جناب نجم آفندی اور مولانا ماہر القادری کے ہم خاص طور پر شکر گذار اور ساتھ ہی ہم اپنے اہل قلم برادران جامعہ کی شان کو شکر و ثنا سے مستغنی سمجھتے ہیں اگرچہ ہمارا دل سب سے زیادہ انھیں کا ممنون منت ہے۔

سلیم

تیرے بغیر

آگہ میری روح ہے ناشاداں تیرے بغیر
میری بیداری ہے اک خوابِ گراں تیرے بغیر

مجھ کو اے صیاد رہنے دے گرفتارِ قفس
زہر ہے آب و ہوائے آشیاں تیرے بغیر

تشنۂ کیفِ طرب ہیں صبح کی انگڑائیاں
رات گویا بھر رہی ہے سسکیاں تیرے بغیر

میں تو ہی رنگینیٔ حسنِ تبسم کے نثار
ہر نفس میں کوندتی ہیں بجلیاں تیرے بغیر

رہ گئی ہے بن کے عمرِ مختصر عمرِ طویل
جی رہا ہوں دیکھ او نامہرباں تیرے بغیر

تو بتو مجھ پر تراشی جا رہی ہیں تہمتیں
کو بکو رسوا ہے میری داستاں تیرے بغیر

ہر نفس ہے اضطرابِ دل سے آہنگِ فغاں
ہر فغاں میں ہے نفس آتش فشاں تیرے بغیر

فرشِ خواب ہے تیرا وہاں تیرے لئے
درد شرح زندگانی ہے یہاں تیرے بغیر

تو ہے آئینہ ہے اور آرائشِ زلف دراز
میں ہوں اور صبر آزما حیرانیاں تیرے بغیر

وہ فروغِ لالہ و گل کی تمنا اب کسے
وہ خیالِ بادہ و ساغر کہاں تیرے بغیر

اخترِ ناشاد کی شیریں بیانی اب کہاں؟
نطق ہے بیگانۂ حسنِ بیاں تیرے بغیر

علی اختر

ابن خلدون

و فلسفۂ ابن خلدون

(۱)

اسلام میں اکثر علوم و فنون کی طرح تاریخ کی ابتدا بھی پہلی صدی ہجری میں ہوئی "الفاروق" کے مقدمہ میں علامہ شبلی مرحوم نے تصریح کی تھی کہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے عبید بن شریہ نے عہد قدیم کی ایک تاریخ تالیف کی جس کا نام کتاب الملوک و اخبار الماضیین تھا، پچھلے سال دائرۃ المعارف نے "کتاب التیجان" شائع کر کے اس "تصریح" کی تصدیق کر دی، ابن ہشام مولف سیرۃ کی یہ کتاب ابن شریہ ہی کی تصنیف سے ماخوذ اور اسی پر مبنی ہے۔ اسی زمانہ میں زیاد بن ابیہ نے ایک دوسری کتاب تالیف کی جس کا نام علامہ ابن الندیم بغدادی نے کتاب مثالب الانساب بتایا ہے۔

دوسری صدی میں ہشام بن عبد الملک کے حکم سے (۱۱۷ھ میں) تاریخ عجم کا ترجمہ عربی میں ہوا، تصنیفات کی فہرست میں موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ کی کتاب مغازی النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)، عوانہ بن حکم متوفی ۱۴۷ھ کی کتاب اخبار معاویہ والاموییّن ابن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ کی کتاب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو خیثمہ احمد بن زہیر بن حرب متوفی ۲۷۹ھ کی کتاب تاریخ الرواۃ خاص طور پر قابل تذکرہیں،

تیسری صدی میں ہیثم بن عدی الطائی المتوفی ۲۰۷ھ نے عراق کے افسران پولیس کی تاریخ لکھی جس کا نام تاریخ

عمال الشرطۃ لامراء العراق ہے، ابن سعد متوفی ۲۳۰ھ نے طبقات تالیف کی، ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ نے معارف لکھی، بلاذری نے فتوح البلدان ترتیب دی، اور ابوحنیفہ دینوری متوفی ۲۸۱ھ نے الاخبار الطوال تالیف کرکے فن تاریخ کی نمایاں خدمت کی۔

چوتھی صدی کے نامور مورخ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری مؤلف تاریخ الامم والملوک متوفی ۳۱۰ھ اور علامہ مسعودی مؤلف مروج الذہب متوفی ۳۰۶ھ ہیں۔ علامہ بلاذری کا کارنامہ بھی ہمارے سامنے ہے، ان کی ضخیم تاریخ انساب الاشراف سب سے بہتر اور برتر ہے، اور ابھی اس کی پانچویں جلد آئی ہے،

پانچویں صدی میں ابوعبداللہ الحاکم المتوفی ۴۰۵ھ کی مشہور کتاب تاریخ نیشاپور اور خطیب ابوبکر احمد بن علی المتوفی ۴۶۳ھ کی کتاب تاریخ بغداد کو زمانہ نے قبول عام کی سند دی اور یہ کتابیں اس صدی کی بہترین تالیفات سمجھی گئیں۔

چھٹی صدی کے طبقۂ مورخین میں علامہ ابن الجوزی کی تاریخ المنتظم اور عماد الکاتب کی الخریدہ (یہ کتاب دس حصوں میں ہے اور پانچویں صدی سے ۲۷۵ھ تک کے شعرائے عرب کی تاریخ لکھی ہے) اور البرق الشامی (یہ تاریخ سات حصوں میں ہے، اس میں سلطان نورالدین وصلاح الدین کے فتوح حروب صلیبیہ مذکور ہیں اور خود اپنے واقعات بھی تفصیل سے لکھے ہیں)، اور اخبار الدولۃ السلجوقیہ اور تاریخ فتح بیت المقدس (الفتح القسی فی الفتح القدسی، طبع اطالیہ) کو ایک حد تک شہرت حاصل ہے، ان دونوں نامور مؤلفوں نے ایک ہی سال یعنی ۵۹۷ھ میں وفات پائی،

ساتویں صدی کی مشہور تاریخیں، ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ کی تاریخ الکامل، ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ کی وفیات الاعیان اور ابن العدیم متوفی ۶۶۰ھ کی تاریخ حلب ہے جس کی تیس جلدیں ہیں،

آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون کا دور تھا، جو نہ صرف اس صدی بلکہ تمام عہد اسلام کے شہرۂ آفاق مورخ تھے اور جن کا نام موضوع کلام کا عنوان ہے، ابن خلدون کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے تاریخ کو علم بنا دیا، اُن سے پیشتر دستور تھا کہ تاریخی واقعات سنہ وار قلمبند کئے جاتے تھے، یعنی سال بھر میں جس قدر واقعات دنیا بھر میں ہوئے ہیں سب ایک سنہ کے تحت لکھے جاتے، یہ روش اہل عرب کے خاص ذوق میں داخل تھی، وہ ہر سال کے لئے ایک تاریخی سالنامہ لکھا کرتے تھے جس کی جلدیں اگر جمع کردی جائیں تو ایک مکمل تاریخ ہوجاتی، لیکن اس میں نقص یہ تھا کہ سلسلہ واقعات کا تجزیہ ہوجاتا تھا، مثلاً کسی واقعہ کی ابتدا سال کے آخر میں ہوئی اور دوسرے سال کے وسط میں انجام پذیر ہوا، مورخین پابندی سنہ کی وجہ سے اس کا تذکرہ نامکمل چھوڑ دیتے اور پھر دوسرے سنہ کے تحت بہت سے واقعات ترتیبی لکھنے کے بعد اس کے انجام کار کی اطلاع دیتے

واقعات کی تحریر کا صرف روایت پر مدار تھا، جس واقعہ کے متعلق جتنی روایتیں ملتیں بغیر تنقیح و تحقیق کے سب کو جمع کر دیتے تھے، طبری وغیرہ متقدمین کا یہی طرز تھا، اور یہ چنداں ناپسندیدہ بھی نہ تھا، اس لئے کہ نقادوں کو تبصرہ کی گنجایش تھی، ہر واقعہ کے متعلقات کا ذخیرہ فراہم تھا، اور موقع حاصل تھا کہ اصول درایت سے بات منقح کر لی جائے اور اسباب واقعہ دریافت ہو جائیں، لیکن بعد کو یہ صورت نہ رہی، متاخرین نے انتخاب کی روش اختیار کی، ایک واقعہ کے متعلق اگر دس روایتیں ہوتیں تو جس روایت میں کسی قسم کی غرابت کا پہلو ہوتا وہ اسی کو درج کرتے اور باقی سیدھی سادی باتیں معمولی سمجھ کر چھوڑ دی جاتی تھیں، منشائے تاریخ فقط سلاطین اور سلطنتوں اور ان کی لڑائیوں کا لکھنا تھا، قدما کے ہاں اس کے ضمن میں اکثر ایسی باتیں بھی ہوتی تھیں جن سے ملک اور قوم کی عام حالت کا بھی اندازہ ہو سکتا تھا، لیکن متاخرین کی تاریخوں میں یہ خصوصیت گویا مفقود تھی،

فلسفہ تاریخ ابن خلدون نے اس طرز کو بالکل بدل دیا، ان کی تاریخ گویا آج کل کی تالیف ہے، تمام واقعات یکجا فراہم ہیں اور سب میں ایک خاص حد تک تسلسل قائم ہے، انھوں نے فلسفۂ تاریخ کو اس وقت ایجاد کیا جب دنیا اس سے بالکل بے خبر تھی، اور گو اپنی تاریخ میں وہ اس کی پابندی نہ کر سکے تاہم ایک علمی ایجاد کی وجہ سے دنیا ان کی زیر بار احسان ہے، ان کی زندگی سیاسی معاملات میں پریشانیوں سے بسر ہوئی، اور بے اطمینانی کے عالم میں انھوں نے تاریخ لکھی، تونس میں ان کو ایک تھوڑا سا اطمینان نصیب ہوا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مقدمہ تاریخ کی تکمیل کر ڈالی، کافی موقع ملتا تو ان کی تاریخ بھی اسی طرز کی ہوتی، لیکن وہ معذور تھے،

تعریف علم تاریخ آٹھویں بلکہ نویں دسویں صدی ہجری تک جس قوم کی چاہو تاریخ پڑھ کر دیکھ لو سلاطین کی شان و شکوہ جنگ و جدال، قتل و خونریزی وغیرہا کے علاوہ عام ملکی حالت کا کہیں تذکرہ نہ ہوگا، محاربات کے سیکڑوں ورق پڑھ جاؤ لیکن فن حرب کے متعلق کوئی بات نہ معلوم ہوگی،

انقلاب سلطنت اور سیاسی تغیرات کا ایک ضخیم دفتر ہر ایک تاریخ میں ہوتا ہے، مگر یہ بالکل نہیں معلوم ہو سکتا کہ کہ اس وقت کا فنِ سیاست کیا تھا اور ان اقوام کو سیاست سے کہاں تک مناسبت تھی، عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ تاریخ سلطنتوں کا ایک افسانہ ہے اور مورخ کا خاص فرض یہ ہے کہ سلاطین کی کہانیاں جمع کر دے، ابن خلدون نے اس خیال کی سخت مخالفت کی، اور انھوں نے تاریخ کی وہی تعریف قرار دی جو قریب قریب آج بھی صحیح سمجھی جاتی ہے، ان کے خاص

الفاظ یہ ہیں:-

حقيقة التاريخ انه خبر عن الاجتماع الانسانی الذی هو عمران العالم وما يعرض لطبيعة ذلك العمران من مثل التوحش والتانس والاصناف والعصبيات والتغلبات للبشر بعضهم على بعض وما ينشاء عن ذلك من الملك و الدول ومراتبها وما ينتحله البشر باعمالهم ومساعيهم من الكسب والمعاش والعلوم والصنائع وسائر ما يحدث فی ذلك العمران لطبيعة من الاحوال

تاریخ کی حقیقت یہ ہے انسانی اجتماع جس کا نام دنیا کی آبادی ہے اس آبادی کی فطرت سے جو حالات عارض ہوتے ہیں مثلاً وحشی ہونا، آدمیت یعنی تمدن، عصبیت یعنی اپنی قوم کو مدد دینے کا خیال انواع و اقسام کے آدمیوں کا باہم ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا اس غلبہ سے ملک اور سلطنتیں اور جو مراتب پیدا ہوتے ہیں، انسان اپنے کاموں اور کوششوں سے کسب، معاش، علوم اور صنعتوں میں جو خصوصیتیں پیدا کرتے ہیں اور اس آبادی کے عالم میں حسب اقتضائے طبیعت جو باتیں ہوتی ہیں، ان سب سے مطلع ہونے یا مطلع کرنے کا نام تاریخ ہے

اصول تاریخ نویسی

ابن خلدون نے تاریخ نویسی کے لیے چند اصول قرار دئے ہیں، اور ایک ضابطہ مقرر کیا ہے جو قابل غور ہے، فرماتے ہیں:-

يحتاج صاحب هذا الفن العلم بقواعد السياسة وطبائع الموجودات واختلاف الامم والبقاع والاعصار فی السير والاخلاق والعوائد والنحل والمذاهب و سائر الاحوال والاحاطة بالحاضر من ذلك وما بينه وبين الغائب من الوفاق و ما بينهما من الاختلاف والتعليل المتفق منها والمختلف والقيام على اصول الدول والملل ومبادی ظهورها واسباب حدوثها ودواعی كونها واحوال القائمين بها واخبارهم

اس فن (تاریخ) کو حسب ذیل امور کی ضرورت ہے، قواعد سیاست کا جاننا، موجودات کی طبیعت فطرت سے باخبر ہونا، سیرت، اخلاق عادات و طریق و مذہب وغیرہا کے متعلق اقوام و مقامات اور زمانوں کے اختلاف سے واقف ہونا، ان امور کی موجودہ حالت پر احاطہ رکھنا، اور حاضر و غائب میں جو اتفاق یا اختلاف ہو اس کو سمجھنا، ہر اتفاق یا اختلاف کے سبب کا تلاش کرنا، سلطنتوں اور مذہبوں کے اصول کو پیش نظر رکھنا، ان چیزوں کی ابتدائی حالت پر غور کرنا، جن اسباب سے یہ باتیں پیدا ہوئیں ان کو سوچنا ہر گروہوں کے حالات و واقعات کا جاننا۔

ان اصول میں حاضر و غائب کے اتفاق و اختلاف سے یہ مراد ہے کہ موجودہ زمانہ قدیم زمانہ کے واقعات کا نتیجہ ہے لہذا موجودہ اور گذشتہ امور پر غور کرنا چاہئے کہ ان میں کتنی باتیں باہم ملتی جلتی ہیں اور کس قدر مختلف ہیں، تاریخ کی موجودہ تعریف اسی ضابطہ سے استنباط ہوئی ہے اور یہیں سے یہ قاعدہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ "التاریخ یعید نفسہ"

ابداع و اختراع پہلے واقعات کی تحقیق کا دستور یہ تھا کہ (۱) سلسلہ روایت جس شخص پر منتہی ہوا اُس نے بچشم خود اس واقعہ کو دیکھا اور اس میں شریک رہا ہو (۲) راویوں میں کوئی جھوٹا اور کم فہم نہ ہو۔ ابن خلدون نے اس پر حسب ذیل اصول زیادہ کئے :

۱۔ تغیرات، یعنی دنیا کی تمام باتیں بدلتی رہتی ہیں کسی قوم یا ملک کی جو حالت پہلے تھی اور تمدن و سیاست اور عادات و مذہب میں اس کی جو روش تھی کچھ ضرور نہیں کہ اب بھی وہی کیفیت باقی ہو جس طرح لوگوں کی حالت میں تغیر ہوتا ہے، اوقات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں، شہروں میں انقلاب ہوا کرتے ہیں، اُسی طرح آفاق میں، ملکوں میں، زمانہ میں، اور سلطنتوں میں انقلاب ہوا کرتا ہے، مورخ کا فرض ہے کہ اس کا لحاظ رکھے،

۲۔ تعلیل، یعنی واقعات کے اسباب دریافت کرنا، اس لئے کہ کوئی بات بے سبب نہیں ہوتی اور جب تک سبب نہ معلوم ہو واقعہ کی تنقیح نہیں ہوسکتی،

۳۔ تعمیم، یعنی واقعہ کی نسبت یہ غور کرنا کہ ملک و قوم کی عام حالت اس کی مقتضی تھی یا نہیں۔

۴۔ اعتدال طبعی، جب تک کہ انسان فارغ الذہن اور معتدل مزاج نہ ہوگا واقعہ کی تحقیق نہیں کرسکتا، اگر وہ پہلے سے کسی کا جانبدار ہے یا مخالف یا معتقد تو واقعات کے اسی قدر حصے اس کو نظر آئیں گے جو اس کے ذوق کے موافق ہونگے

۵۔ وثوق، یعنی کسی شخص کی باتوں پر یقین رکھنا کہ یہ سچ یا جھوٹ بولتا ہے، حالانکہ ممکن ہے کہ ایک شخص عادتاً سچا ہو مگر جو واقعہ بیان کرتا ہو صحیح نہ ہو، یا عادتاً جھوٹا ہو مگر جو خاص بات بیان کی ہو وہ صحیح ہو،

۶۔ لحاظ اغراض، یعنی جو واقعہ راوی بیان کررہا ہے اس سے اُس کی خاص غرض کیا ہے،

۷۔ تطبیق، یعنی حالات کو اسباب سے منطبق کرنا،

۸۔ اقتضائے طبیعت، از روے عمران و آبادی ہر واقعہ یا حالت کی ایک خاص فطرت ہوتی ہے، لہذا سوچنا چاہئے کہ واقعہ کی ذاتی فطرت کیا ہے،

۶۔ امتیاز عمرانات، یعنی اجتماع کے ساتھ ذاتی یا طبعی حیثیت سے جو حالات لاحق ہیں اُن میں امتیاز کرنا کہ ذاتیات کا پہلو کس قدر ہے اور عارضی حالت کتنی ہے، ذاتی حالت کو عارضی حالت سے جب تک جدا نہ کیا جائے واقعیت ظاہر نہیں ہو سکتی، کیونکہ عوارض پر حکم کرنا صحیح نہیں،

یہی وہ اصول ہیں جن کی ایجاد کا فخر ابن خلدون کو حاصل ہے، ان میں بعض باتیں پہلے بھی نامعلوم نہ تھیں، مثلاً عبداللہ بن المقفع نے جو آخر عہد بنی امیہ کا مشہور سیاسی منشی تھا، رسالہ سیاست میں پہلے پہل بڑی قابلیت کے ساتھ بحث کی ہے، اور ابن خلدون کے بعض اصول بھی ضمناً درج کئے ہیں، لیکن رسالہ مذکور انشایانہ طرز پر ہے، اور ادبی لطافت کا ایک بے نظیر نمونہ نظر آتا ہے، حکیمانہ استدلال کا رنگ اس میں نہیں ہے، قاضی ابوبکر طرطوشی نے سراج الملوک میں اس قسم کے ابواب باندھے ہیں، لیکن فلسفہ کا شائبہ اس میں بھی نہیں ہے، حکما اور مشاہیر عالم کے اقوال اس میں نقل کئے ہیں، اور یہی اس کا استدلالی رنگ ہے، ابن جوزی وابن ابی حاتم نے موضوعات میں ایک حد تک ان اصول سے فائدہ اٹھایا ہے، خصوصاً شرط نہم تو خاص ابن جوزی کی ایجاد ہے، لیکن ان بزرگوں کے مباحث علم ایک حد تک محدود تھے، تاریخ کو ان سے تعلق نہ تھا، وہی ابن جوزی جن کا مدار موضوعات میں اس قسم کی تحقیقات پر ہے تاریخ میں جب آتے ہیں تو ان سنگلاخ راہوں سے جدا ہو جاتے ہیں، ان کی تاریخ منتظم اس طرز کی واضح مثال ہے، ابن خلدون کی خصوصیت یہ ہے کہ ان اصول وضوابط کو انھوں نے تاریخ سے وابستہ کر کے فلسفہ کی حیثیت پیدا کی، اور استدلال و تنقیح واقعات کا نیا انداز قائم کیا، اس مفید اختراع پر ان کو ناز ہے، اور ایسا ہونا چاہئے تھا، تاہم خاکساری جو مسلمانوں کی طبیعت میں داخل ہے کہیں نہ کہیں اُن کو منکسر مزاج بنا دیتی ہے، فرماتے ہیں:۔

فاعلم ان الکلام فی ھذا الغرض مستحدث　واضح ہو کہ اس غرض (فلسفۂ تاریخ) میں کلام بالکل نیا اور انوکھا اور
الصنعۃ غریب النزعۃ غزیر الفائدۃ اعثر نی　کثیر الفائدہ ہے، بحث و تحقیق اور غور و تعمق سے یہ بات حاصل
علیہ البحث وادی الیہ الغوص۔۔۔۔　ہوئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں
ولعمری لم اقف علی الکلام فی منحاہ لاحد　خلق اللہ میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں جس نے اس
من الخلیقۃ ما ادری لغفلتھم عن ذلک　موضوع میں کلام کیا ہو، مجھے معلوم نہیں کہ آیا ان کی غفلت اس کا باعث

ولیس الظن بہم او لعلہم کتبوہ فی ھذا　ہوئی، جس کا گمان ان کی طرف نہیں ہوسکتا یا غالباً انھوں نے لکھا ہو اور
الفرض واستوفوہ ولم یصل الینا　تفصیل سے لکھا ہو مگر ان کی تحریریں ہم کو نہ ملی ہوں،

ان اصول کی بنا پر مورخ مذکور نے مقدمۂ تاریخ میں بہت سی خبروں کی تنقیح کی ہے اور بزعم خود اکثر چیزیں غلط ثابت کی ہیں، جن میں بعض باتیں مسامحہ سے خالی نہیں، تاہم ان میں بھی ایک شان ہے،

خطا نمود و سزا وار آفریں باشد

عبداللہ العمادی

مشاہدات و محسوسات

(۱)

دنیا تیری ہزار پہلو بدلے
بدلی ہے کبھی اور نہ مری خو بدلے
تیرا ہی دیا ہوا ہے احساسِ خودی
میں تجھ سے بدل جاؤں اگر تو بدلے

(۲)

من کا درپن دکھا کے بسمل کر دے
ساجن کو سکھی دردبنا دل کر دے
پوجا کا یہ بیوپار چلے گا کب تک
اک روز پریم کھیت گھائل کر دے

(۳)

تمہیدِ نشاط جاودانی لے جا
ناکام ہے روح کامرانی لے جا
آخر کو اتر گیا جوانی کا نشہ
لے مجھ سے مرے دل کی جوانی لے جا

(۴)

سب ہیں اس جگ میں جینے جی کے کارن
ہم پیت نہ کرتے تھے اسی کے کارن
آئی ہے اجل ساتھ لئے جاتی ہے
ساجن سے بگڑ گئی سکھی کے کارن

نجم آفندی

اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں[1]

حیدرآباد کی مجلس وضع قوانین[2] کے ضابطے اور عدالت عالیہ کے متعدد فیصلوں میں تسلیم کیا گیا
ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی (حیدرآباد) کا ان لکھا یا غیر موضوعہ قانون، شریعت اسلام ہے۔
موجودہ حیدرآباد کی عدل گستری کو بہتر طور سے سمجھنے کیلئے ہمیں اسلامی عدل گستری کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے

اسلام پہلے عرب سے شروع ہوا۔ عرب اپنی جاہلیت کے زمانے میں بھی عدل گستری کو جو اہمیت دیتے تھے اس کی شاہد ویلہاوزن[3] کے الفاظ میں خود ان کی زبان ہے جس میں "حکومت کرنے" اور "مقدمے کا فیصلہ کرنے" کے لئے ایک ہی لفظ (حکم) پایا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ

---

[1] دو ڈھائی سال پہلے ایک مضمون "کانفرنس طیلسانین عثمانیہ" میں سنایا گیا جس کا انگریزی ترجمہ گذشتہ سال اپریل ۱۹۳۶ء کے رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد) میں چھپا ہے۔ اصل مضمون دگنے تگنے اضافے کے بعد یہاں پہلی مرتبہ شایع کیا جاتا ہے۔

[2] ۱۸۹۳ء میں قائم شدہ اور دیسی ریاستوں میں سب سے پہلی (دیکھئے اخبار ہندو مدراس مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۳۷ء ضمیمہ سلور جوبلی مبارک صفحہ (۵)، مضمون راجہ کرشنا چاریہ سابق معتمد مجلس وضع قوانین و مشیر قانون حیدرآباد۔

[3] Wellhausen, *Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit*, p. 8: "regieren heisst richten.

میں حکومت کا، اگر واحد نہیں تو سب سے بڑا مقصد اور فریضہ "عدل گستری" سمجھا جاتا تھا۔ "اے داؤد ہم نے تجھے زمین پہ نائب بنایا ہے اس لئے لوگوں میں حق طور سے فیصلے کیا کر۔"[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے دیگر ممالک میں بھی عدل گستری کی اہمیت برابر تسلیم کی جاتی رہی ہے، اسلام نے بھی اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اسے انسانیت کا عین اقتضا اور "خدا کی نیابت"[2] کا پہلا فریضہ قرار دیا۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ حق رسانی میں مدد دینے کے لئے بن بلائے بھی آگے بڑھنا اور اپنے معلومات کی حد تک سچ سچ گواہی دینا ہر شہری کے لئے ضروری ہے۔[3]

قدیم عربوں کے پاس عدلیہ اور تنفیذیہ کے ادارے تو تھے لیکن تشریعیہ (یعنی ادارہ قانون سازی) نہ تھا۔ یہ کمی اسلام نے آکر پوری کی جیسا کہ آگے بتایا جائے گا۔ عرب میں عدلیہ اور تنفیذیہ تو تھے لیکن بہت ہی ابتدائی حالت میں۔ ان میں اسلام نے جس کی تحریک ۱۳ ق ھ تا ۱ ھ میں شہر مکہ میں شروع ہوئی، رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کے اغراض اور ضروریات کے لئے اصلاح و ترمیم کی۔ اگرچہ بعض قدیم چیزیں جو بُری نہ تھیں برقرار رہیں گی۔[4]

اسلام سے پہلے عرب میں جو عدالتی نظام تھا، اس کے سلسلے میں سب سے پہلے اس ادارے کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو خاص شہر مکہ میں قائم کیا گیا تھا۔ جرہمی دور میں اس کا آغاز ہوا مگر اس وقت کی زیادہ تفصیلیں ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ حرب فجار کے بعد اس ادارے کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور اس کی حلف گیری کے ابتدائی جلسے میں اُس ہونہار نوعمر نے بھی باوجود کمسنی کے بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا تھا جسے کچھ دنوں بعد دنیا پیغمبر اسلام کے محترم نام سے جاننے لگی۔ اس "حلف الفضول" میں ایک رضاکار جماعت شریک ہوئی جس کا مقصد حدود شہر میں ہر مظلوم کی خواہ وہ شہری ہو یا اجنبی، مدد کرنا اور اس وقت تک چین نہ لینا تھا جب تک کہ ظالم حق رسانی نہ کرے۔[5] نبوت ملنے کے بعد بھی آنحضرت اس جماعت کے کام میں فاعلانہ حصہ لیتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔[6]

تاریخ بتاتی ہے کہ اس حلف الفضول کی دہائی سے بڑے بڑے سرکش گھبراتے تھے اور اس رضاکار جماعت نے جس نیک

---

[1] قرآن مجید ۳۸ : ۲۷ (یہ ایک ابتدائی مکی سورہ ہے)

[2] ایضاً آیت بالا نیز حضرت آدم کا خلیفۃ اللہ مقرر ہونا۔

[3] ایضاً ۲ : ۹۵، ۲ : ۲۰۳، ۲ : ۱۴۰، ۲ : ۲۸۲، ۲۲ : ۳۰، ۲۵ : ۷۲، وغیرہ وغیرہ

[4] ایک حدیث ہے کہ "اسلام میں جاہلیت کی اچھی باتوں پر عمل کیا جائے گا" مسند احمد بن حنبل جلد (۳)، صفحہ (۴۲۵)

[5] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۸۵ تا ۸۶۔ روض الانف للسہیلی ج ۱ صفحہ ۹۰ تا ۹۱۔ طبقات ابن سعد ج ۱/۱ صفحہ ۸۲۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱ صفحہ ۱۹۰

[6] علاوہ اس قول کے دیکھئے حوالۂ بالا کہ "اگر مجھے اس کی دہائی دے کر بلایا جائے تو میں اب بھی مدد کو دوڑوں گا" یہاں اُس شخص کے واقعے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کا ابن ہشام میں صفحہ (۲۵۷ تا ۲۵۸) پر ذکر ہے

کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اسے وہ عہد بنی امیہ کی ابتدا تک انجام دیتی رہی[1] نئے ارکان کے بھرتی نہ کئے جانے کے باعث ابتدائی ارکان کے مرجانے پر یہ ادارہ آخر برخاست ہوگیا۔

یہ تو غیر معمولی اور خصوصی طریقہ تھا۔ معمولی اور عام طور سے انصاف رسانی اور فیصلہ بازی کے ملک میں تین مسلّم طریقے تھے:۔

(۱) سب سے پہلے قبیلہ واری پنچ تھے۔ جب باہمی گفت و شنید سے معاملہ طے نہ ہوتا تو مستغیث اور ملزم یا مدعی و مدعا علیہ ان قبیلہ واری پنچوں کے سامنے حاضر ہوتے جن کا فیصلہ قطعی ہوتا اور بہت سی صورتوں میں جرم کو اصطلاحی الفاظ میں "دفن کردیا جاتا" اور پھر اسی بنیاد پر انتقام طلبی جائز نہ ہوتی۔[2]

(۲) اگر اندرونی طور سے یوں فیصلہ نہ ہوسکتا اور خاص کر اگر کسی قبیلے کی الگ الگ شاخوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں جھگڑا ہوتا تو کاہنوں سے رجوع کیا جاتا۔ "کاہن" جو ایک عبرانی لفظ کا معرب ہے، عبرانی زبان میں اور یہودیوں کے ہاں عبادت گاہوں کے منتظم کو کہتے ہیں۔ ابتداءً لوگ ان مذہبی پیشواؤں کی غیر جانبداری اور بے لاگ فیصلوں کی توقع میں ان سے رجوع کرتے ہوں گے۔ یہ عرب کاہن بھی یونانی مندروں کے پجاریوں کی طرح عموماً ذومعنی اور مسجع و مقفا عبارت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ غالباً یہ صحیح نہیں کہ عرب کے کاہن سب کے سب یہودی رہے ہوں۔ بہرحال عرب میں کچھ لوگ غیب دانی کے مدعی پائے جاتے تھے۔ ان کو کاہن کہا جاتا تھا۔ مشکل مقدموں میں ان سے رجوع کیا جاتا اور یہ اپنے قصوں کے مطابق بعض وقت وہ فریقین سے ایک لفظ بھی سنے بغیر صحیح فیصلہ گنگنانا شروع کردیتے۔[3] ان فیصلوں کی عدم تعمیل پر کسی قوت تنفیذیہ کے تدارک کی عدم موجودگی کے باوجود، ان لوگوں کے توہمات ہی تہدید کا کام دیتے۔ انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں لفظ "کاہن" کے تحت لکھا ہے:

> اپنی خانگی حیثیت میں کاہن خاص کر جھگڑوں اور ہر طرح کے قانونی مسائل میں فیصلہ کنندہ کا کام دیتے نیز حکم کاہن اور حکم کے تصورات باہم بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں (الحطیئہ نظم ۲ بیت ۷۔ نیز الاغانی طبع مصر ۳۲ (۱۳۔ ج ۲ ص ۲۷)، ان کے فیصلوں کو ایک طرح کے خدائی فیصلے سمجھا جاتا جن کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہوسکتا۔"

---

[1] صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج ۱ صفحہ (۳۵۲) [2] مثلاً ایضاً ج ۱ صفحہ ۳۹۰ تا ۹۹)

[3] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۲ صفحہ (۲۰۶)۔ ابن ہشام صفحہ (۸۰ تا ۹۱)، "تحاکموا الیہ حتی خرف وھو الذی قرعت لہ العصا"، الاشتقاق لابن درید صفحہ (۱۶۴)

زمزم کا چشمہ دریافت کرنے کے بعد اس کی ملکیت کا تصفیہ کرانے کے لئے عبدالمطلب اور دیگر مکے والے ایک کاہن ہی کے پاس گئے تھے۔ عبدالمطلب نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کی منت مانی تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کی تدبیر معلوم کرنے کے لئے بھی ایک کاہنہ ہی سے رجوع کیا گیا تھا۔ اس قسم کی بہ کثرت نظیریں عربوں کی تاریخ جاہلیت میں مل سکتی ہیں۔

(۳) تیسرا اور شاید سب سے اہم ادارہ "تحکیم" کا تھا۔ عامر بن الظرب العدوانی کے پاس عرب کی ہر جگہ سے تحکیم کیلئے مقدمے آتے تھے[۵۳]۔ قبیلہ تمیم کے سرداروں کا موروثی طور پر پورے عرب کا حَکَم ہوا کرنا عربیات کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ یہ سردار سال میں ایک بار کسی بڑے میلے مثلاً عکاظ میں جاتے اور اس جگہ دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات کو سنکر فیصلہ کرتے۔ یہاں جنگ نسائی کا خوف، اور حَکَم کے پس پشت پورے میلے کی اخلاقی قوت، تعدیہ کا کام دیتی۔ ان موروثی حکموں سے چند کا ذکر ابو عبیدہ[۵۴]، ابن درید اور المرزوقی[۵۵] نے بھی کیا ہے۔ اور ابن قتیبہ[۵۶] نے لکھا ہے کہ غیلان بن سلمہ ثقفی کی عادت تھی کہ ایک دن اپنے ذاتی معاملات پر توجہ کرتا، ایک دن شعر شاعری کے جلسوں میں حصہ لیتا اور ایک دن حَکَم بن کر جھگڑے چکاتا۔ قبیلہ واری حَکَم بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ خود شہری مملکت مکہ کے سرکاری اداروں میں سے ایک حَکَم کا بھی تھا۔ موقتی طور پر بھی کسی کو حَکَم بنایا جا سکتا تھا چنانچہ قُصَیّ اور قضاعہ کی جنگ میں بنی کنانہ کے ایک فرد شدّاخ کو حَکَم بنایا گیا تھا[۵۷]۔

یہ تو اُس زمانے کا ذکر ہے جب عرب میں اسلام شروع ہونے کو تھا۔ یہ نظام بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا لیکن خود اس حالت تک پہونچنے کے لئے بھی عرب میں کم و بیش وہی ارتقاء عمل میں آیا ہوگا جو اور ملکوں میں یعنی فطری احساس مدافعت نے شروع میں خود انتقامی کی سجھائی ہوگی جس میں ملزم، ورنہ اس کے قریبی رشتہ دار بیٹے بھائی وغیرہ سے بدلہ لیا جاتا تھا۔ (اس سلسلے میں جنگ تغلب کی نظیر سے کون واقف نہیں)، اس کے بعد اندرون قبیلہ جرم یا تعدی پر داخلی امن قائم رکھنے، جھگڑا چکانے، ظالم کو سزا دینے اور مظلوم کی فریاد رسی کرنے کے لئے خود قبیلہ اپنے سرداروں یا انصاف کے لئے مقرر شدہ خصوصی افسروں کے ذریعے دخل دہی کر کے عدل گستری کرنے لگا ہوگا۔ یہ شروع میں "آنکھ کے بدلے آنکھ" سے کم نہ ہوتا ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب بعض صورتوں میں ضرر کی مالی یا رقمی قدر و قیمت کی جانے لگی

---

[۵۰] "قال ابو المنذر وتزعم مضر ان امر الموسم وقضاء عکاظ فی بنی تمیم،، (مرزوقی ج ۲ صفحہ ۱۶۷)

[۵۱] نقائض جریر و فرزدق صفحہ (۱۰۵، ۴۳۹، ۴۲۸)، وغیرہ

[۵۲] ٹرونڈرم اورینٹل کانفرنس ۱۹۳۷ء میں میرے پڑھے ہوئے مقالے "مکے کی شہری مملکت" کے ص ۲۳ و ما بعد اردو کا تفصیلی ذکر ہے

[۵۳] هرم بن قطبة کان من حکماء العرب وهو الذی تحاکم الیه عامر بن الطفیل وعلقمة بن علاثة فی المنافرة (الاشتقاق صفحہ ۱۷۲)

[۵۴] کتاب الازمنة والامکنة ج ۲ صفحہ (۱۶۳ تا ۱۶۷)

[۵۵] کتاب المعارف، بر موقع نیز المرزوقی ج ۲ صفحہ ۹۰ تا ۱۰۰

[۵۶] عقد الفرید لابن عبد ربہ ج ۳ صفحہ ۷۵ تا ۷۶

[۵۷] ابن کثیر، کتاب مذکور ج ۲ صفحہ (۲۰۶) ابن ہشام صفحہ ۹۰ تا ۱۰۰

اور بالآخر تعیین بھی ہوگئی تو ملزم کے سماجی درجے، عمر اور جنس کے لحاظ سے بھی فرق بہر حال باقی اور جاری رہا ہوگا۔ چنانچہ اس کی نظیریں عام طور سے ملتی ہیں کہ کسی طاقتور قبیلے کے فرد کا خون بہا معمولی قبیلے کے فرد سے مثلاً دگنا ہوتا۔[۵] یا کسی آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو غلام سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا اور غلام کے مالک یا کسی اور آزاد رشتہ دار کا سر مانگا جاتا۔ یا کوئی آزاد کسی غلام کو قتل کرتا تو قاتل کا قصاص گوارا نہ کیا جاتا بلکہ کوئی کمتر معاوضہ دیا جاتا۔ یہی حال عورت کا بھی تھا۔ اور اسی قاعدے کو قرآن نے اسلامی دور میں منسوخ کیا:-

آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہی قتل کئے جائیں (نہ کم نہ زیادہ)

(قرآن مجید ۲: ۱۷۸)

یہ سب سزائیں تو اُس وقت دی جاسکتی تھیں جب ملزم قبیلے کی دسترس میں ہوتا۔ اگر ملزم فرار ہوجاتا تو یہ محدود وسائل رکھنے والے خانہ بدوش بعض صورتوں میں خاص کر بین القبائل جرم کے موقع پر ملزم کو "طرد" یعنی ذات باہر کردیتے اور وہ اپنے قبیلے کی ہر قسم کی اخلاقی اور مادی مدد سے محروم ہوکر اپنی حفاظت خود ہی تنہا کرنے پر مجبور ہوجاتا اور اکثر بے بسی اور بے کسی سے غربت میں جان دیدیتا۔ ممکن ہوتا تو وہ دور دراز کے کسی اجنبی قبیلے میں جاکر پناہ گزین ہوتا اور انھیں سے بھائی چارہ کرکے انھیں کا ایک فرد بن جاتا۔ ایسے لوگ دخیل، مولا اور حلیف کے مختلف ناموں سے موسوم ہوتے اور یہ اس زمانہ کا طریق توطن (Law and Mode of Domicile) تھا۔[۶]

اب تک صرف تاریخی پس منظر پیش کیا گیا۔ اس کے بعد جیسا کہ بیان ہوا ۶۱۰ء سے اسلام شروع ہوا۔ اس کے آغاز اور ترقی سے یہاں بحث نہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم کی ذات ہجرت سے پہلے اور بعد زندگی بھر اپنے پیروؤں کے لئے انتہائی عدالت کا کام دیتی رہی۔ لیکن حقیقی مملکت کی بنیاد ہجرت کے بعد ہی پڑی۔ ہجرت کرکے مدینہ آتے ہی آنحضرت نے فوراً اپنے عدالتی حقوق و فرائض

---

۵ ابن ہشام صفحہ (۲۰۰ تا ۳)

۶ یہ یاد رہے کہ دخیل، مولا اور حلیف افراد کا یہ طبقہ ——— (جسے دیگر اصلی افراد قبیلہ سے عام حقوق کچھ کم حاصل ہوتے تھے۔ مثلاً وہ کسی اجنبی کو اپنی پناہ میں نہ لے سکتا تھا جیسا کہ ابن ہشام نے سیرۃ رسول اللہ صفحہ (۲۵۱) پر بیان کیا ہے) ——— صرف ان فرار شدہ پناہ گزینوں ہی پر مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں آزاد شدہ غلام، غیر قبائل بلکہ غیر عرب کے عام افراد بھی باہمی رضامندی سے شریک ہوتے تھے۔ اور یہ رواج اسلام نے بھی بہت کچھ باقی رکھا اور غیر عرب کو عرب بنانے میں اس سے عرب مسلمانوں نے بڑی مدد لی۔

کا تعین فرما دیا تھا[۵۱]۔ اور ہماری خوش قسمتی سے یہ دلچسپ اور اہم دستاویز بجنسہ و بلفظہ ہم تک نقل ہوتی آئی ہے[۵۲]۔ اسے سب سے پہلی اسلامی مملکت کا دستور اور آئین کہا جا سکتا ہے۔

اس تاریخی دستاویز کے دو حصے ہیں، فقرہ (۱ تا ۲۳) میں مہاجرین اور انصار کی وحدتوں کا ذکر ہے اور فقرہ (۲۴ تا ۴۷) میں ان قواعد کا ذکر ہے جو مضافات مدینہ میں بسنے والے حلیف یہودی قبائل اور بستیوں سے متعلق تھے۔ ان ہر دو حصوں کے عدالتی فقرات کی تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی:-

—— حسب سابق ہر قبیلۂ انصار اپنے افراد کے مواخذہ جات کا خود اجتماعی طور پر ذمہ دار ہوگا۔ اگر کوئی فرد دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو تو اس قیدی کے قبیلے کے سب افراد مل کر فدیہ ادا کریں گے (ف ۴ تا ۱۱)

—— اس سلسلے میں انصار کے قبائل تو معین تھے لیکن مہاجرین کہ سب مل کر ایک قبیلہ تصور کئے جائیں گے (ف ۲)

—— انصاف رسانی متضرر کے ہاتھ میں نہیں رہے گی بلکہ وہ پوری جماعت مسلمانان کا فریضہ سمجھی جائے گی اور اس میں کسی کی رشتہ داری اور قرابت کے باعث پاس و لحاظ نہیں کیا جائے گا (ف ۱۳) اور کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہیں دے سکے گا (ف ۲۲)

—— کسی مسلمان کا قتل عمد سزائے موت کا مستوجب ہوگا البتہ مقتول کے ولی فدیہ لے کر قصاص سے درگزر کر سکیں گے (ف ۲۱) اور اگر کسی غیر مسلم کے ولی مسلمان ہوں تو انھیں چاہئے کہ[۵۳] قاتل کے مسلمان ہونے کی صورت میں قصاص کا مطالبہ نہ کریں (ف ۱۴)

—— ہر قسم کے جھگڑے کے لئے آنحضرتؐ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا[۵۴] (ف ۲۳)

---

[۵۱] ژاں ژاک روسو نے اپنی مشہور کتاب "معاہدۂ عمرانی" میں قیاس کیا ہے کہ بادشاہت اور مملکت کا آغاز "بیعت" کے ذریعے عمل ہوگا۔ بیعت عقبہ اور اس پر مذکور معاہدے کی روشنی میں شاید کہا جا سکتا ہے کہ چاہے اور بستیوں میں بھی یہی طریقہ رہا ہو یا نہ ہو، اسلام میں واقعتاً یہی ہوا۔ کوئی تعجب نہیں کہ روسو کے قیاس کا ماخذ یہی اسلامی بیعتیں رہی ہوں (نیز دیکھئے رسالہ "قرآنک" لٹریچر حیدرآباد اپریل ۱۹۳۶ء میں میرا مضمون The Quranic Conception of State

[۵۲] ابن ہشام صفحہ ۳۴۱ تا ۳۴۴۔ کتاب الاموال لابی عبید فقرہ (۵۱۷) صفحہ (۲۰۲ تا ۲۰۵)۔ ابن کثیر ج (۳) صفحہ (۲۲۴ تا ۲۲۶) نیز ابن سید الناس وغیرہ

[۵۳] ملاحظہ ہو، یہ کہا گیا ہے کہ "انھیں چاہئے کہ... مطالبہ نہ کریں" اور یہ نہیں کہا گیا کہ "وہ مطالبہ نہیں کر سکتے"۔

[۵۴] اس کے ساتھ ملاحظہ ہو قرآن مجید (۳۳: ۳۶) "جب خدا اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن یا مومنہ کو اپنی بات (بقیہ نوٹ صفحۂ آئندہ پر)

یہودیوں سے جو دفعات متعلق ہیں ان میں یہاں بیان کیا گیا ہے :-

فدیہ، دیت، ولاء اور جوار کے ادارے حسب سابق برقرار رہیں گے (ف ۲۵، ۳۱، ۴۰) اگر کوئی شخص قریش اور ان کے مددگاروں کو اپنے جوار یعنی پناہ میں لینے کا مجاز نہ ہوگا (ف ۴۳)

—— عدل گستری ایک مفاد عامہ کا معاملہ ہے اور کوئی شخص خود اپنے رشتہ داروں کی بھی پاسداری نہ کر سکے گا (ف ۳۶ ب، ۲۱)

—— آنحضرت ہر قسم کے جھگڑوں میں آخری فیصلہ کریں گے (ف ۴۲)

دیگر جزئی تفصیلوں کو یہاں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ گو اس عظیم الشان اور انقلابی اصلاح کی جانب خاص طور پر دوبارہ اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ انفرادی انتقام جوئی کی جگہ مرکزی عدل گستری کا ادارہ وجود میں آگیا اور یہ اختیار افراد ہی نہیں قبائل سے بھی چھین کر حکمران وقت کے سپرد کیا گیا جو تفتیش اور غیر جانبداری کا پابند تھا۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ کم از کم اہل کتاب غیر مسلموں کے مقدموں میں آنحضرت صلعم ان کے شخصی قانون ہی کے

(بقیہ نوٹ صفحہ (۶)) کے متعلق کیسے اختیار رہ سکتا ہے! اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو یہ کھلم کھلا اس کا گمراہ ہونا ہے" یہ سورۂ احزاب کی آیت ہے جو مدنی ہے) قبیلہ داری افراتفری کی جگہ مرکزیت پیدا کرنے کے لئے، علاوہ ایک خاص شخص کو ہمہ گیر حکمران تسلیم کرنے کے، مرکزی حکومت کو زکات (جائداد ٹیکس) دینا، مرکزی حکومت کی جبری فوجی خدمت (بذریعہ جہاد) اور مرکزی حکومت کے بنائے ہوئے تمام قوانین کی تعمیل، تین اہم اصول اختیار کئے گئے۔ نتیجے کی کامیابی کسی تذکرے کی محتاج نہیں۔

¹ اس دستاویز کی غیر معمولی اہمیت کے باعث متعدد مولفوں نے اس سے خصوصی بحث کی ہے۔ مثلاً

Wellhausen, *Skizzen und Vorarbeiten*, IV, ' Gemeindeordnung von Medina"

Caetani, *Annali dell' Islam*, I : 43 etc.

Wensinck, *Mohammed en de Joden te Medina*, p. 78 et seq.

Buhl, *Das Leben Muhammeds*, p 210-12

Hamidullah, *La Diplomatie Musulmane*, I, p 20-26.

Grime, Muller, etc., etc

مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں کے دو مقدموں کا اکثر مورخوں نے ذکر کیا ہے جن میں توریت پر عمل کرایا گیا تھا۔[۱] قرآن مجید میں اس مسئلے سے کافی طویل بحث کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ یہودی توریت پر عمل کریں تو نصرانی انجیل پر، اور مسلمان قرآن پر، اور یہ کہ خدا ہی نے ہر ایک کو الگ الگ شریعتیں دی ہیں ورنہ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی "امت" بنا دیتا۔[۲] آنحضرتؐ کا یہ طرز عمل بعد میں مستقل قانون بن گیا کہ غیر مسلم رعایا اور مسلمانوں سے ان کا شخصی قانون ہی متعلق ہو اور اس غرض کے لئے خصوصی عدالتیں بنائی جائیں۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں اس طرز انصاف نے خاصی ترقی کر لی تھی اور ان ملی عدالتوں کے حکام بھی ہم ملت مقرر ہوتے تھے۔ ممکن ہے اس میں یہ مصلحت بھی پوشیدہ ہو کہ سخت تر شخصی قانون والی "ملتیں" ہمسایہ وہم شہری مسلمانوں کی "الحنیفیۃ السمحا" کی سہولتوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے سکون کے لمحوں میں اس کو قبول کرنے کی خاموش ترغیبیں پاتی رہیں۔ بہر حال ایک ابتدائی اور فوری نہایت اہم فائدہ اسلامی مملکت کو اس سے یہ پہنچا کہ جدید مفتوحہ علاقے میں اقلیتوں کی جن پر وہاں کی سابقہ حکومت سخت مظالم توڑا کرتی تھی، پرخلوص تائید حاصل ہو گئی جس سے اس کو اپنی تازہ فتح کے مستحکم اور مکمل کرنے میں کافی مدد ملی۔ چنانچہ مشہور پادری کارلیفسکی لکھتا ہے: "علاوہ یہودیوں کے جن پر بہت سخت مظالم ہو رہے تھے ... یعقوبی عیسائیوں نے بھی عربوں کو اپنے نجات دہندے

---

[۱] پہلے مقدمہ کے لئے دیکھئے بخاری ۶۱: ۲۶، ۹۵: ۱۵۔ ابن ہشام صفحہ ۳۹۳ تا ۳۹۵، ابو داؤد ج (۲) صفحہ (۲ ۱۵) التنبیہ للمسعودی صفحہ (۲۴۷)

دوسرے مقدمے کے لئے تفسیر طبری ج ۲، صفحہ ۲۴۰ تا ۵، نیز بخاری، مسلم، ابو داود، ابن ماجہ، نسائی، دارمی، طیالسی، احمد بن حنبل وغیرہ جن کے صفحوں کے حوالے ونزنک کی مفتاح کنوز السنۃ میں لفظ "قصاص" کے تحت مل جائیں گے۔

اول الذکر مقدمے میں مسلمان مولفوں نے اس الزام کو دہرایا ہے کہ یہودیوں نے توریت کی تحریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ زنا پر رجم کی سزا کا حکم یہودیوں نے چھپا دیا تھا۔ اس کا ثبوت اب دیگر ذرائع سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ایک یہودی شیزنیائی پروفیسر Tory. Jewish Foundation of Islam. ہی نے ناقابل تردید ثبوت ڈھونڈھ نکالا ہے کہ ایک زانیہ کے گرفتار ہو کر آنے پر حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا: توریت میں اس کی سزا رجم ہے اب آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ (دیکھئے انجیل یوحنا ۸: ۵) توریت کے موجودہ اڈیشن اس حکم رجم سے یکسر خالی ہیں۔

نجران کے عیسائیوں سے آنحضرتؐ نے جو معاہدہ کیا تھا (اور جس کا متن ابن سعد وغیرہ میں ہے)، اس میں بھی ان کی داخلی عدالتی خود مختاری برقرار رکھی گئی تھی۔

[۲] قرآن مجید ۵: ۴۲ تا ۵۰

کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیا وی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے جائیں۔[لہ]

ایک اور شہادت جو ہمعصر ہونے کے باعث خاص اہمیت رکھتی ہے، قابل ذکر ہے۔ چنانچہ شام کی فتح کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک نسطوری پادری نے ایک دوست کے نام جو خط لکھا تھا، وہ موجود ہے اور اس میں لکھا ہے :۔

"یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے، ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں۔ لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرپیکار نہیں۔ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور قدیسیوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں۔"[لٰہ]

یہ یاد رہے کہ کم از کم انصار کے قبائل کی حد تک آنحضرت صلعم نے ہجرت سے پہلے ہی بیعت عقبہ میں ہر ایک کا ایک ایک "نقیب" مقرر کر دیا تھا جو اپنے قبیلے کی نمائندگی کرتا اور اندرونی نظام اور باقاعدگی کا ذمہ دار تھا۔ اگر کسی معاملے میں نقیب کا فیصلہ تشفی کا سامان نہ کرتا تو معاملہ آنحضرتؐ کے پاس آتا۔ نقیب کے تحت ہر دس آدمیوں کا ایک افسر ہوتا جسے "عریف" کہتے تھے (یہ رومائی decurion سے مشابہ تھا) اس نظام سے وقت ضرورت استصواب عامہ میں بھی مدد لی جاتی تھی۔[سلہ]

مدینے کی حد تک آنحضرتؐ پورا عدالتی کام خود انجام دیتے تھے لیکن جب اسلامی عملداری میں وسعت ہوئی اور انتظامی کام بڑھ گیا تو مدینے میں آنحضرت نے چند مفتی (یعنی قاضی)[کلہ] مقرر فرما دئے تھے[ہلہ] جن کے فیصلوں کے خلاف آنحضرتؐ کے پاس مرافعہ

لہ Karalevskij, *Dictionnaire d'Histoire et Geographie Ecclesiastiques*, s. v. Antioche, col 592, 594.

لٰہ Assemani *Bibl Orient.*, III, 2, p. XCVI;
De Goeje, *Memoire sur la Conquete de la Syrie*, 2nd ed., p. 106.

سلہ سیرت نبوی کی کسی کتاب میں جنگ ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کا واقعہ ملاحظہ ہو۔ اس وقت نقیبوں اور عریفوں سے مدد لی گئی تھی۔

کلہ "ابتداءً قاضی کو مفتی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا" (المبسوط للسرخسی ج ۱۶ صفحہ ۱۰۹)

ہلہ التراتیب الادارية للكتانی ج ۱ صفحہ ۱۱۵ (بحوالہ ابن الجوزی)

بھی ہوتا تھا[۱]۔ مدینے میں مستقل قاضیوں کے علاوہ کسی خاص شخص کو کسی خاص مقدمے کی سماعت کے لئے موقتی قاضی بنائے جانے کی بھی عہد نبوی میں متعدد نظیریں ملتی ہیں نیز اُن کے آنحضرتؐ کے پاس مرافعوں کی بھی[۲]۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ دارالحکومت کے باہر صوبوں اور ضلعوں میں بھی علاحدہ عدالتی افسروں کی ضرورت تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ صوبوں کے عامل (گورنر) ہی بہ یک وقت سپہ سالار، افسر مال، قاضی اور محتسب (نگران اخلاق و مال تجارت وغیرہ) ہوتے تھے۔ ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کے خلاف بھی آنحضرت کے پاس مرافعے آیا کرتے تھے[۳]۔

ان قاضیوں کو مستقر کی جانب روانگی کے وقت جو ہدایتیں دی جاتی تھیں، ان میں سے بعض کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ حضرت مُعاذ بن جبل عہد نبوی کے عدالتی حلقے میں جو نمایاں حیثیت رکھتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے حالات سے عام کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:۔

> معاذ بن جبل . . . کو آنحضرت نے قاضی بنا کر جَنَد (جو یمن میں ہے) بھیجا تا کہ لوگوں کو قرآن اور احکام اسلام سکھلائیں اور ان کے مقدموں کا فیصلہ کریں اور یمن کے تحصیلداروں سے جمع شدہ سرکاری محاصل اپنی تحویل میں لیں[۴]۔

جب معاذ بن جبلؓ روانہ ہونے لگے تو حضرت نے آخری باریابی کے موقع پر ان سے جو گفتگو فرمائی وہ بھی اسلامی عدل گستری اور قانونیات کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہے:۔

> "آنحضرت نے جب معاذ کو یمن بھیجا تو پوچھا: کس طرح فیصلے کروگے؟ کہا: اسی کے مطابق جو اللہ کی کتاب (قرآن) میں ہو۔ فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ ہو؟ کہا: تو رسول اللہ کی سنت کے موافق۔ فرمایا: اگر رسول اللہ کی سنت میں نہ ملے؟ کہا: تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ فرمایا: خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے فرستادے کو ایسی بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے"[۵]۔

---

[۱] التراتیب الاداریہ للکتانی ج (۱) صفحہ ۲۵۱ (بحوالہ موطا)

[۲] مسند احمد بن حنبل ج (۲) ص ۱۸۷؛ ج (۴) صفحہ (۲۰۵)؛ ج (۵) صفحہ (۲۶)

[۳] مثلاً استیعاب حدیث (۱۴۵۵)

[۴] استیعاب حدیث (۱۰۰۱)

[۵] ترمذی ۱۳:۳ - ابوداؤد ۲۳:۱۱ - اعلام الموقعین لابن القیم ج (۱) صفحہ ۲۰۳، - طبقات ابن سعد ج ۲/۲ صفحہ (۱۰۷ تا ۱۰۸)

قاضیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جاتی تھی کہ دی ہوئی ہدایتوں کے خلاف وہ جو کام کریں گے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔[۱] جب عمرو بن حزمؓ یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو ان کو آنحضرت نے ایک تحریری ہدایت نامہ دیا۔ یہ اسلامی تاریخ انتظام مملکت میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس طویل اور ہمہ گیر دستاویز میں انھیں انصاف رسانی اور بے لاگ عدل کا حکم دیا گیا ہے اور ظلم و ستم سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔[۲] عمرو بن حزمؓ کے لئے لکھے ہوئے ہدایت نامے میں تفصیل سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جسمانی ضرر رسانی کی کس کس صورت میں متضرر کو کیا ہرجہ دلایا جائے گا۔[۳] اس قسم کا ایک قانون آنحضرت کے حکم سے حضرت ابو شاہؓ کو بھی لکھ کر دیا گیا تھا۔[۴]

بدلے اور انتقام کا تصور حمورابی (شاہ بابل) کے زمانے میں یہ تھا کہ کسی کی بیٹی یا بیٹے کے قتل پر قاتل کی بھی بیٹی یا بیٹے[۵] کو قتل کیا جائے۔[۶] حمورابی کے بعد اس کے قانون قصاص اعضا کا کچھ حصہ[۷] قانون حضرت موسیٰ (توریت) میں بھی ملتا ہے جس میں آنکھ کے عوض آنکھ اور کان کے عوض کان کا طریقہ قائم کیا گیا۔[۸] مگر یہ عہد اسلام کی (آنحضرت صلعم کے زمانے کی) ترقی ہے کہ عمد، شابہ عمد اور خطا میں فرق کیا جانے لگا۔[۹] اور نیت سب سے پہلے دیکھی جانے لگی۔[۱۰] اس کے علاوہ بہت سی صورتوں میں ضمان یعنی تارٹ مقرر کر دیا گیا۔ اور ہرجے کا معاوضہ بجائے مساوی انتقام کے رقمی یا مادی صورت میں دلایا جانے لگا۔[۱۱] اور سخت قانونی انصاف کی جگہ استحسان یا نصفت کو عدالتیں روا رکھنے لگیں۔[۱۲] مطلب یہ ہے کہ انصاف کے ساتھ رحم کو بالکل نظر انداز نہیں کر دیا جا سکتا اور حالات و واقعات

---

[۱] مَن عمل عملاً لیس علیہا امرنا فھو ردّ (مسلم ۳۰ : ۱۷ تا ۱۸) من استعملناہ علی عمل فلیأت بقلیلہ وکثیرہ فما اوتی منہ اخذ وما نھی عنہ انتھی (ابوداود ۲۳ : ۵)

[۲] متن کے لئے دیکھئے ابن ہشام صفحہ ۹۶۱ تا ۹۶۲، طبری صفحہ ۱۷۲۷ تا ۲۹

[۳] موطا، باب العقول؛ نیز سنن نسائی بر موقع

[۴] بخاری باب کتابۃ العلم

[۵] قانون حمورابی دفعات ۱۱۶، ۲۱۰، ۲۳۰ (قاتل محفوظ رہتا تھا)

[۶] ایضاً دفعات ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۰۔

E. Edwards, *Hammurubi Code*, p IX. 111-143

Stanley A. Cook, *The Laws of Moses and the Code of Hammurapi*, (reviewed in O.L.Z., Berlin, 1904 by J. Kohler)

[۸] تائید کے لئے دیکھئے قرآن مجید: ۵-۴۵- نیز

[۹] خطبہ حجۃ الوداع میں بھی اس کا ذکر ہے۔

[۱۰] حدیث انما الاعمال بالنیات صحاح ستہ میں

[۱۱] موطا وغیرہ میں باب العقول ملاحظہ ہو۔

[۱۲] قرآن مجید: ۱۶: ۹۰ "خدا عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے" نیز احسان کا ذکر اصول فقہ کی کسی کتاب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

کے لحاظ سے مناسب موقع رعایت بھی کی جا سکتی ہے۔ اور ذمہ داری کو شخصی قرار دیا گیا کہ "ایک کا بار دوسرے پر ڈالا جائے"[1]
ایک نئی جدت یہ کی گئی کہ انسانوں کے سوا باقی سب مخلوقات کو ذمہ داری سے بری کر دیا گیا۔ ورنہ اب تک عرب میں کوئی گڑھا اور جانور بھی کسی آدمی کے ضرر اور ہلاکت کا باعث ہوتا تو ذمہ داری سے بری نہ ہوتا[2]۔ چنانچہ امام ابو یوسف نے بیان کیا ہے :-

"زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی گڑھے میں گر کر مرجاتا تو وہ گڑھا اس کا خون بہا قرار دیا جاتا (اور ہلاک شدہ شخص کے وارثوں کی ملک قرار پاتا) اگر کوئی جانور کسی کو قتل کرتا تو وہی اس کا خون بہا قرار دیا جاتا۔ اگر کوئی کسی کان میں ہلاک ہوتا تو وہ کان اس کا خون بہا قرار دی جاتی۔ کسی نے اس بارے میں آنحضرت سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ بے زبان جانور اور کان اور کنوئیں پر ضرر رسانی سے کوئی ذمہ داری نہیں پیدا ہوتی"[3]

ابھی بیان ہوا کہ مختلف صوبوں پر جو عامل اور قاضی بھیجے جاتے تھے انھیں خاص احکام اور ہدایتیں دی جاتی تھیں۔ مرکز حکومت مدینہ میں عدالت ابتدائی ہر قبیلے کے عریف اور نقیب ہوتے یا مفتی اور قاضی۔ عدالت مرافعہ اور عدالت انتہائی خود جناب رسالت مآب کی ذات تھی۔ مرافعہ اور استصواب آنحضرت کے پاس بعض وقت اضلاع اور صوبہ جات سے بھی ہوتا۔ تصحیح کی بھی متعدد نظیریں تاریخ نے اس عہد کے متعلق محفوظ کی ہیں اور جب کبھی آنحضرت صلعم کو کسی افسر کے غلط فیصلے یا طرز عمل کا پتہ چلتا تو آپ (بصیغۂ نگرانی) دخل دیتے۔ فرما کر تلافی اور تدارک فرماتے۔ حضرت خالد بن ولید اور واقعۂ بنی جزیمہ اس کی ایک انتہائی مثال ہے۔ نگرانی اور مرافعہ کا نظام حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک بہت ہی ترقی یافتہ ادارہ بن گیا تھا۔ اور انھوں نے حج کے موقع کو ایک عدالتی اور انتظامی تنقیح کا مقام بھی قرار دیدیا تھا چنانچہ ہر صوبہ دار اور حکام عدالت اس وقت مکہ معظمہ آتے اور حضرت عمرؓ ان

---

[1] قرآن مجید میں یہ آیۃ پانچ جگہ آئی ہے (۶: ۱۶۴؛ ۱۷: ۱۵؛ ۳۵: ۱۸؛ ۳۹: ۷؛ ۵۳: ۳۸)

[2] انگلستان ابھی گزشتہ انیسویں صدی کے وسط تک کسی گاڑی، کسی درخت، کسی جہاز اور کسی دوسرے غیر جاندار "قاتل" کو بھی قانوناً سزائے قتل دی جاتی تھی۔ دیکھئے

Hobhouse, *Morals in Evolution*, ch. Law and Justice.

اس طرح، جاہل عرب ہی کا زیادہ معقولیت پسند رہا ہونا معلوم ہوتا ہے۔

[3] کتاب الخراج صفحہ (۱۳)

کے خلاف دعوے اور مقدمے خود سنتے اور حق رسائی کرتے۔ اگر سرکاری افسروں سے کوئی لغزش ہوئی ہوتی تو بڑی سختی سے دار وگیر کرتے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ثبوت مانگے بغیر اگر ہر دعوے کو صحیح مان لیا جایا کرے تو لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ رہیں [۱] اسی لئے امور تنقیح طلب اور شہادت پیش شدہ کی جانچ کے لئے [۲] آنحضرت صلعم کے بہت سے اصولی اور ذیلی احکام حدیث میں ملتے ہیں۔ ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

انصاف رسانی کے لئے قاضی کو چاہئے کہ صرف روداد پر فیصلہ کرے اور اپنے خانگی معلومات کو دخل نہ دے [۳]۔ ایسا حکم نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ قاضیوں کو بد دیانتی کی ہمیشہ زبردست ترغیب ہوتی رہتی۔ ناحق فریق کی جادو بیانی کے سلسلے میں ایک دلچسپ حدیث قابل ذکر ہے جو صحاح ستہ میں آنحضرت سے مروی ہے:۔

"بے شبہہ میں صرف ایک انسان ہوں۔ تم میرے پاس جھگڑتے آتے ہو اور یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دلیل نسبت دوسرے کے زیادہ چرب زبانی کے ساتھ پیش کرے اور میں جو کچھ سنوں اسی کے مطابق فیصلہ صادر کردوں۔ اگر کسی کو میرے (اس طرح کے فیصلہ سے کچھ ناحق) ملے تو وہ اس سے استفادہ نہ کرے کیونکہ میں جو کچھ دیتا ہوں وہ آگ کے ایک ٹکرے کے سوا کچھ نہیں" [۴]

جس سماج میں پیشہ ور وکیل اور اڈوکیٹ نہ ہوں اور جو قانونی حق سے زیادہ قدرتی حق پر زور دیتا ہو، اس کے قاضیوں کے لئے حضرت علیؓ کو دی ہوئی اس ہدایت نبوی سے بہتر اور کیا ہدایت دی جاسکتی ہے کہ:۔

"جب تیرے پاس دو جھگڑنے والے آئیں تو تو اس وقت تک ان کا فیصلہ صادر نہ کر جبتک کہ تو پہلے اور دوسرے

---

[۱] مسند احمد بن حنبل ج (۱)، صفحہ (۳۶۳، ۳۴۳)

[۲] ورنہ قدیم عرب میں ملزم کا کھوج لگانے کے لئے "روحانی" قوتوں سے مدد لی جاتی اور فال، قرعہ، جادو، ٹوٹکے، دیوبانی، ہاتفی جیسے غیر یقینی ذرائع برت میں آتے یا غیب دانی کے مدعی عرّاف، کاہنوں وغیرہ کی من گھڑت باتوں پر عمل کیا جاتا۔

[۳] اس مسئلے پر ایک مختصر بحث اور حضرت ابوبکر و عمر کے اقوال و افعال کے لئے دیکھئے الطرق الحکمیۃ لابن القیم صفحہ (۴ تا ۶)

[۴] بخاری ... مسلم ۳۰ : ۴ - ترمذی ۱۳ : ۱۱ - ابوداود ۲۳ : ۷ - ابن ماجہ ۱۳ : ۵ - نسائی ۴۹ : ۱۳ ، ۲۳ - ابن حنبل ج (۶) صفحہ (۲۹ تا ۹) نیز اقضیۃ رسول اللہ للقرطبی صفحہ (۸۲) - الطرق الحکمیۃ صفحہ (۲۶۶)

دونوں کا بیان نہ سن لے۔ تیرے لئے اس طرح صحیح فیصلے کا سمجھنا زیادہ ممکن ہے۔ (حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ) اس کے بعد سے میں ہمیشہ فیصلے کرتا رہا ہوں اور فیصلے کرنے میں مجھے کبھی شک اور ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوئی"[1]

آنحضرت صلعم نے قانون اور انصاف سازی کا یہ اہم قاعدہ مقرر فرمادیا کہ بار ثبوت مدعی پر ہے۔ اور اگر مدعی ثبوت نہ پیش کر سکے[2] تو دعوے کے منکر یعنی مدعا علیہ کو قسم دی جائے۔[3] اس قاعدے کو بدلنے کی اب تک کہیں ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ مزید برآں، مدعی اپنے ناکافی ثبوت کی تلافی، جب کہ مدعا علیہ کے پاس بھی جوابی ثبوت نہ ہو، قسم کے ذریعے بھی کرتا اور عہد نبوی میں اس کی بہ کثرت نظیریں ملتی ہیں۔[4] ایک نسبتہً فروتر اخلاق کے زمانے میں ثبوب میں پیش شدہ گواہوں کے علاوہ قاضی شریح مدعی کو قسم بھی دیتے تھے کہ اسکا دعویٰ سچا ہے۔ لوگوں نے اسپر اعتراض کیا تو کہا: "جب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں نت نئی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں تو مجھے بھی نئے طریقے اختیار کرنے پڑے۔"[5]

اسی سلسلے میں حضرت علیؓ کی ایک نئی اصلاح کی طرف توجہ منعطف کرائی جاسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ گواہوں کی پیشی پر ان کا "تزکیہ" یعنی معتبر ہونے کے متعلق اہل محلہ وغیرہ کا اظہار قدیم سے رائج تھا۔ لیکن اس تحقیقات کو قاضی شریح نے مخفی طور سے کرانا شروع کیا[6] اور جھوٹے گواہوں کا انسداد کرنے کے لئے حضرت علیؓ ایک گواہ کا اظہار لیتے وقت دوسروں کو عدالت کے کمرے سے باہر دینے لگے اور ان کا قول مشہور ہے کہ " اَنَا اَوَّل مَن فَرَّق بَينَ الشُّهُود"،[7] ورنہ اس سے پہلے سب گواہ کمرۂ عدالت میں حاضر رہتے اور ایک دوسرے کے بیانات سنتے رہتے تھے۔

---

[1] ترمذی ۱۳ : ۵۔ ابوداود ۲۳ : ۶۔ ابن حنبل ج ۱ صفحہ (۱۱۱، ۱۴۹، ۱۵۰، ۹۰، ۹۶) الکافی ج ۲ ص (۲۵۷ تا ۲۶۱)

[2] ابن حنبل ج ۱ صفحہ (۲۰۸)

[3] البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ (والیمین علی من انکر) بخاری ۴۸ : ۲۰۔ ۶۵ : ۵۲/۳۔ مسلم ۳۰ : ۱، ۲۔ ابوداود ۲۱ : ۲۳ : ۲۲ : ۲۳ : ۲، ۴۴۔ ترمذی ۱۳ : ۱۲۔ نسائی ۴۹ : ۳۶۔ ابن ماجہ ۳۶ : ۸۔ ابن حنبل ج ۱ صفحہ ۲۴۲، ۳۵۱، ۳۵۱، ۳۶۳۔ المبسوط للسرخسی ج (۱۷) صفحہ (۲۸) الطرق الحکمیہ لابن القیم صفحہ (۹۴)

[4] مسلم ۳۰ : ۱۔ ترمذی ۱۳ : ۱۳۔ ابوداود ۲۳ : ۲۱۔ چنانچہ دو گواہوں کی ضرورت کے وقت ایک گواہ اور قسم پر فیصلے صادر کئے

[5] الطرق الحکمیہ صفحہ ۱۲۸

[6] المبسوط للسرخسی ج ۱۶ صفحہ (۹۱) نیز محاضرۃ الاوائل صفحہ (۹۷)

[7] الطرق الحکمیہ صفحہ (۶۰)

قاضی شریح کا ذکر اب تک کئی بار آیا ہے۔ فصل خصومات ان کا موروثی پیشہ تھا۔ اور ان کے والد ہانی اپنے بے لاگ فیصلوں کے باعث زمانۂ جاہلیت میں ابو الحکم کے معزز نام سے مخاطب کئے جاتے تھے۔[۱] خود شریح ان مادرزاد قاضیوں میں سے ہیں جن کی تعداد تاریخ عالم میں بھی کم ہے اور جن پر ہر قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ یہ بچے سے تھے کہ انھوں نے ایک پیچیدہ قانونی معمے میں، جس میں خلیفہ حضرت عمرؓ پریشان تھے، ایک بہترین اصول پیچیدگی کے حل کا بتایا۔ مردم شناس اور قدردان حضرت عمرؓ اس قدر خوش ہوئے کہ باوجود لوگوں کی مخالفت کے اس کمسن بچے کو عراق کے اہم صوبے کا قاضی بنا کر روانہ کیا۔ قاضی شریح کو وہاں جو کامیابی ہوئی اس کے لئے صرف اتنا بیان کرنا کافی ہوگا کہ وہ تقریباً پچہتر سال تک مسلسل اسی کام کو انجام دیتے رہے اور کسی خلیفہ مابعد کو ان کی اہلیت کے متعلق بدگمانی نہیں ہوئی۔[۲] انھیں قاضی شریح کو حضرت عمرؓ نے جو ہدایت نامہ دیا تھا اس کے چند فقرے خود ان کی زبانی سنئے:۔

"اگر تجھ کو کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو پھر اس کے متعلق کسی اور سے رجوع نہ کر۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنت میں اور جو سنت میں بھی نہ ملے تو پھر اپنی رائے کو کام میں لا۔"[۳]

ایک دوسری روایت میں ہے:۔

"شعبی نے شریح سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا: مجھ سے حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر پوری کتاب اللہ میں وہ مسئلہ نہ ملے تو رسول اللہ کے فیصلوں میں جو چیز ملے اس کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر رسول اللہ کا کوئی فیصلہ نہ ملے تو راہ یاب اماموں کے فیصلوں کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر راہ یاب اماموں کے فیصلوں میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو اپنی رائے کو کام میں لا اور علم و صلاح والوں سے مشورہ کر۔"[۴]

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ یہی طرز عمل اور حکم آنحضرت صلعم کا تھا اور بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا بھی یہی طرز عمل تھا۔[۵]

---

[۰] سنن نسائی میں کتاب آداب القضاۃ دیکھئے۔

[۱] المعارف لابن قتیبۃ صفحہ (۲۴۲)، وفیات الاعیان لابن خلکان بر موقع۔ استیعاب لابن عبد البر حدیث نمبر (۱۵۹ ۲)

[۲] اعلام الموقعین لابن القیم ج (۱) صفحہ (۳۰۰)، بعض اور تفصیلوں کے لئے دیکھئے المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۶۶)، کنز العمال ج (۲) صفحہ (۱۷۵)

[۳] اعلام الموقعین ج (۱) صفحہ (۳، تا ۴۷)۔ آخری جملے کی تائید کے لئے دیکھئے سنن نسائی کتاب آداب القضاۃ۔ نیز المقارنات صفحہ (۴۰)،

[۴] بحوالہ السیاسۃ الشرعیۃ لعبد الوہاب الخلاف صفحہ (۴۰)، نیز عیون الاخبار لابن قتیبہ باب "القضاء"۔

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں مختلف صوبوں کے قاضیوں کو جو ہدایتیں دی تھیں، ان میں سے چند تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں[۱] ان میں سے ایک جو "کتاب سیاستہ القضاء و تدبیر الحکم"، کے موزوں نام سے مشہور[۲] ہے، سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ وہ ہدایت نامہ ہے جو انھوں نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری کو بصرے کا قاضی بنانے کے بعد بھیجا تھا اور جو آج کل بھی حکام عدالت کے لئے دستور العمل بن سکتا ہے۔ اس کی اہمیت نے آکسفرڈ کے پروفیسر عربی ڈاکٹر مارگولیوث کو ۱۹۱۰ء میں اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ اس پر ایک بسیط مضمون لکھے[۳] مگر بد قسمتی سے اصل دستاویز کا انگریزی ترجمہ جو مارگولیوث نے کیا ہے، حد درجہ ناقص ہونے سے اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ پڑھنے والے کو بالکل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مولفوں نے بھی قدیم سے اس دستاویز کو بڑی اہمیت دی ہے، اور اس پر شرح لکھی ہے[۴]۔ اس کافی طویل دستاویز کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اصل متن بہ کثرت مولفوں نے محفوظ کیا ہے[۵]:۔

—— قضاءت ایک خدائی فریضہ اور آنحضرت کا واجب التعمیل حکم اور طرز عمل ہے۔

—— اگر آپ کے پاس کوئی مقدمہ رجوع ہو تو غور و فکر کے بعد پوری طرح سمجھ کر فیصلہ کیجئے اور اس کی تعمیل کرائیے بغیر تعمیل کے اچھے سے اچھا فیصلہ بھی بیکار ہے۔

—— فریقین سے برابری کا برتاؤ کیجئے تاکہ کمزور آپ کے عدل سے ناامید نہ ہو جائے اور قوی ظالم اس سے بے جا فائدہ نہ اٹھائے۔ اور نہ ظلم پر دلیر ہو جائے۔

بار ثبوت مدعی پر ہے اور منکر پر قسم۔

—— اگر فریقین صلح کر لینا چاہیں تو جن شرائط پر چاہیں صلح کر سکتے ہیں۔ صرف شرط یہ ہے کہ اس طرح

---

[۱] بنام ابو عبیدہ (کتاب الخراج لابی یوسف صفحہ (۶۷)) بنام حضرت معاویہ (المبسوط للسرخسی ج (۱۶) صفحہ (۶۵)) عقد الفرید لابن عبد ربہ ج (۱) صفحہ (۲۰)۔ دیگر بنام شریح (المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۶۹)) کنز العمال ج (۲) صفحہ (۱۷۵)) بنام حضرت ابو موسیٰ، علاوہ اس کے جس کا ذکر آگے ہے (عقد الفرید ج (۱) صفحہ (۲۲))

[۲] المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۲۰)

[۳] J. R. A. S., 1910.

[۴] مثلاً السرخسی نے المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۶۰) و ما بعد میں اور ابن القیم نے اعلام الموقعین ج (۱) میں

[۵] عربی متن اور جملہ عربی ماخذوں کے لئے دیکھئے مارگولیوث کا مذکورہ مضمون (مثل ابن قتیبہ، المبرد، الجاحظ، ابن خلدون، ابن عبد ربہ وغیرہ)

کوئی حرام چیز حلال نہ ہو جائے اور حلال چیز حرام۔

—— فیصلہ کر چکنے کے بعد نظر ثانی میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اصل مقصد حق رسانی اور انصاف ہے۔

—— اگر کسی بات کے فیصلے میں قرآن اور سنت میں کوئی چیز نہ ملے تو خوب غور و فکر کیجئے اور نظائر اور مشابہ امور کو ڈھونڈ کر ان پر قیاس کیجئے اور ایسا فیصلہ کیجئے جو خدا کو زیادہ پسند آئے اور حق سے زیادہ قریب ہو۔

—— اگر مدعی کو اپنا حق ثابت کرنے یا شہادت فراہم کرنے میں مہلت درکار ہو تو وہ دی جائے۔ شہادت سے اگر وہ دعویٰ ثابت کر دے تو اس کے موافق ورنہ اس کے مخالف فیصلہ صادر کیا جائے۔

—— شہادت کے اغراض کے لئے سب مسلمان قابل اعتماد ہیں، سوائے بدچلنی میں سزا یافتہ (مجلودٌ فی حدٍّ) اور ایسے لوگوں کے جن کا جھوٹی گواہی دینا اس سے پہلے ثابت ہو چکا ہو۔

—— کسی مدعی کے رشتہ دار کی خاص اس مقدمے میں شہادت قابل اعتماد نہیں۔

—— مجلس عدالت میں غرور و تکبر، لوگوں کو جھڑکنا اور حق بات پر ناگواری نہیں ظاہر کرنی چاہئے۔ خدا سب دیکھتا اور سنتا ہے۔ اسی سے سب کو اپنا معاملہ صاف رکھنا چاہئے۔

اس عہد کا اسلامی قانون شہادت اتنا وسیع موضوع ہے کہ ایک مستقل مقالے کے بغیر یہ بتانا ناممکن ہوگا کہ تفتیش کس طرح ہوتی ہے، تنقیح شہادت اور جرح کے کیا قاعدے ہیں، گواہوں کی تعداد، عمر، جنس (مرد اور عورتیں)، مسلم اور غیر مسلم کی شہادت، غیر ملکی مستامنوں کے عدالتی حقوق وغیرہ کے کیا قاعدے تھے۔ وغیرہ۔

قاضیوں کی تنخواہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔ اسلام میں اس اصول کو شروع ہی سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ قاضیوں کو معقول بلکہ بیش قرار تنخواہیں دے کر رشوت کے لالچ سے بچایا جائے آنحضرتؐ، طالب عہدہ لوگوں کو کبھی گورنر یا قاضی نہیں بناتے تھے تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے حکام عدالت کے لئے ماہواریں بھی مقرر کرنی شروع فرما دی تھیں اور اس بارے میں حضرت عتاب بن اسید کا نام بطور نظیر پیش کیا جاتا ہے جن کو، کہتے ہیں کہ ماہانہ تیس درہم تنخواہ دی جاتی تھی[1] سلیمان بن ربیعۃ الباہلی کو حضرت عمرؓ ماہانہ پانچ سو درہم دلاتے تھے اور کہتے قاضی شریح کو ماہانہ ایک سو[2]۔ حضرت علی اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ قاضی شریح کے پاس اپنے ایک مقدمے کے لئے رجوع ہوئے اور

---

[1] الکتانی ج (۱) صفحہ (۲۶۴) بحوالہ ہدایہ)

[2] المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۱۲۲)

اپنے بیٹے امام حسنؓ کو بطور گواہ پیش کیا۔ حضرت علیؓ کے باوجود خلیفہ ہونے اور امام حسنؓ کی خصوصی شخصیت تبا کر اصرار کرنے کے قاضی شریح نے بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد حضرت علیؓ نے قاضی شریح کی بھی پانچ سو درہم ماہوار مقرر کر دی۔[۱]

متعدد نظیروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت فوجداری مقدموں میں ملزم کو تحقیقات تک اور مدیون کو قرض کے ادائی کے لئے حوالات میں رکھتے تھے۔[۲] نیز حاضری کا مچلکہ بھی لیتے تھے۔[۳] خلافت راشدہ میں قیدخانوں کے لئے مستقل عمارت ہونے لگ گئی تھیں۔ اس غرض کے لئے حضرت عمرؓ کا مکان خرید کرنا مشہور رہے۔ حضرت علیؓ کے بنائے ہوئے دو قید خانے نافع اور مخیس کے نام سے مشہور رہیں۔[۴]

انگریزی قانون کا ایک اہم اصول ہے کہ بادشاہ کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں دائر کیا جا سکتا کیونکہ (King can do no wrong). لیکن اسلام کسی کو خطا سے مبرا نہیں سمجھتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ذات کے خلاف ٹارٹ اور دیوانی دونوں قسم کے متعدد مقدمات سنے اور مدعیوں کے حق میں فیصلے صادر کئے۔ حضرت عمرؓ نے نہ صرف اضلاع بلکہ مستقر حکومت، مدینہ منورہ میں مستقل اور پورا وقت دینے والے قاضی مقرر کر دیئے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ خود خلیفہ کے خلاف کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو خلیفہ کو بھی عدالت میں حاضر ہو کر جوابدہی کرنی پڑتی۔ اس قسم کے نظیریں نہ صرف حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں ملتی ہیں[۵] بلکہ خلفاء بنی امیہ و بنی عباس تک اس سے اپنے کو مستثنیٰ کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ اور خلیفہ منصور عباسی کا عدالت میں مدعا علیہ بن کر جوابدہی کے لئے حاضر ہونا ثبوت کے لئے کافی ہے۔ اس کی نظیریں بعد کے زمانوں میں دیگر اسلامی ممالک میں بھی ملتی ہیں۔

مستقل قاضیوں کے سلسلہ میں ایک بعد کے زمانے کا واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مورخ ابن الجوزی نے بیان کیا ہے کہ عبید اللہ بن الحسن العنبری اور عمر بن نامر بصرے میں پہلی مرتبہ ایک عدالت میں مشترک قاضی مقرر کئے گئے اور

---

[۱] مبسوط ج (۱۶) صفحہ (۱۳۲)

[۲] ابو داؤد ۲۳ : ۲۸ قرطبی صفحہ ۴ تا ۵) کتانی ج (۱) صفحہ (۱۲۶)

[۳] مبسوط ج (۲۰) صفحہ (۵۷)

[۴] مبسوط ج (۲۰) صفحہ (۸۸)

[۵] ابن ہشام صفحہ (۴۴۴) ابن الاثیر ج (۲) صفحہ (۲۴۲)

[۶] مبسوط ج (۱۶) صفحہ ۳، ۷ و ۴ ، و ۱۲۲ طبقات ابن سعد ج ۱ / ۲ صفحہ ۱

[۷] ولاۃ مصر للکندی ص (۳۰۷ و ۳۷۵) (الحکم بن ہشام بن عبدالرحمن الداخل کے لئے دیکھئے المقری کی نفح الطیب طبع یورپ ج (۱) صفحہ (۲۵۵) میں اس حوالے کے لئے محترم پروفیسر جمیل الرحمان صاحب کا ممنون ہوں۔ اسی طرح ماوردی میں بھی کچھ واقعات ہیں۔

انھیں حکم دیا گیا کہ وہ مل کر مقدمے سنیں اور متفقہ فیصلے صادر کریں[۱]۔

قاضی یا حاکم عدالت کا اجلاس شروع میں عموماً مسجدوں میں ہوتا تھا جو شہر کے ٹاؤن ہال کا کام دیتی تھیں۔ ان مسجدوں میں مسلم اور غیر مسلم سب بے تکلف آ سکتے تھے۔ ابن عساکر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں ایک عمارت "دار القضا" کے نام سے بن چکی تھی[۲]۔ سلطان نور الدین زنگی کا ایک "دار العدل" تعمیر کرانا البتہ ایک بعد کا واقعہ ہے۔

چونکہ مقدمات ہر قسم کے پیش ہوتے ہیں اس لئے ان کے تصفیے کے لئے ماہرین کی امداد حاصل کرنی ضروری ہوتی ہے۔ تعمیرات[۳]، غلے اور زرعی پیداوار کا اندازہ[۴]، قیافہ شناسی[۵]، اور اسی طرح کے چند چیزوں کے ماہر خود عہد نبوی میں عدالتی اغراض کے لیے بر سر موقع بھیجے جایا کرتے تھے اور ان کی رائے پر آنحضرت[ص] فیصلہ کرتے اور فیصلہ نافذ کراتے۔

قاضی کا تقرر شروع سے مرکزی حکومت سے متعلق رہا ہے خاص کر صوبوں کے صدر قاضی، البتہ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی[رض] اور خود حضرت عمر اپنے گورنروں کو اجازت دیتے تھے کہ اپنے علاقے میں حسب ضرورت حکام عدالت خود مقرر کریں اور انھیں کافی تنخواہ دے کر مستغنی بنا دیں[۶]۔

قاضیوں کا سخت غصے کی حالت میں فیصلے نہ کرنا، پیچیدہ مقدموں میں مشورے کرنا، جھوٹے دعوے، جھوٹی شہادت و جانبدارانہ فیصلوں پر سخت وعیدیں، رشوت اور سفارش کی ممانعت، مبہم فیصلوں (قضاء القضائین) کی ممانعت وغیرہ امور زیادہ تر ادب القاضی[۷] سے متعلق ہیں۔ ان پر اس مختصر اشارے کے بعد ایک اہم تر چیز کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

عدل گستری کے لئے حق و ناحق میں امتیاز کرنے کے لئے ایک معیار یعنی قانون کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ فیصلوں میں ہر جگہ

---

[۱] کتاب الاذکیا، مخطوطہ باڈلین، ورق ۲۳ ب نیز دیکھئے کتاب المتقاربات صفحہ (۱۹)

[۲] بحوالہ کتانی ج (۱) صفحہ (۱۷)   [۳] (بعہد بالبناء) کتانی ج (۱) صفحہ (۲۸۰ تا ۲۸۱)

[۴] اخراص، کتاب الاموال لابی عبید فقرہ (۱۰۳۴ تا ۱۰۶۰) نیز بکثرت حوالے۔

[۵] الطرق الحکمیۃ لابن القیم صفحہ (۱۹۶)۔ مزید حوالوں کے لئے کتاب مفتاح کنوز السنۃ تحت لفظ "قاف"

[۶] الکتانی۔ التراتیب الاداریہ ج ۱ ص (۲۶۰)

[۷] علاوہ فقہی کتابوں کے "باب ادب القاضی" کے شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغۃ ج (۲) صفحہ (۲۴ تا ۲۷) "القضا" ملاحظہ ہو۔ نیز مفتاح کنوز السنۃ تحت لفظ "قضا"

یکساں رہے اور لوگوں کو اپنے حقوق و فرائض پہلے ہی سے معلوم رہیں۔ اور ساتھ ہی ان احکام کی خلاف ورزی کے لئے ایک تدارک اور ایک تہدید بھی مقرر کر دی جائے تاکہ ان کی پابندی زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

تدارک کے لئے عام طور پر صرف حکومت کی قوت کام میں لائی جاتی ہے لیکن پوشیدہ جرائم خاص کر چھوٹی تادیبوں کی اس سے روک تھام نہیں ہوتی۔ اس لئے اسلام نے برائیوں کی اصل جڑ پر وار کیا اور احکام کو ایک تقدس دے دیا تاکہ ہر فرد رعیت خوف سے نہیں بلکہ برضا و رغبت اور نہ صرف ظاہر بلکہ باطن میں حکومت کی دار و گیر سے بالکل باہر بھی، ہر جگہ اپنے فرائض بجالائے اور جرم اور گناہ سے بچے۔ حشر و حساب کا عقیدہ بھی اس کو موثر بنانے میں بڑا حصہ لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مقنن اصلی اور سرچشمۂ احکام صرف خدائے حکیم و قدیر کی ذات ہے جس کا کوئی حکم نامناسب یا ظالمانہ نہیں، جو انسانوں کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے ان کے اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور اس کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیغمبر تھے اور خدا کا پیغام بندوں تک پہنچاتے تھے اپنے دل سے کچھ نہیں کہتے تھے وما ینطق الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔[۱]

غرض خدا نے اپنے احکام کچھ تو اپنی کتاب[۲] یعنی قرآن کی صورت میں دئے جو ابتدائے اسلام سے تھوڑا تھوڑا نازل ہو کر آنحضرتؐ کے زندگی میں مکمل ہو گیا۔ اس کے سوا کچھ اور احکام آنحضرتؐ کے قول و فعل کے ذریعے پہنچائے گئے اور قرآن ہی میں ان کے واجب التعمیل ہونے کی صراحت کر دی گئی۔[۳]

یہ تو راست قانون سازی تھی۔ فقیہ، مجتہد، قاضی، وغیرہ اسی قانون موضوعہ کے پابند ہوتے ہیں گو جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل گورنر کے سلسلہ میں بیان کیا گیا کہ اجتہاد اور صوابدید نیز استحسان کے لئے گنجائش رکھ کر قانون میں ضروری لچک پیدا کر دی گئی۔

قرآن و حدیث اور آرائے مجتہدین یعنی اجماع و قیاس سے قانون اسلام کا انتخاب، استنباط، تدوین اور ترقی اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اس مختصر خاکے کے آخر میں ان حقوق اساسی کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع (۱۰ھ) کے موقع پر اپنے جبل الرحمۃ کے مشہور پہاڑی خطبے[۴] میں حلقہ بگوشان اسلام کے لئے مقرر فرمائے۔ یہ خطبہ مسلمانوں

---

[۱] قرآن سورہ نجم آیت ۳

[۲] کتاب کے معنی "فرض مقررہ" کے بھی ہیں۔

[۳] قرآن ۲۳:۲۱-۵۹:۷ وغیرہ

[۴] پورے متن کے لئے دیکھئے ابن ہشام صفحہ (۹۶۸ تا ۱۰۰)، تاریخ طبری صفحہ (۱۷۵۳ تا ۱۷۵۵) البیان والتبیین للجاحظ ج (۲) صفحہ ۲۴ تا ۲۶ تاریخ یعقوبی ج (۲) صفحہ (۱۲۲ تا ۱۲۳) عقد الفرید لابن عبد ربہ باب خطب وغیرہ وغیرہ

کی تاریخ تمدن میں ایک منشور انسانیت کا کام دیتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

——— ہر شخص کے تین بنیادی حقوق۔ جان مال اور عزت محفوظ اور قابل احترام ہیں۔

——— امانت اور قرض واپس ادا کئے جائیں۔

——— زمانۂ جاہلیت کا سود ممنوع کیا جاتا ہے اور فی الوقت واجب الادا سود بھی نہیں دلائے جائیں گے۔
صرف اصل واپس ملے گا۔ خود حضرت عباس کے سود بھی کالعدم کئے جاتے ہیں۔

——— زمانۂ جاہلیت میں کئے ہوئے خون لوگ اب بھول جائیں اور ان کے بدلے اور انتقام کا خیال نہ
کریں خود آنحضرت اپنے چچازاد بھتیجے کا خون معاف کرتے ہیں۔

——— زمانۂ جاہلیت کے تمام آثار مٹا دئے جاتے ہیں سوائے خانۂ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کے پانی
کے انتظام کے۔

——— قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا، اور شبہ عمد میں سو اونٹ خون بہا لیا جائے گا۔

——— سال کبیسہ کی تقویم برخاست کی جاتی ہے۔ اور قمری سنہ رائج کیا جاتا ہے جس میں بارہ مہینے ہوتے ہیں

——— میاں اور بیوی کے ایک دوسرے پر حق ہوتے ہیں شوہر کا حق یہ ہے کہ بیوی پاکدامن رہے اور
ان لوگوں کو گھر میں داخل ہونے نہ دے جن کو شوہر ناپسند کرتا ہے۔ بیوی کا حق یہ ہے کہ شوہر اسے اچھا
کھلائے اور پہنائے اور اچھا برتاؤ کرے۔

——— سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں بلا رضامندی کوئی کسی کا مال نہ لے۔ اور نہ آپس میں لڑائی کیجے۔

——— میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان کو تھامے رہوگے، تم بھٹکوگے نہیں۔
وہ قرآن اور سنت ہیں اور میں تمہیں اپنے اہل بیت سے سلوک کے متعلق بھی یاد دہانی کرتا ہوں۔

——— سب لوگوں کا رب بھی ایک ہی ہے اور سب آدمیوں کا باپ بھی ایک ہی ہے تم آدم سے
ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ خدا کے نزدیک تم میں سب سے محترم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔
ورنہ کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔

——— وراثت کے لئے حصے خدا نے مقرر کر دئے ہیں، وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی روا نہیں

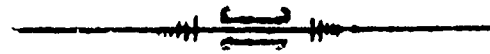
بچہ فراش (عورت) کا ہوگا اور زانی کو پتھر ملیں گے۔

نسب اور ولا میں جھوٹے دعوے اور کوششیں ایک ملعون فعل ہیں۔

یہ ایک سرسری خاکہ ہے جو ابتداء اسلام کے زیادہ تر طرز عمل و نظائر کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے اور یہی طرز عمل بعد کے زمانوں میں ہمیشہ تمام دنیائے اسلام کے لئے ایک قابل عمل نمونے اور ایک واجب التعمیل نظیر اور حکم کا کام دینے لگا۔ اسلامی تصور عدل کے متعلق چند قرآنی آیتوں کی تلاوت سے اسے ختم کرتا ہوں:۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (خدا عدل اور نرمی و نیکی کا حکم دیتا ہے) وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (کسی کے بغض کی وجہ سے تمھیں ناانصافی پر آمادہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ عدل کرنا چاہئے جو پرہیزگاری کا تقاضا ہے) جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ (برائی کا بدلہ برابر کی برائی سے دیا جاسکتا ہے لیکن اگر کوئی معافی دیدے اور نیکی کرے تو خدا اس کا اجر دے گا) وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ (اگر بدلہ لینا چاہو تو ہرج کے برابر کا بدلہ لو لیکن اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے)۔

محمد حمید اللہ



وہاں

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دُنیا ہے

وہاں بادِ صبا منھ چومتی ہے کوہساروں کے
شباب انگڑایاں لیتا ہے دامن میں بہاروں کے

وہاں شعلے لئے پھرتی نہیں برق اپنے دامن میں
سکوں کی نیند سوتے ہیں وہاں طائر نشیمن میں

وہاں مرآتِ حُسن و عشق میں قدرت سنورتی ہے
سنہری وادیوں میں شاہدِ فطرت نکھرتی ہے

ترنم رقص کرتا ہے وہاں کے آبشاروں میں
تبسم کھیلتا پھرتا ہے رنگیں مرغزاروں میں

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دنیا ہے

وہاں دامان گردوں میں فضائیں مسکراتی ہیں
بکھر کر کوہساروں پر گھٹائیں مسکراتی ہیں

وہاں شیرازۂ رازِ سکوں برہم نہیں ہوتا
وہاں ناکامیٔ تقدیر کا ماتم نہیں ہوتا

وہاں ہوش و خرد پر مستیاں چھائی سی رہتی ہیں
سدا بامِ فلک پر بدلیاں چھائی سی رہتی ہیں
سرور و کیف ہوتا ہے وہاں کی داستانوں میں
وہاں موسیقیاں بستی ہیں الفت کے فسانوں میں

اُفق کے پار سنتے ہیں کہ اک رنگین دنیا ہے

وہاں بربط کے دامن میں انوکھے گیت سوتے ہیں
ربابِ دل کے تاروں میں سُریلے گیت ہوتے ہیں
محبت کو وہاں رسوائیوں کا ڈر نہیں ہوتا
وہاں دامن سرشک چشم نم سے تر نہیں ہوتا
خزاں کی بدلیاں گلزار پر چھانے نہیں پاتیں
نشیمن کو جلانے بجلیاں آنے نہیں پاتیں
بہت رنگیں وہاں کی داستانِ زندگانی ہے
وہاں منزل نشیں ہر کاروانِ زندگانی ہے

اُفق کے پار سنتے ہیں کہ اک رنگین دنیا ہے

وہاں بہتے ہوئے دریا مسلسل گنگناتے ہیں
وہاں راتوں کی خاموشی میں انجم مسکراتے ہیں
حیا کی گود میں چھپ کر وہاں سوتے نہیں جلوے
نظر افروز ہو کر پھر نہاں ہوتے نہیں جلوے
وہاں نغمے نکلنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں
نفس کے تار لرزاں صورتِ مضراب رہتے ہیں
وہاں موسیقیوں میں جذب ہو جاتی ہے خاموشی
وہاں نغموں کے ہنگاموں میں کھو جاتی ہے خاموشی

اُفق کے پار سنتے ہیں کہ اک رنگین دنیا ہے

علی احمد (عثمانیہ)

موضع ہنگنٹہ کی معاشی تحقیق

فاضل مقالہ نگار نے اس مضمون کو جس تحقیق و تفتیش اور محنت و کاوش سے لکھا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جو اس دلچسپ مقالہ کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ یہ مقالہ "بزم معاشیات" جامعہ عثمانیہ کے روبرو مضمون نگاری کے مقابلہ میں پیش کیا گیا تھا اور اس کو ۱۳۴۶ف کے "میکنزی انعام" کا مستحق قرار دیا گیا۔ کاش ہمارے دوسرے برادران جامعہ کو بھی اس قسم کے تعمیری اور اصلاحی مضامین لکھنے کی ترغیب ہو جن پر قوم و ملک کی ترقی کا بہت کچھ انحصار ہے

مدیر

محل وقوع موضع ہنگنٹہ تعلقہ و ضلع گلبرگہ سمت ہٹواری میں دور بہمنی کی ایک قدیم آبادی ہے جس کے شمال میں موضع ترن ہلی، جنوب میں دریائے کاگنا اور موضع کونور، مشرق دریائے کاگنا اور موضع انگلگی اور مغرب میں موضع کڑہلی واقع ہیں۔ ہنگنٹہ جی آئی پی ریلوے کے اسٹیشن شاہ آباد سے بجانب جنوب اور اسٹیشن واڑی جنکشن سے بجانب مغرب تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر دریائے کاگنا اور دریائے بھیما کے سنگم پر واقع ہے۔

رقبہ

موضع کا مجموعی رقبہ (۱۰و۱۷۰) ایکڑ ۸ گنٹھ، رقبۂ مزروعہ (۹و۴۴۷) ایکڑ اور رقبۂ غیر مزروعہ (۷۲۲) ایکڑ ہے۔

آبادی

از روئے مردم شماری[1] ۱۳۴۰ف موضع ہذا کی آبادی جملہ (۴۵۷) خاندان یا (۲و۱۶۳) نفوس پر مشتمل ہے۔ جس میں (۳۳۲) خاندان یا (۱۲۴۰) نفوس ہندو، (۸۹) خاندان یا (۵۸۲) نفوس مسلمان اور (۳۶) خاندان یا (۳۴۱) نفوس اچھوت ہیں۔ بہ لحاظ مذاہب موضع کی مجموعی آبادی کا (۵۷٫۳۳) فیصد حصہ ہندو، (۲۶٫۹۱) فیصد حصہ مسلمان اور (۱۵٫۷۷) فیصد اچھوتوں پر مشتمل ہے۔

(ذکور واناث) بلحاظ ذکور واناث (۲،۱۶۳) نفوس کے (۶۲۴) مرد، (۷۲۳) عورتیں، (۴۲۰) لڑکے، اور (۳۹۶) لڑکیاں ہیں۔ جس میں سے کتخدا مرد (۵۳۴)، بے زن مرد (۹۰)، کتخدا عورتیں (۵۳۴)، بیوائیں (۱۸۹)، شادی شدہ لڑکے (۳۵) اور بیاہی لڑکیاں (۱۱۰) ہیں۔ گویا منجملہ (۶۲۴) مردوں اور (۴۲۰) لڑکوں کے (۵۵٫۶) فیصد مرد کتخدا (۸٫۸۱) فیصد بے زن اور (۳۷٫۵) فیصد کنوارے ہیں۔ اور منجملہ (۷۲۳) عورتوں اور (۳۹۶) لڑکیوں کے (۵۷٫۵) فیصد کتخدا اور (۱۶) فیصد بیوہ اور (۲۵٫۶) فیصد کنواری ہیں۔

شادیاں

مندرجہ بالا اعداد و شمار میں کتخدا مردوں اور عورتوں کی تعداد سے ہندوستانی دیہی زندگی کی ایک عام عمرانی خصوصیت کا پتہ چلتا ہے کہ اہلِ دیہہ کے نقطۂ نظر سے کسی مرد کا سنِ بلوغ پر پہنچ جانے کے بعد متاہل زندگی اختیار کرنے میں توقف خانہ آبادی سے انکار کے مرادف ہے۔ رسم و رواج کے مطابق والدین اس بات کے پابند ہیں کہ اکثر صورتوں میں بلوغ سے کچھ مدت قبل اور بصورتِ مجبوری بلوغ سے فوراً ہی بعد اپنی لڑکیوں کو بیاہ دیں۔ بالغ لڑکیوں کا بے بیاہی گھر میں رہنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ دورانِ تحقیق میں اس امر کا انکشاف ہوا کہ اکثر صورتوں میں ہندو لڑکی کی شادی کی عمر (۱۱) سال اور مسلمان لڑکی کی (۱۳) سال ہے۔ چنانچہ موضع میں شاید ہی کوئی ہندو بالغ لڑکی اور شاذ و نادر صورتوں میں کوئی بالغ مسلمان لڑکی بے بیاہی ہو چونکہ آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کی آبادی بھی ازدواج کمسنی کی خوب صورت بلا کے آہنی چنگل سے آزاد نہیں ہے۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ ان کی پست حالتِ جسمانی کے دیگر اسباب میں کمسنی کی شادی ایک اہم سبب ہے۔ قبل از وقت تعلقاتِ ازدواجی

[1] بذاتِ خود گنگی۔

کے قائم ہوجانے سے فریقین کے جسمانی نشو و نما کے رک جانے اور مریض ناتوان اولاد کے پیدا ہونے کے علاوہ جو بجائے خود معاشی اعتبار سے مضرت رساں ہیں افرادِ خاندان میں نامناسب اضافے کے سبب موجودہ پست معیارِ زندگی پست تر ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ مزارعین کی قلیل المقدار آمدنیاں کثیر التعداد اولاد کی پرورش کے بارِ عظیم کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔

صحت عامہ دیہی باشندوں کے انحطاطِ جسمانی میں ان کے ناپاک اور گندہ طرزِ سکونت کو بڑا دخل ہے۔ ہنگلنہ دورِ بہمنیہ کی آباد شدہ بستی ہے۔ ویران کھنڈروں کے علاوہ صرف قابلِ سکونت دکانوں کی تعداد (۳۶) بمقابلہ (۵۷) خاندان ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ متعدد گھر یا تو بے چراغ ہیں یا کسی نے اُن میں چارہ اور بوسیدہ سامان بھر دیا ہے۔ کھنڈروں کی کثرت کی وجہ سے آبادی گندی اور غیر صحت بخش ہوگئی ہے۔ چند خوشحال خاندانوں سے قطع نظر دیگر خاندانوں کے مکانات کی حالتِ صفائی افسوسناک ہے۔ ان کے مکانات نہ صرف تنگ و تاریک ہیں بلکہ گنجان بھی۔ آبادی کے بعض حصے ایسے ہیں جہاں دورویہ مکانات کے درمیان تین چار فٹ سے زیادہ راستہ نہیں ہے۔ انھیں تنگ گلیوں سے مزارعین کی خود بھی آمد و رفت رہتی ہے اور اُن کے مویشی بھی انھیں راستوں سے گذرتے ہیں۔ بستی کی غلیظ حالت کی وجہ سے یوں بھی ہوا ناپاک رہتی ہے مگر ان تنگ گلیوں کے ساکنین جب تک گھروں میں ہوتے ہیں اس گندی ہوا سے بھی تقریباً محروم رہتے ہیں۔ موضع کے مختلف حصے تدریجی نشیب و فراز میں آباد ہیں۔ زمانہ بارش میں جب گندہ پانی ان تنگ گلیوں میں بہتا پھرتا ہے تو ان پر بدروؤں کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

مزارعین اپنے مویشی بالعموم مکانوں کے صحن میں باندھتے ہیں۔ اگر صحن نہ ہوا تو مکان کا ایک گوشہ مویشیوں کے لئے مختص کر دیا جاتا ہے جن کی وجہ سے مکانات متعفن رہتے ہیں۔ مویشیوں کے فضلے سے نہ صرف سارا مکان بھرا ہوتا ہے بلکہ ہوا کی آمد و رفت کی جو راہیں دیواروں اور چھتوں میں رہ بھی جاتی ہیں دیہاتی عورتیں اوپلے تھوپ تھوپ کر انھیں بھی مسدود کر دیا کرتی ہیں۔

موضع کے پیدائشیں اور اموات کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوسکے تاہم مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے صحت عامہ کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش نظر ہوتا ہے:-

(خاکہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

سولہ سال سے کم عمر بچوں کی تعداد

سنہ ۱۳۳۰ف

	عمر	لڑکے	لڑکیاں
	ایک سال یا اس سے کم	۲۵	۳۰
(۱)	ایک سال سے زیادہ پانچ سال تک	۱۱۰	۶۰
	پانچ سال سے زیادہ پندرہ سال تک	۲۱۶	۲۵۰

سنہ ۱۳۴۰ف [1]

	عمر	لڑکے	لڑکیاں
	ایک سال سے زیادہ یا اس سے کم	۱۳۸	۱۲۷
(۲)	ایک سال سے زیادہ پانچ سال تک	۶۵	۲۵
	پانچ سال سے زیادہ پندرہ سال تک	۹۰	۴۶

سنہ ۱۳۴۶ف [2]

	عمر	لڑکے	لڑکیاں
	ایک سال سے زیادہ یا اس سے کم	۳۵	۳۹
(۳)	ایک سال سے زیادہ پانچ سال تک	۱۱۱	۱۳۴
	پانچ سال سے پندرہ سال تک	۲۴۶	۲۵۸

---

[1] حاصل کردہ از دفتر دیہی

[2] از مردم شماری سنہ ۱۳۴۶ف جو بذات خود کی گئی۔

صحت عامہ کے اندازہ کرنے میں مندرجۂ ذیل جدول بھی مفید مطلب ہوسکتا ہے جس میں موجودہ آبادی کی تقسیم بلحاظ عمر کی گئی ہے :-

عمر	مرد	عورت
سولہ تا بیس سال	۹۵	۱۲۵
اکیس تا تیس سال	۱۸۹	۲۳۳
اکتیس تا چالیس سال	۱۹۱	۱۰۸
اکتالیس تا پچاس سال	۸۳	۱۰۱
اکیاون تا ساٹھ سال	۴۰	۵۲
ساٹھ سے زیادہ	۳۱	۳۷

آبادی کی حالت مستقل ہے

سنین ماضیہ[1] میں آبادی کی حالت درج ذیل ہے :-

سنہ ۱۳۱۰ف " " " " " " (۲،۲۳۴)

سنہ ۱۳۲۰ف " " " " " " (۲،۲۳۷)

سنہ ۱۳۳۲ف " " " " " " (۲،۱۴۸)

سنہ ۱۳۴۶ف[2] " " " " " " (۲،۱۹۳)

یعنی گذشتہ (۳۵) سال کی مدت میں موضع کی آبادی کم و بیش قائم ہی رہی۔ اور ظاہر ہے کہ بچوں کی اُس کثیر تعداد کا لحاظ کرتے ہوئے جو اوپر درج کی گئی ہے یہ حالت بہر طور افسوسناک ہے۔ اس سے سوائے اس کے اور کیا نتیجہ

[1] سنہ ۱۰، سنہ ۲۰، سنہ ۳۲ف کے اعداد و شمار دفترِ تحصیل تعلقہ گلبرگہ سے حاصل کئے گئے۔

[2] سنہ ۴۶ف کے اعداد و شمار بذاتِ خود مردم شماری سے ماخوذ ہیں۔

نکالا جاسکتا ہے کہ ہر سال آبادی میں جس قدر اضافہ بذریعہ پیدائش ہوا اسی قدر تخفیف بذریعہ اموات ہوتی رہی اور آبادی پینتیس سال پیشتر جتنی تھی اتنی ہی رہ گئی۔

موجودہ حالات کے اعتبار سے فی مربع میل مزروعہ زمین پر (۴ر۱۴۷) افراد کی بسراوقات ہو رہی ہے۔ حالانکہ ماہرین کی رائے میں "اگر ایک آبادی اپنے وسائل قدرت سے بدرجہ اتم استفادہ کرے تو (۲۵۰) نفوس فی مربع میل کی پرورش ہوسکتی ہے"[1] مقامی حالات کے مدنظر بہرحال اس کی گنجائش باقی ہے کہ نہ صرف موجودہ افراد ہی کی پرورش معقول معیار پر ہوسکتی ہے بلکہ اس میں مزید اضافہ سے بھی تشویشناک صورت حال کے پیدا ہوجانے کا احتمال نہیں ہے بشرطیکہ "وسائل قدرت سے استفادۂ اتم" کی شرط پوری ہو۔

ذرائع معاش

اہالیان موضع کے ذرائع معاش زیادہ تر زراعت، مزدوری اور صنعت و حرفت پر مشتمل ہیں۔ صرف (۶) خاندان یا (۳۰) نفوس کا ذریعۂ معاش سرکاری ملازمت مثل مدرسی یا پٹیل گیری ہے۔

صنعت و حرفت صنعت و حرفت سے (۱۶) خاندان یا (۵۷) نفوس آذوقہ حیات پا رہے ہیں۔ جس میں (۶) خاندان یا (۲۲) نفوس پارچہ بافی، (۴) خاندان یا (۱۹) نفوس نجاری، (۲) خاندان یا (۷) نفوس زرگری (۱) خاندان یا (۱۰) نفوس لوہاری، (۱) خاندان یا (۴) نفوس خیاطی، ایک خاندان یا (۳) نفوس گلی ظروف سازی میں مصروف ہیں۔ مزید براں دھنگروں کے سات خاندانوں کا ذریعۂ معاش کمبل بافی بھی ہے۔

موضع کے سن رسیدہ باشندوں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ موضع کسی زمانہ میں بھی کسی خاص صنعت کے لئے مشہور نہ تھا۔ یہاں کی صنعتیں تمام تر دیہی نوعیت کی چلی آتی ہیں۔ چنانچہ جن (۶) خاندانوں میں پارچہ بافی ہوتی ہے اس سے بیشتر مقامی ضروریات کے لئے معمولی پارچہ کی فراہمی مقصود ہوتی ہے۔ ان پارچہ بافوں کے آلات قدیم طرز کے ہیں۔ سوت کی فراہمی رنگم پیٹھ، یادگیر، یا شولاپور سے ہوتی ہے۔ نجار اور لوہار بھی قدیم وضع کے آلات استعمال کرتے ہیں۔

زراعت یوں تو مندرجۂ بالا اہل حرفہ اور ملازمین سرکاری کے علاوہ جملہ آبادی کی روزی کا انحصار کسی نہ کسی صورت

[1] معاشیات ہند مصنفہ جتھار و بیری صاحبان صفحہ (۴۰)

سے زراعت پر ہے۔ لیکن ایسے افراد کی تعداد جن کا ذریعہ معاش خالص زراعت ہے (۷۹۸) ہے اور ایسے افراد جن کا اصل پیشہ تو مزدوری یا اور کچھ ہے لیکن ذیلی طور پر زراعت کرتے ہیں (۴۰۹) ہیں۔ مزید برآں (۲۷۰) ایسے افراد بھی موجود ہیں جن کا اصل پیشہ تو زراعت ہے لیکن ذیلی طور پر مزدوری کرتے ہیں۔ گویا بہ حیثیت مجموعی (۱۴۷۷) افراد یا کُل آبادی کا (۶۸٫۲۸) فیصد حصے کی گزر اوقات زراعت پر ہوتی ہے۔

مخفی مبادکہ (۵۱۴) افراد ایسے بھی ہیں جن کا تعلق زرعی مزدوری سے ہے اور یہ مجموعی آبادی کا (۲۳٫۲۵) فیصد جزو ہیں۔ یہ مزدور پیشہ آبادی ایسی ہے جن کے قبضہ میں چپہ بھر مزروعہ زمین بھی نہیں ہے، ورنہ جن اشخاص کی ملکیت میں (۲) یا (۱½) ایکر آراضی بھی ہے انھیں ہم نے ذیلی زراعت میں شمار کر لیا ہے۔

سطور بالا میں زراعت پیشہ آبادی کے تناسب کے تخمینہ میں صرف انھیں افراد کا شمار کیا گیا تھا جو زراعت کو بطور خاص اصل یا ذیلی پیشہ کے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ورنہ موضع کی مزدور پیشہ آبادی کی زندگی اور موت بھی زراعت ہی کے دامن سے وابستہ ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے زراعت پر گزر بسر کرنے والوں کی تعداد (۱۴۷۷) سے بڑھ کر (۱۹۹۱) اور زراعت پیشہ آبادی کا تناسب (۶۸٫۲۸) کی بجائے (۹۲) فیصد ہو جاتا ہے۔ آبادی کے اس طرح کُلّی یا جزئی طور پر زراعت میں مشغول رہنے سے ہماری دیہی زندگی میں زراعت کی غیر معمولی اہمیت کا ثبوت ملتا ہے۔

جدول ذیل میں موضع کے ذرائع معاش کی وضاحت کی گئی ہے۔

	نام پیشہ	افراد	فیصد تناسب
۱	زراعت خالص	۷۹۸	۳۷٫۰
۲	اصل زراعت دیگر ذیلی	۲۷۰	۱۲٫۵
۳	اصل مزدوری وغیرہ ذیلی زراعت	۴۰۹	۱۸٫۹
۴	مزدوری خالص	۵۱۴	۲۳٫۳

زمین | مزارعین کی مرفہ الحالی کا مدار بڑی حد تک زمین، مویشی، آلات زرعی، تخم، کھاد، اور ذرائع آب پاشی پر ہے۔

چنانچہ ہم بھی اسی ترتیب سے یہاں پر غور کریں گے۔

زمین کے متعلق یہاں زمین کی اُن قسموں کا بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو کسانوں نے بہ لحاظ زرخیزی و نوعیت زمین مقرر کر رکھی ہیں :-

۱۔ ہومیل یا پل زمین :- وہ سیاہ رنگ ریتیلے ذرات آمیز زمین جو سب سے زیادہ زرخیز سمجھی جاتی ہے۔ اور جوار، گیہوں، چنے کے لئے خاص طور پر موزوں خیال کی جاتی ہے۔

۲۔ ریگڑ :— وہ سیاہ زمین جو کھتے کی مانند نہایت نرم ہوتی ہے۔ جس میں پانی جذب ہونیکے بعد اوپر کی سطح تو خشک ہو جاتی ہے لیکن تہ میں کیچڑ ٹھہری رہتی ہے۔ گیہوں اور کرڑ کے لئے بہت موزوں متصور ہوتی ہے۔

۳۔ کرل :— سیاہ رنگ چکنی مٹی۔ کپاس کے لئے عموماً اور کوٹیکل کپاس کے لئے خصوصاً موزوں ثابت ہوتی ہے۔

۴۔ ہاڑ :— یہ وہ زمین ہوتی ہے جو کسی گاؤں کی آبادی کے اُٹھ جانیکے بعد زیر کاشت لائی جاتی ہے۔ اس کا رنگ راکھ کی مانند بھورا ہوتا ہے۔ تمباکو، مرچ، بری اور کنگنی کے لئے موزوں پائی گئی ہے۔

زمین کے متعلق یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ موضع کی زمینیں بلحاظ زرخیزی بحالت موجودہ پاس انگیز ہیں بلکہ واقف کاروں کا خیال ہے کہ یہاں کی زمینات مرہٹواری کے کسی علاقہ سے خراب نہیں ہیں۔ شاید "ہن گنٹہ" کی وجہ تسمیہ بھی یہاں کی زمینوں کی زرخیزی ہی ہوئی ہو۔ کیونکہ کنڑی زبان میں "ہن" کے معنی خزانے کے ہوتے ہیں۔

تقسیم و انتشار آراضی

موضع کا مجموعی رقبۂ مزروعہ (۷۴۴۹) ایکر (۲۷) گنٹہ اور (۴۲۸) قطعات مزروعہ بہ اخراج قطعات انعامی پر مشتمل ہے۔ حقیت آراضی کے لحاظ سے مزارعین کی تین قسمیں ہیں :-

۱۔ پٹہ دار جو اپنی زمین پر خود کاشت کرتا ہے اور کاشتکار کہلاتا ہے۔

۲۔ ایسا ہر وارث جو پٹہ دار کی اراضی میں حصہ پاتا ہے شکمی دار کہلاتا ہے۔

۳۔ جو کسان کسی پٹہ دار یا شکمی دار سے بعوض ایک مقررہ رقم کے ایک مدت معینہ کے لئے زمین کاشت پہ لیتا ہے قولدار کہلاتا ہے۔

قولداروں کی بھی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ جو سالانہ معاوضہ بصورتِ نقد ادا کرے۔

۲۔ وہ جو کھیت کی سالانہ پیداوار کا ایک مقررہ حصہ مالکِ زمین کو ادا کرتے ہیں۔ اور باقی کے خود معاوضہ کاشت مالک ہوتے ہیں۔

ف۳۰ لہ میں تعداد پٹہ داران و شکمیداران بالترتیب (۲۴۵) اور (۸۱) تھی تو ف۴۵ لہ میں (۲۴۹) اور (۷۹) ہو گئی گویا (۱۵) سال کی مدت میں پٹہ داروں میں صرف (۴) کا اضافہ ہوا تو شکمیداران میں (۲) کی کمی ہو گئی۔ اس طرح اس دوران میں آراضی کی تقسیم کا عمل بہت کم ہوا۔ لیکن یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حقیقی کاشتکار صرف پٹہ دار و شکمیدار ہی نہیں ہوتے بلکہ قولدار بھی ہوتے ہیں۔ گو قولداروں کو آراضی کی بیع و شرع میں کوئی دخل نہیں ہوتا تاہم ان کی تعداد میں اضافہ سے حقیقی قطعاتِ مزروعہ کا رقبہ کمتر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ف۳۰ میں خود کاشتکار (۱۳۰) شکمیدار (۲۰) اور قولدار (۴۹) تھے تو ف۴۵ میں خود کاشتکار (۱۰۳) شکمیدار (۱۰) اور قولدار (۳۰) ہو گئے۔

قولداروں میں اس اضافہ کا اثر صرف اس رقبۂ آراضی پر ہوا ہے جس میں آراضی انعام شامل نہیں ہے۔ موضع میں انعام داروں کو بہ لحاظ رقبۂ انعامی دو بڑی قسمیں ہیں ایک وہ جن کا رقبۂ انعامی وسیع ہے دوسرے وہ جن کا رقبۂ آراضی مختصر ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے انعام داروں میں پٹیل، پٹواری اور اہل خدمات مذہبی شامل ہیں اور ادنیٰ درجہ میں گاؤں کے خدام اور چوکیدار۔ انعامی زمینوں کا رقبۂ مجموعی (۴۸۶) ایکڑ ۱۱ گنٹہ ہے۔ پٹیل پٹواریوں کی انعامی آراضیاں کافی وسیع ہیں۔ لیکن گاؤں کے خدام کی انعامی زمینیں مختصر ہیں۔ چنانچہ از روئے پہانی پترک ف۴۵ سروے نمبر ۲۳ کا رقبہ (۱۳) ایکڑ (۲۳) گنٹہ ہے جس میں (۱۰) سیت سندھی (چوکیدار) شامل ہیں۔

غرض انعامی زمینیں اور بالخصوص موضع کے ادنیٰ خدام کی انعامی آراضی سے قطع نظر جو چھوٹے چھوٹے قطعات پر مشتمل ہیں دیگر مزارعین کی زمینوں پر تقسیم آراضی کا عمل اس قدر شدید نہیں ہے جس قدر کہ دیگر مواضعات میں بالعموم پایا جاتا ہے۔

ہمارے اس بیان کی تائید مندرجۂ ذیل اعداد سے بھی ہوتی ہے۔

رقبہ قطعاتِ مزروعہ (بہ اخراج انعام)

ایک ایکڑ سے کم .. .. (۲۵)

لہ یہ اعداد و شمار دفتر دیہی سے حاصل کئے گئے۔ افسوس کہ ان سے قدیم اعداد و شمار باوجود کوشش کے دستیاب نہ ہو سکے

ایک ایکر ... ... (۵۵)

۱ تا ۵ ایکر ... ... (۲۶)

۵ تا ۱۰ ... ... (۸۴)

۱۰ تا ۱۵ ... ... (۷۰)

۱۵ تا ۲۰ ... ... (۴۶)

۲۰ تا ۲۵ ... ... (۴۰)

۲۵ تا ۳۰ ... ... (۴۰)

۳۰ سے زیادہ ... ... (۳۲)

مویشی موضع کے کاشتکار خاندانوں کی تعداد (۲۸۰) ہے۔ اور جملہ رقبۂ مزروعہ (۷۴۴۹) ایکر (۲۷) گنٹے ہے حسبِ جدولِ ذیل زرعی اغراض کے جانوروں کی موجودہ تعداد (۵۹۵) ہے۔ اس طور پر فی خاندان (۲) مویشی کا اوسط ہوتا ہے اور فی بیل یا بھینسا (۱۵٫۸) ایکر اراضی کا اوسط پڑتا ہے۔

تعداد مویشیاں

		زرعی		لدو		دودھ دینے والے		بچے		متفرق		
		بیل	جاموش	بیل	جاموش	گائے	بھینس	گائے	بھینس	گھوڑے	مینڈھے	بکریاں
۱	سنہ ۱۳۱۰ف	۶۸۲	۷۲	۰	۰	۲۵۴	۱۶۰	۲۶۷	۱۶۳	۳۱	۱۹۲	۲۹۵
۲	سنہ ۱۳۲۰ف	۶۶۷	۹۶	۰	۰	۱۹۶	۱۴۲	۲۰۱	۱۴۹	۲۴	۱۷۱	۱۷۱
۳	سنہ ۱۳۳۰ف	۴۳۶	۱۶	۶۰	۵۰	۲۰۲	۱۳۰	۶۰	۸۰	۲۰	۵۵۵	۱۲۴
۴	سنہ ۱۳۴۰ف	۵۴۵	۵۰	۱۵	۵۵	۲۳۵	۳۰۵	۱۰۰	۸۰	۱۵	۲۴۰	۲۶۰

مویشیوں کی پرورش اور چارہ کی فراہمی گاؤں کے مویشی بالعموم معمولی طور پر تنو مند ہوتے ہیں۔ بعض خوشحال

کسانوں کے یہاں دیونی نسل کے بیل بھی ہیں۔ مویشیوں کی پرورش کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ دودھ دینے والے جانوروں کو جب تک وہ دودھ دیتے رہیں بالعموم دن میں دو مرتبہ آدھ آدھ سیر ہولہ دیا جاتا ہے اور بعض خوشحال خاندانوں میں کھلی دی جاتی ہے۔ کھیت پر کام کرنے والے جانوروں کو تخم ریزی کے زمانہ میں دن میں دو مرتبہ دو دو سیر کھلی دیجاتی ہے۔ جوں ہی کھیتوں میں سبز چارہ دستیاب ہونے لگتا ہے کھلی کی مقدار میں کمی کر دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جب کافی سبز چارہ ملنے لگتا ہے تو کھلی موقوف کر دی جاتی ہے گویا تخم ریزی کے بعد ایک مہینہ تک مویشیوں کو کھلی ملتی ہے۔ موسم گرما میں بھی جبکہ سبز چارہ دستیاب نہیں ہو سکتا زرعی جانوروں کو کھلی دی جاتی ہے۔

سبز چارے سے مراد گھاس اور جوار وغیرہ کے ایسے پودے ہیں جن میں بالیاں نکلنے کا امکان نہیں ہوتا۔ جنھیں دیہی اصلاح میں "باٹک"[1] کہتے ہیں۔ جب تک فصلیں ایستادہ رہتی ہیں اس قسم کا سبز چارا کھیتوں سے حاصل کر لیا جاتا ہے۔ پورے گاؤں میں ایک مثال بھی ایسے کاشتکار کی نہیں ہے جو مویشیوں کے لئے سبز چارے کی فصلیں اگاتا ہو اور جب سبز چارا کھیتوں سے دستیاب نہیں ہوتا تو مویشیوں کی خوراک میں وہ خشک چارا استعمال ہوتا ہے جسے فصلوں کے کٹ جانے کے بعد محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ محفوظ کرنے کا طریقہ نہایت سہل اور معمولی ہے۔ زمین پر چارے کی تہیں بچھا دی جاتی ہیں۔ اور جب حسب منشا، چارے کا ڈھیر لگ چکتا ہے تو اس ڈھیر کے چاروں طرف سے مٹی کے ڈھیلے کو دلئے جاتے ہیں اور ڈھیلوں سے چارے کا ڈھیر پوشیدہ کر دیا جاتا ہے۔ جانوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس ڈھیر کے اطراف کانٹے لگا دیئے جاتے ہیں اس محفوظ ذخیرۂ چارہ کو دیہی اصطلاح میں "گھنجی"[2] کہا جاتا ہے اس ذخیرہ میں سطح زمین سے ملحقہ اور ان حصوں کا چارہ جن پر مٹی کے ڈھیلے رکھے جاتے ہیں سڑ گل جاتا ہے اس کی مقدار ناقابل لحاظ ہوتی ہے اور اس کو بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے۔

خشک چارے کی مقدار یوں معلوم ہو سکتی ہے کہ سال حال (۱۳۴۵ف) جوار کا رقبۂ زیر کاشت (۸۰۹،) ایکڑ تھا۔ مزارعین کے بیان کے مطابق فی ایکڑ (۵۰۰،) پولے کڑبی کا اوسط رہتا ہے۔ اس حساب سے کڑبی کی مجموعی مقدار (۴۰۴،۵۰۰) پولے رہی۔ جدول بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مویشیوں کی تعداد جنھیں چارا دیا جاتا ہے (۱۴۰۰) ہے۔ اگر چارے کی اس مقدار کو منہا کر دیا جائے جو ذخیرہ اندازی میں سڑ گل جاتا ہے یا قرب وجوار کے بازاری مقامات میں لے جا کر فروخت کر دیا جاتا ہے تو باقی کڑبی کی مقدار تقریباً (۳۰۰،۰۰۰) پولے رہ جاتی ہے۔

[1] اردو میں اس قسم کے پودوں کو "چری" کہتے ہیں۔ مدیر

[2] اردو میں چارہ کے اس ڈھیر کو گری کہتے ہیں۔ مدیر

مویشیوں کو سال میں صرف چھ ماہ خشک چارہ دیا جاتا ہے اس لحاظ سے فی جانور روزانہ کڑبی کا اوسط (۲) پولے ہوتا ہے

غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ موضع میں زرعی مویشی زاید از ضرورت نہیں ہیں۔ اور مویشیوں کے یومیہ چارہ کے اوسط کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موضع میں چارے کی کمی بالعموم نہیں رہتی۔ سبز چارہ کی فصلیں یہاں اس لئے نہیں اُگائی جاتی ہیں کہ زمینیں کسی قدر زرخیز ہیں اور کسان کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتے کہ جس زمین سے انہیں پیداوار مل سکتی ہو اُس کو چارے کی فصلوں میں مصروف رکھیں۔

زرعی مویشیوں کی اس قلت کی توجیہہ یہی ہو سکتی ہے موضع کی زمینیں ایک حد تک زرخیز ہیں۔ مزارعین کو دیگر مواضعات کی طرح بار بار ہل اور ناگر چلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ ناگر کے لئے کم از کم چار بیلوں کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ موضع میں ناگر چلانے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے زرعی مویشیوں کی تعداد بھی لازماً کم ہوتی ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ امراض مویشی میں موضع کے لئے "اندر پسٹ" سب سے زیادہ مضرت رساں ہے۔ چنانچہ سنہ ۵۰ ف میں (۳۶) مویشیوں کی ہلاکت کا سبب یہی اندرپسٹ تھا۔ دیگر امراض متعدی وغیر متعدی سے بھی مویشیوں کی کچھ نہ کچھ تعداد ضائع ہوتی رہتی ہے۔ امراض و اموات مویشی سے متعلق سنین ماضیہ کا حال اس لئے واضح نہیں کیا جاسکتا کہ دیہی دفتر میں رجسٹر اموات و پیدائش مویشی کا انتظام سنہ ۴۹ ف سے ہوا۔ متعدی امراض کے شیوع پر پولس پٹیل کی اطلاع پر مستقر گلبرگہ سے علاج حیوانات کے ڈاکٹر آکر مویشیوں کے ٹیکے لگاتے ہیں۔

آلات زرعی اور کھاد

موضع میں قدیم وضع کے آلات زرعی رائج ہیں۔ جو گاؤں کے بڑھئی اور لوہار تیار کر دیتے ہیں۔ گاؤں کی زمینیں اگرچہ عمدہ قسم کی ہیں جس کی وجہ سے ان معمولی آلات زرعی سے بھی کافی پیداوار حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے مزارعین نے اپنے دقیانوسی آلات زرعی ہی کو موزوں رکھا ہے۔ حالانکہ اصلاح یافتہ آلات زرعی کے استعمال سے کثیر فوائد کے امکانات ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے دو ساہوکاروں نے سال گذشتہ سے آہنی ناگروں کا استعمال شروع بھی کر دیا ہے۔

یہی حالت کھاد کے استعمال کی ہے۔ زمین کی زرخیزی نے جاہل مزارعین کو کھاد کی جانب سے بے پروا کر رکھا ہے۔ چنانچہ گاؤں میں صرف وہی تین چار گھرانے کھاد جمع کرتے اور استعمال کرتے ہیں جن کے باغچے ہیں۔ ورنہ مزارعین بالعموم

کھاد کے استعمال کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر مفید بھی خیال کرتے ہیں۔ مویشیوں کا فضلہ بالعموم ایندھن کے کام آتا ہے۔ اگر مزارعین نے کھاد کے استعمال کی جانب توجہ کی بھی تو فراہمی ایندھن کا سوال اہم ہو جاتا ہے۔ موضع کے قرب و جوار میں نہ کوئی جنگل ہے اور نہ کوئی پہاڑی کہ جہاں سے ایندھن کی لکڑی فراہم کی جا سکے۔ اور غریب مزارعین اس قدر سکت نہیں رکھتے کہ دیگر مقامات سے لکڑی خرید کر فراہم کر سکیں

لہذا مزارعین کی یہ غلط فہمی رفع کر دینی چاہئے کہ کھاد کے استعمال کے بغیر بھی ان کی زمینیں زرخیز رہتی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض استعمال کھاد کے متعلق یہ ہے کہ چونکہ یہاں آب پاشی کے ذرائع مفقود ہیں اس لئے کھاد استعمال کرنے سے ان کی فصلیں بجائے منفعت بخش ہونے کے جل جاتی ہیں۔ اس بارہ میں انھیں ہلکی کھاد کے استعمال کی جانب متوجہ کرنا چاہئے جو ان کی زمینوں کے لئے موزوں ہو۔ انھیں اس بات کا یقین دلانا چاہئے کہ دوسرے مقامات میں جہاں ذرائع آب پاشی انھیں کی طرح مفقود ہیں مزارعین کھاد کے استعمال سے مستفید ہو رہے ہیں۔ جہاں تک ایندھن کا تعلق ہے ان پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ بصورت مجبوری جس قدر فضلہ ان کے ایندھن کی ضروریات سے زائد ہو اسے دیگر قسم کے کوڑے کرکٹ کے ساتھ جو فی الوقت بالکل ضائع جاتا ہے محفوظ رکھیں اور اسے حسب ضرورت بطور کھاد استعمال کریں۔ اس بارہ میں انھیں ہمارے محکمۂ زراعت کے مشورہ اور رہنمائی کی شدید ضرورت ہے جس سے اب تک موضع کے مزارعین بدقسمتی سے محروم ہیں۔

تخم موضع میں جو تخم استعمال ہوتے ہیں انھیں خود موضع میں فراہم کیا جاتا ہے۔ فراہمی تخم کا طریقہ شاید صدیوں سے یہی چلا آ رہا ہے کہ ہر کسان فصل کے موقع پر تخم علحدہ نکال لیتا ہے جسے نیم کے پتوں میں ملا کر تھیلوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ جن غریب کسانوں کے پاس تخم نہیں ہوتے وہ دوسروں سے سوائی پر قرض لیتے ہیں اور فصل کے بعد حاصل کردہ مقدار تخم سے سوایا ادا کرتے ہیں۔ اصلاح یافتہ تخم کا رواج نہیں ہے۔ صرف چند مزارعین ایسے ہیں جنھوں نے گیہوں اور کپاس کے اصلاح یافتہ تخم دو سال قبل خرید کر استعمال کرنا شروع کیا۔

محکمۂ زراعت کی توجہ ابھی تک اس موضع کی جانب مبذول نہیں ہے۔ محکمۂ زراعت کے کسی عہدہ دار نے موضع میں اصلاح زراعت کی نشر و اشاعت نہیں کی بلکہ مزارعین کا بیان ہے کہ جب انھوں نے تخم طلب کئے تو تین کاشتکاروں سے زیادہ کو عہدہ داران زراعت نے مفت تخم دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ابتدا ترغیب و تحریص اور پروپگنڈے کی خاطر

ضروری ہے کہ محکمۂ زراعت مزارعین میں مفت تقسیم تخم کا انتظام کرے۔ مزارعین کا یہ بھی بیان ہے کہ محکمۂ زراعت کے عہدہ دار جن کا مستقر گلبرگہ (موضع سے ۱۶ میل کے فاصلہ پر) ہے صرف انھیں مواضعات میں تقسیم تخم کا وعدہ کیا جو ریلوے لائن یا سڑک سے متصل ہوں۔ اتصال ریلوے یا سڑک کی یہ شرط کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ غرض موضع میں محکمۂ زراعت کی توجہ کے بعد اصلاح یافتہ تخم اور آلات زرعی سے کثیر فوائد کے امکانات ہیں۔

آب پاشی

موضع ہنگنٹہ ان مواضعات میں سے ہے جہاں کاشت کا دارومدار تمام تر بارش پر ہے۔ حالانکہ دریائے کاگنا موضع کے دو سمتوں یعنی جنوب اور مشرق میں بالکل موضع سے متصل بہتی ہے اور دریائے بھیما بھی جنوب کی جانب سنگم بناتی ہے لیکن ان کا وجود اغراض زرعی کے لئے بے فیض ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دریا نشیب میں بہتے ہیں اور آراضی کسی قدر بلندی پر واقع ہے کنویں ہیں جن میں سے سات تو منہدم ہیں تین آب نوشیدنی کے کام آتے ہیں اور صرف (۵) کنوؤں سے آب پاشی کا کام لیا جاتا ہے۔

ذرائع آب پاشی کے اسی فقدان کے باعث موضع میں تری کی کاشت نہیں ہوتی البتہ باغات کے تحت (۱۰) ایکر (۳۹) گنٹہ رقبہ ہے۔ بارش کا سالانہ اوسط تقریباً (۲۵″) رہتا ہے اور اسی پر پیداوار کا انحصار ہے۔

اجناس زرعی

موضع میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ ربیع اور خریف۔ پیداوار کا بڑا حصہ جوار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد تور، السی اور مونگ پھلی کا نمبر آتا ہے۔ ہر جنس کے مزروعہ رقبہ کا اندازہ تختۂ ذیل سے ہو سکتا ہے۔

نمبر شمار	نام جنس	مجموعی رقبہ زیر کاشت در ۴۶ف
۱	جوار	(۴۸۹۸) ایکر (۳) گنٹہ
۲	تور	(۶۸۶) ایکر (۳۴) گنٹہ
۳	السی	(۲۷۴) ایکر
۴	مونگ پھلی	(۲۲۹) ایکر (۲۴) گنٹہ
۵	چنا	(۶۰) ایکر (۱۷) گنٹہ
۶	تِل	(۱۴) ایکر (۲۰) گنٹہ

۷	گیہوں	(۱۳) ایکر	(۲۹) گنٹہ
۸	کپاس	(۱۰) ایکر	(۱۲) گنٹہ
۹	مرچ	(۴) ایکر	(۲۰) گنٹہ
۱۰	رتالو	(۴) ایکر	(۱۰) گنٹہ
۱۱	بینگن	(۳) ایکر	(۸) گنٹہ
۱۲	کیلے	(۲) ایکر	(۲۶) گنٹہ
۱۳	کرڑ	ایک ایکر	(۳۱) گنٹہ
۱۴	نیشکر	ایک ایکر	(۱۲) گنٹہ
۱۵	بھینڈی	ایک ایکر	
۱۶	میتھی		(۳۰) گنٹہ
۱۷	دھنیہ		(۲۰) گنٹہ
۱۸	پیاز		(۹) گنٹہ
۱۹	گاجر		(۱۲) گنٹہ

جدول بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مزروعہ زمینوں کے بڑے حصے پر جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مزارعین کی غذا کا بڑا جزء جوار ہی پر مشتمل رہتا ہے دوسرے زمین کی حالت اور مقدار بارش کا لحاظ کرتے ہوئے مزارعین اسی کو منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ اجناس تجارتی میں السی اور مونگ پھلی کی کاشت ہوتی ہے۔ تور کے تحت یہی خاص رقبہ اس لئے ہے کہ اول تو آبادی کی غذا میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اور دوسرے جن زمینوں پر مسلسل کئی سال سے کاشت ہوتی رہی ہو ان کی تقویت کے لئے مزارعین ایک آدھ سال تور بو دیتے ہیں۔

امراض فصول

فصلوں کی بیماریوں کے متعلق معلوم ہوا کہ ذیل کی بیماریاں نقصان رساں ہوا کرتی ہیں۔

۱۔ جوار کی تخم ریزی کے بعد ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جو زمین کے اندر ہی اندر تخم کو کھا جاتا ہے

یا پودے جب تک کہ بالشت کے ہوں ان کو کتر کر رکھ دیتا ہے۔

۲۔ وہ کیڑا جو جوار کے بھٹوں (بالیوں) کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے یا ڈنٹھل میں لگ کر پودے کو کمزور کر دیتا ہے۔

۳۔ ایک خاص قسم کا سبز رنگ کا کیڑا چنے کو لگتا ہے جو یا چنے کے دانوں کو کھا جاتا ہے یا پودے کو پتوں سمیت چٹ کر جاتا ہے۔

۴۔ ایک خاص قسم کا سفید رقیق مادہ السی کے پودوں پر اس وقت نظر آنے لگتا ہے جبکہ پودوں میں پھول نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو مقامی زبان میں "مجگی روگ" کہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پودوں کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ مزارعین کے بیان کے مطابق اس بیماری کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے یعنی پھول نکلنے کے بعد سے پندرہ بیس روز تک۔ اگر اس مدت میں بیماری کا حملہ نہ ہو تو خدشہ باقی نہیں رہتا۔

۵۔ تور کی فصل کو ایک کیڑا لگ جاتا ہے جس سے اس قدر شدید نقصان ہوتا ہے کہ سوائے اس کے کہ فصل سے کھاد کا کام نکل آئے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ کیڑا اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ پودوں میں پھلیاں لگنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر اس زمانہ میں پندرہ بیس روز تک ابر چھایا رہا تو بیماری کا حملہ یقینی ہوتا ہے۔ اگر پھلیوں میں دانے بھر گئے تو ابر چھا جانے سے نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔

فروخت پیداوار موضع سے قریب ترین آڑھتیا بازار شاہ آباد پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جہاں تک بیل گاڑیوں کا معمولی راستہ ہے۔ مزارعین اپنی فروخت شدنی پیداوار آڑھتیے کے دوکان پر لے جاکر لگا دیتے ہیں۔ دن کے دس گیارہ بجے تک مختلف تھوک فروش کمپنیوں کے ایجنٹ آڑھتیوں کے پاس آتے ہیں۔ آڑھتیے کو روزانہ بمبئی کے بازاری نرخ ذریعہ ٹیلیگرام معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ آڑھتیا ان ایجنٹوں کے رو برو اپنے مزارعین کا مال نیلام کرتا ہے۔ جس ایجنٹ کی قیمت زیادہ ہوتی ہے پیداوار اس کے ہاتھوں فروخت کر دی جاتی ہے بالعموم یہ قیمت بمبئی کے نرخ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ آڑھتیے کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے گاہکوں کی پیداوار زیادہ سے زیادہ نفع پر فروخت ہو جس کے معاوضہ میں قیمت پیداوار کے ہر سیکڑے پر اسے کمیشن ملتا ہے۔

باایں ہمہ فصل کے زمانہ میں چونکہ بازاری قیمتیں ارزاں ہوتی ہیں اس لئے مزارعین کو اپنی پیداوار کی حقیقی قیمت

نہیں ملتی۔ حالت یہ ہے کہ جب کسی کسان کو فصل کے دو تین ماہ بعد اپنی ضرورت کے لئے اناج خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے تو جو قیمت کہ زمانۂ فصل میں اپنی پیداوار کی اسے حاصل ہوئی تھی اس سے تقریباً سوائی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ مزید برآں زمانۂ فصل میں بھی پیداوار کی قیمتیں اس روز کے بازاری نرخ پر منحصر ہوتی ہیں اگر کسی دن قیمتیں بہت ہی گری ہوئی ہوں تو زیادہ سے زیادہ آڑھتیا ایک دن کے لئے مال اپنی دوکان پر محفوظ رکھنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ کسان دوسرے دن جو بھی نرخ ہو اس پر فروخت کرنے کے لئے مجبور رہتا ہے۔

مزارعین کے قرضے

موضع کی آبادی کے (۹۲) فیصد جزو کا رشتۂ زندگی زمین سے منسلک ہے۔ گنتی کی چند دیہی دستکاریاں جاری ہیں۔ زمین گو زرخیز ہے لیکن کسان اس کی قوت پیداواری میں اضافہ کے لئے مطلق ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔ زمین کی قدرتی زرخیزی پر کسان اس درجہ تکیہ کرتے ہیں کہ اکثر مزارعین تخم ریزی سے قبل زمین کو نرم کرنے کی خاطر ناگر کا استعمال تک غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ سوائے چند ایکڑ رقبہ تحت باغات کے موضع کی دیگر آراضی کو کھاد کی صورت تک دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ ذرائع آب پاشی سرے سے مفقود ہیں۔ کسان اپنی پیداوار کے لئے کلیتاً مانسون ہواؤں کے رحم و کرم کا محتاج ہے۔ آلات زرعی اسی طرز کے ہیں جس طرز پر شاید ان کے موجد نے انہیں بنایا ہوگا۔ اصلاح شدہ تخم مستعمل نہیں۔ مزید برآں خود کسان جو اس سارے کارخانہ کا کرتا دھرتا اور روح رواں ہے ان پڑھ ہوتا ہے دنیا تو دنیا خود اپنے حال سے بھی بے خبر ہے۔ اس میں ترقی کا نہ تو احساس ہے نہ ترقی کی صلاحیت ہے اور نہ ترقی کی خواہش۔ اکثر خاندان کثیر العیال ہیں۔ وقتاً فوقتاً قلت باراں کے سبب فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ مویشی ضائع ہوتے رہتے ہیں اور جب کسان کی محدود آمدنی خود اس کی اور اس کے خاندان کی کماحقہ پرورش کی متحمل نہیں ہو سکتی تو ان حادثات ناگہانی اور شادی بیاہ کے مسرفانہ اخراجات کی تکمیل کا واحد ذریعہ ساہوکار کا دروازہ کھٹکھٹانا رہ جاتا ہے۔ بظاہر ہمارا یہ بیان ایک معمہ سا معلوم ہوگا کہ باوجود زرخیز زمینوں کے موضع کی آبادی کے مجموعی قرض کی تعداد (۲۹ ۲ ۹۱) روپیہ ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت تلخ حقیقت۔ مزارعین کے قرضوں کا مفصل خاکہ درج ذیل ہے۔

مقروضیت کی پیشہ وارانہ تقسیم

	پیشہ	جملہ خاندان	مقروض خاندان	مجموعی رقم قرضہ	فیصد مقروض خاندان	اوسط رقم فی مقروض خاندان
۱	زراعتِ خالص	۱۲۶	۸۶	۵۵,۳۳۰	۶۸٫۲۵	۶۴۳٫۳۴
۲	زراعتِ ذیلی	۹۲	۶۶	۱۸,۹۵۹	۷۳٫۲۷	۲۷۵٫۱۴
۳	مزدوری خالص	۱۲۱	۳۲	۳,۸۴۶	۲۶٫۴۵	۱۲۰٫۱۹
۴	مزدوری ذیلی	۵۲	۳۶	۷,۵۴۴	۶۹٫۲۳	۲۱۶٫۷
۵	صنعت و حرفت	۱۳	۴	۱,۹۲۵	۳۰٫۷۷	۴۸۱٫۲۵[۱]
۶	دیہی خدام (قصاب، دھوبی، حجام وغیرہ)	۱۵	۹	۳,۶۲۵	۶۰٫۰	۴۰۲٫۷۸

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ :-

الف :- سب سے زیادہ بارِ قرض زراعت خالص پر ہے۔

ب :- زراعت خالص کے بعد بارِ قرض کے لحاظ سے زراعت ذیلی اور مزدوری ذیلی کا درجہ ہے۔

اور ج :- مزدوری خالص پر قرض کا بار دیگر طبقوں کی بہ نسبت کم ہے۔

ہم اس کا بھی پتہ چلا سکتے ہیں کہ قرض کا بار ان خاندانوں پر زیادہ ہے جن کے قبضہ میں آراضی ہے۔ وجہ بالکل بدیہی ہے کہ ملکیت زمین کے باعث ساہوکار کی نظروں میں کسان کی ساکھ رہتی ہے۔ خالص مزدوری کرنے والے خاندانوں پر قرض کا بار اس لئے کم ہے کہ ان غریبوں کے نصیب میں زمین کا ایک ٹکڑا بھی تو نہیں اور ظاہر ہے کہ گاؤں کا ساہوکار ایسے بے زمین افراد کو قرض دے کر اپنی رقم کو خطرہ میں ڈالنا کیوں گوارا کرنے لگا۔ البتہ زراعت ذیلی اور مزدوری ذیلی پر قرض کا بار کافی ہے کیونکہ ان کے قبضہ میں آراضی ہوتی ہے اور وہ محض اپنی مجموعی آمدنی میں اضافہ کی خاطر مزدوری کرتے ہیں یا اصل پیشہ تو مزدوری ہوتا ہے لیکن مجموعی آمدنی میں اضافہ کی خاطر زراعت کرتے ہیں۔

---

[۱] صنعت و حرفت کا اوسط قرضہ بظاہر اس لئے زیادہ معلوم ہو رہا ہے کہ زرگروں کا ایک ہی خاندان (۱۵۰۰) روپیہ کا مقروض ہے۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ آخر وہ کیا اسباب ہیں کہ موضع کے باشندے بار قرض کے تلے اس قدر دبے ہوئے ہیں حالانکہ موضع کی زمینوں کی زرخیزی کا لحاظ کرتے ہوئے توانھیں خوش حال ہونا چاہیئے تھا۔

مزارعین کی قرضداری کے مقامی اسباب

مزارعین کی قرضداری کے عام اسباب میں جو ہندوستان کے عموماً اور حیدرآباد کے خصوصاً تقریباً ہر دیہات پر صادق آتے ہیں زیادہ سی اور غیر نفع بخش طریق کاشت کھاد اور عمدہ تخم کا عدم استعمال ذرائع آب پاشی کی قلت، فقدان یا بیجا استعمال، کسانوں کی قدامت پرستی، جہالت اور اسراف۔ صنایع تفنیمی کی عدم موجودگی، مزارعین کے اوقات فرصت کا غیر مفید اور استعمال اور مہاجنی لین دین شامل ہیں لیکن موضع زیر تحقیق کے مزارعین کی قرضداری کے خاص اسباب ہیں یہ اسباب گو بہ لحاظ نوعیت دیگر مقامات سے مختلف نہیں لیکن یہاں صرف انھیں اسباب کا ذکر کیا جائے گا جو بڑی حد تک مزارعین موضع کو مقروض بنانے کا باعث ہیں

قرضہ کے ان مقامی اسباب میں پہلا سبب طریقۂ قولداری ہے۔ قولداری سے مراد یہ ہے کہ کسان کسی پٹہ دار یا اسکیدار سے سالانہ معینہ رقم یا مقدار جنس کے عوض مقررہ مدت کے لئے زمین کاشت پر حاصل کرتا ہے۔ ایسے کسان قولدار کہلاتے ہیں۔ اگر کسی سال فصل خراب ہوئی اور مقررہ رقم یا مقدار جنس ادا نہ ہوسکی تو قولدار اس کے خاندان کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا ہے اور اس کے علاوہ وہ مالک زمین کا مقروض بھی ہوجاتا ہے اگر فصل کی یہی حالت ایک آدھ سال اور رہی تو اس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گرداب قرض میں پھنس کر رہ جانا یقینی ہے کیونکہ اس کاشتکار سے جو اپنی آراضی پر بمشکل گذر بسر کرسکتا ہے یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ اس رقم خطیر کی ادائی کی کوئی صورت بہت جلد نکال سکے گا۔

مزارعین کے مستقل طور پر مقروض رہنے کا ایک سبب ان کے جدی قرضے ہیں۔ کیونکہ ہمارا کسان ترکہ میں جائداد سے زیادہ قرضہ پاتا ہے اور اسی کی ادائی میں عمر بھر اپنا خون پسینہ ایک کرتا رہتا ہے۔

لیکن مزارعین کی قرضداری کی بڑی وجہ مقامی ساہوکاروں کا بے قاعدہ اور قابل اعتراض لین دین ہے۔ یہ شکایت عام ہے کہ ساہوکار ادائی قرضہ کے بعد بھی بے بس مزارعین کی نہ دستاویزات واپس کرتے ہیں نہ وصولی اقساط کی رسیدیں دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ساہوکار اور کسی کسان میں تکرار ہوئی اور اس نے ادا شدہ رقم کا دعویٰ کردیا

ساہوکاروں کا طریق قسط بندی بھی کسانوں کو قرضدار بناتا ہے۔ جب کسی کسان کے ذمہ قابل لحاظ رقم واجب الادا ہو جاتی ہے تو ساہوکار رقم کا مطالبہ کرتا ہے اور دعوے کی دھمکی دیتا ہے۔ غریب اور جاہل مزارعین اپنی بےبسی اور غربت کے سبب ساہوکار کے خلاف عدالتی چارہ جوئی اختیار کرتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ عدالتی اخراجات کی برداشت کی ان میں سکت نہیں ہوتی اور دوسرے "دریا میں رہکر مگرمچھ سے بیر" انھیں مناسب نظر نہیں آتا۔ بڑی منتوں اور سماجتوں کے بعد ساہوکار بہ اقساط ادائی کو منظور کرتا ہے لیکن اس صورت میں ادا شدنی رقم کی مقدار دوچند کر دی جاتی ہے۔

ساہوکاروں کی صریحاً بد دیانتی بھی بعض اوقات غریب مزارعین کی مصیبت کا باعث ہوتی ہے۔ بعض مزارعین ایسے ہیں جنھوں نے ساہوکار سے نقد رقم حاصل نہیں کی بلکہ ساہوکار کی دکان سے کپڑا یا غلہ ادھار لیا۔ جب اُس کی قیمت ادا نہ ہو سکی تو ساہوکار نے من مانی قیمت لگا کر معہ سود دستاویز لکھا لی اور اب اس دستاویز پر سود واجب الادا ہو گیا۔

موضع میں مزارعین کے لئے فراہمی قرضہ کی کوئی صورت سوائے ساہوکار کے موجود نہیں ہے۔ اور جو ساہوکار ہیں ان کی بد معاملگی، ظلم و تعدّی اور بد دیانتی کی دردناک داستانیں موضع کے تقریباً ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ دستاویزات کا واپس نہ کرنا اور رسیدوں کا جاری نہ کرنا تو ان کا دستور ہی ہے۔ غریب مزارعین کو ان کے سکونتی مکانات سے بر دستی باہر نکال دینے اور ان کی زمینوں کو جبر یہ رجسٹری کرا لینے سے بھی انھیں دریغ نہیں۔ آبادی کے پندرہ بیس خاندان ایسے ہیں جنھوں نے ساہوکاروں کے ظلم و تعدّی کی تاب نہ لاکر گاؤں کی سکونت ترک کر دی ہے۔ ان درندہ صفت ساہوکاروں کی بربریت کا یہ عالم ہے کہ انھیں اس غریب اور آفت زدہ قرضدار کو زد و کوب کرنے سے بھی عار نہیں ہوتا، جس کے گھر میں مردہ باپ کی لاش پڑی ہو اور جو کفن کا کپڑا لینے بازار آیا ہو!!!

طریق لین دین موضع میں قرضہ کا لین دین کرنے والے ساہوکاروں کی تعداد تین ہے۔ جن میں سے ایک مسلمان ہے ایک لنگایت ایک برہمن۔ لین دین کے دو طریقے ہیں، بصورت نقد و بصورت جنس۔ نقد کی صورت میں معمولی رقوم بلا تحریر دستاویز دی جاتی ہیں اور بڑی رقمیں بہ تحریر دستاویز و رہن آراضی۔ جنس کی صورت میں ادائی قرض کی متوقع مدت چونکہ زیادہ سے زیادہ نو ماہ یا ایک سال ہوتی ہے اس لئے

ابتدا ہیں دستاویز نہیں لکھائی جاتی البتہ جب فصل کے موقع پر بھی جنس ادا نہ ہوسکی تو اس نرخ سے جو قرض لیتے وقت تھی کل جنس واجب الادا کی قیمت کے مساوی دستاویز تحریر کردینی پڑتی ہے۔ شرح سود نقد کی صورت میں (۱۸ تا ۲۵) روپیہ فیصد سالانہ اور جنس کی صورت میں فی من (۴ تا ۸) پائلی سالانہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ شرح سود حقیقی اور واقعی نہیں بلکہ نام نہاد اور ظاہری ہے۔ کیونکہ شرح سود تو اس نام نہاد شرح سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جو غریب مزارعین بے چون وچرا ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

(۱) چنانچہ مسمی سلیمان نے ایک ساہو سے ۱۳۱۱ف میں مبلغ (۶۰) روپئے نقد حاصل کئے سود در سود ہوتے ہوئے ۱۳۳۰ف اور ۱۳۳۳ف میں علی الترتیب چھ چھ سو روپئے کے متعلق دو نمبر رہن بالقبض کردئے۔ گویا (۲۲) سال کی مدت میں (۶۰) کی رقم المضاعف ہوکر (۱۲۰۰) روپئے ہوگئی اور مسمی مذکور نے جو سود ادا کیا اس کی شرح ۸۵/۱۱ ہو پائی (۴۶ روپئے چھ آنے ۴ پائی) فیصد سالانہ ہوئی۔ مسمی مذکور ہی نے اسی ساہو سے ۱۳۲۷ف یا ۱۳۲۸ف میں دو من جوار (جبکہ جوار کا نرخ بوجہ گرانی شاید ۱۵ روپئے فی من تھا) حاصل کی۔ ۱۳۳۰ف میں اس جوار کی قیمت کے عوض مسمی مذکور نے ساہو کو (۲۴۴) روپیہ کی دستاویز لکھدی۔ گویا پندرہ سال کی مدت میں (۳۰) روپیہ کی بجائے (۲۴۴) روپیہ ادا کرکے اور سالانہ (۸۱۱/۱۶) فیصد شرح سے سود ادا کیا۔ مسمی مذکور نے ۱۳۳۰ف تا ۱۳۴۴ف سالانہ مبلغ (۱۶۲/۱۱) روپیہ مذکورہ بالا رقم کے سود میں ادا کیا۔ یعنی (۲۲۶۸) روپیہ ادا کئے باوجود اس کے ۱۳۴۵ف میں ساہوکار نے مزید (۲۰۲) کا دعوی کردیا۔ عدالت نے آپس کے سمجھوتے پر سالانہ (۱۰۰) روپیہ کی قسط مقرر کردی۔ غرض اس شخص نے ۱۳۱۱ف میں ۶۰ اور ۱۳۳۰ف میں ۳۰ روپیہ حاصل کرکے (۴۲۶۸) روپیہ کا قرض اپنے سر لیا

مندرجہ بالا واقعہ تو ایک کسان کا ہے لیکن خود موضع کا پٹواری بھی ساہوکاروں کے پنجہ حرص وآز سے محفوظ نہ رہ سکا۔ دکھل راؤ پٹواری کا بیان ہے کہ ۱۳۲۸ف میں اس نے ایک ساہو سے ایک ہزار روپئے قرض لئے کئی سال تک سود اور اصل کی ادائی نہ ہوسکی ۱۳۴۰ف میں اس کے ذمہ (۶۵۰۰) کی رقم واجب الادا ہوگئی۔ پٹواری نے اس قرض کے عوض اپنی (۸۰) ایکر زمین ساہوکار کے حوالے کردی اور اب اس کے پاس صرف (۱۴) ایکر ناقص زمین رہ گئی ہے جس کی پیداوار سے مالگذاری بھی بمشکل ادا ہورہی ہے۔ گویا پٹواری نے (۱۰۰۰) روپیہ کے عوض (۵۵۰۰) روپئے سود میں ادا کئے۔ جس کی شرح ۴۵ فیصد سالانہ ہوئی۔

یہ تو خیر اسامیوں کا حال ہے جنہوں نے قرض بصورتِ نقد حاصل کیا تھا۔ بعض مزارعین ایسے ہیں جن کا قرض محض زمینوں کے قول پر لینے کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر بھو دیا سا مینا کولی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جس نے دس سال قبل (شاید ۱۳۳۵ف میں) ایک ساہوکار کا باغیچہ (۴۰۰) روپیہ سالانہ قول پر لیا۔ اس سال صرف (۲۰۰) ادا ہو سکے۔ دو سال بعد ایک کھیت اسی ساہو کا بہ حساب سالانہ (۵۰۰) قول پر لیا۔ جس میں ساہو بھی بطور حصہ دار شریک تھا۔ اب کی مرتبہ اس کے ذمہ (۲۵۰) روپئے واجب الادا رہے۔ قرض کے خوف سے گاؤں سے فرار ہو گیا۔ ایک سال بعد یعنی ۱۳۳۹ف میں واپس آیا۔ اور ایک سو روپئے ساہوکار سے پھر قرض لئے کہ گاؤں میں رہ کر اپنا کاروبار کرے۔ جملہ رقم ملا کر ساہوکار نے مبلغ (۸۰۰) روپئے کی دستاویز لکھالی اور ادائی قرض کے لئے سالانہ (۵۰) روپیہ اور بعد میں (۲۵) کی اقساط مقرر کیں چنانچہ اب تک مسمی مذکور اقساط ادا کر رہا ہے اب اس کے ذمے (۶۷۵) رہ گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ ۱۳۳۹ف کی نقد حاصل کردہ رقم سے قطع نظر محض قول کے باعث (۷۰۰) روپیہ کا قرض مسمی مذکور کے ذمہ ہو گیا۔

بعض کاشتکاروں نے کسی ساہوکار کی دوکان سے کپڑا ادھار لیا۔ اور جب کچھ مدت تک قرض کی رقم ادا نہ ہو سکی تو ساہوکار نے ان سے دستاویز لکھالی۔ چنانچہ مسمی تپنا کال کا واقعہ ہے کہ اس نے تقریباً دس سال قبل ایک ساہو سے تقریباً ۲۵ روپیہ کا کپڑا ادھار لیا۔ چار سال کے بعد ساہو نے اس کپڑے کی بابت (۱۵۰) کا دعویٰ کر دیا۔ جس کے بعد سالانہ ۵۰ کے اقساط سے تین سال میں رقم ادا ہوئی۔ مسمی مذکور کا بیان ہے کہ ڈگری سے قبل ایک سال کی مدت میں اس نے ۵۰ کے عوض (۲۱۰) روپے ساہوکار کو ادا کئے شرح سود سالانہ (۲۶ء۵) رہی۔

مسمی پدمنا پجاری دھنگر نے آج سے سترہ اٹھارہ برس قبل جبکہ خشک سالی کے سبب جوار کا نرخ ڈھائی سیر فی روپیہ تھا۔ ایک من جوار قیمتی لعہ روپیہ ایک ساہو سے خریدی۔ یہ گرانی صرف ایک سال رہی۔ مگر پدمنا رقم مذکور کی ادائی نہ کر سکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا وہی ۲ ایکر کا کھیت جو اس کی زندگی کا سہارا تھا ساہوکار کے قبضہ میں ہے اور رقم ہنوز واجب الادا ہے۔

بعض اوقات مقامی ساہوکاروں نے صریحاً بے ایمانی سے کام لے کر بے بس کسانوں کی زندگیاں تلخ کر دی ہیں۔ چنانچہ ۱۳۲۵ف میں مسمی اسماعیل شاہ اور اس کے چچا زاد بھائی کے مابین قبضۂ آراضی سے متعلق نزاع سے فائدہ اٹھا کر ایک ساہو نے اسے ترغیب دی کہ اگر تم نے مابہ النزاع آراضی برائے نام میرے قبضہ میں دیدی تو تمہارے فریق مخالف کو آراضی پر

قبضہ کرنے کی جرأت نہ ہوگی مبلغ (۸۰۰) روپیہ کی دستاویز لکھا لی۔ وعدہ کیا گیا کہ بعد فیصلہ عدالت دستاویز مسمی مذکور کے حوالہ کر دی جائے گی۔ اور رقم ذخیرہ نہ لی جائے گی۔ جب دوسرے سال عدالت سے مسمی اسمٰعیل شاہ کے موافق فیصلہ ہوا تو ساہو نے بددیانتی سے دستاویز کی رقم طلب کی۔ اور دعوے کی دھمکی دی۔ مجبور ہو کر مسمی مذکور نے (۶۰۰) روپیہ ادا کر منظور کیا۔ چھ سات مہینے بعد ۱۳۴۱ف میں لشمول رقم سود مبلغ (۸۰۰) روپیہ کی رجسٹری کرا دی۔

اکثر صورتوں میں ساہوکار قرض داروں کی ادا کردہ رقوم کی نہ رسید دیتے ہیں اور نہ دستاویز واپس کرتے ہیں۔ غریب کسان بے زبان جانور کی طرح ساہو کے تعمیل حکم پر مجبور رہیں۔ چنانچہ مسمی مارنٹہ پاکولی نے ایک ساہو کو (مابقی) کی رقم ادا کی۔ ساہو نے دستاویز واپس کرنے کا وعدہ کیا کئی روز تک بلطائف الحیل ٹالتا رہا۔ اور اسی دوران میں ایک مقدمۂ قتل کے سلسلہ میں ساہو فرار ہو گیا۔ واپسی کے بعد ساہو نے دوبارہ رقم طلب کی۔ لیکن مسمی مذکور نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ دستاویز اب تک ساہو کے قبضہ میں ہے اور قرض کا مطالبہ برابر جاری ہے۔

ساہوکاروں کے ظلم و زیادتی کا یہ حال ہے کہ بھیا بھیڑ نے پچیس یا تیس برس پہلے ایک ساہو کی دوکان سے سات عدد چولیاں خریدی تھیں۔ غریب نے ان کی قیمت ادا نہیں کی اور آج انہیں سات عدد چولیوں کی قیمت کے عوض (۷۰۰) روپیہ کا قرضہ ہے۔ حالانکہ غریب انھیں سات سو روپیوں کی زرتار چولیاں اپنی بیوی کو پہنا سکتا تھا۔

ان قرضوں کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ مجموعی رقم کا کس قدر جز و پیداواری اغراض کے لئے لیا گیا اور کس قدر غیر پیداواری اغراض کے لئے۔ لیکن بلاخوف تردید اس قدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان قرضوں کی کثرت غیر پیداآور ہے اور غیر پیدا آور قرضوں کی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ ایک بار وجود میں آ چکتے ہیں تو بجائے جلد ختم ہونے کے عروج پانے لگتے ہیں۔

مندرجہ بالا واقعات کے اظہار کے بعد شاید یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس ہیبت ناک بار قرض کے سبب مزارعین کی زندگی مرقع حسرت و یاس بنکر رہ گئی ہے۔ کیونکہ کسان جب دیکھتا ہے کہ ہر بار جہاں اس کی فصل تیار ہوئی دوسرے اس پر قبضہ کر لیتے ہیں تو فطرتاً اس کی ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں اور زندگی کو وہ ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اس کا دماغ کمزور ہو جاتا ہے اور مستقبل کو بہتر بنانے کی کوئی تدبیر پھر اُسے نہیں سوجھتی اسی یلائے بے درماں نے اس کے نظریہ حیات کو الم پسند اور قنوطی بنا دیا ہے۔

مزارعین پر ساہوکار کے دانت اس لئے تیز ہوتے ہیں کہ وہ مفلس ہیں اور وہ مفلس اس لئے ہیں کہ وہ قرضدار ہیں۔ اس قابل اعتراض کاروبار سے مزارعین کس قدر تباہ ہوئے اور ساہوکاروں نے کس قدر استحصال ناجائز کیا اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ موضع کے بڑے بڑے ساہو تین ہیں۔ ساہو نمبر ۱ کے قبضہ میں سنہ ۱۳۳۰ف میں (۲۷۱) ایکڑ ۴ گنٹہ آراضی تھی اور سنہ ۱۳۴۵ف میں (۴۹۶) ایکڑ (۴) گنٹہ۔ ساہوکار نمبر ۲ کے قبضہ میں اس سال ۲۶۶ ایکڑ (۲) گنٹہ زمین تھی اور سنہ ۱۳۴۵ف میں (۴۱۳) ایکڑ (۲۴) گنٹہ ساہوکار نمبر ۳ کے پاس سنہ ۱۳۳۰ف میں ۳۶۵ ایکڑ آراضی تھی۔ تو سنہ ۱۳۴۵ف میں (۴۹۲) ایکڑ (۹) گنٹہ کا مالک ہے۔ گویا پندرہ سال کی مدت میں مزارعین کی (۵۴۰) ایکڑ آراضی ان کے قبضہ سے نکل کر ساہوکاروں کی ملکیت ہوگئی۔ اس ٹھوس اور مادی شہادت کے مقابلہ میں شاید ہم پر یک طرفہ فیصلہ کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ مانا کہ ساہوکاروں سے مزارعین کی اکثر ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور اس میں بھی کلام نہیں کہ مزارعین کے حق میں مہاجنوں اور ساہوکاروں کا وجود یکسر ہلاہل نہیں تاہم اس میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ ساہوکار اپنی خدمات کا معاوضہ واجبی سے کہیں زیادہ پاتے بلکہ جبراً وصول کرتے ہیں۔

اصلاحی تدابیر

اصلاحی تدابیر کے تجویز کرنے یا ان پر عمل کرنے سے قبل اس کا یقین کر لیا جانا چاہیئے کہ ان تدابیر کی حیثیت محض نظری نہ ہو بلکہ عملی طور پر وہ مزارعین کی فلاح و بہبود کا وسیلہ ہوں:-

اصلاحی تدابیر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) بلا واسطہ (۲) بالواسطہ۔ بلا واسطہ اصلاحی تدابیر سے ہماری مراد ایسی تدابیر ہیں جن کے ذریعہ کسانوں کو فی الفور نقصانات سے بچایا جا سکے اور بالواسطہ تدابیر وہ ہیں جن سے مزارعین کی مرفہ الحالی بتدریج مگر مستقل طور پر متاثر ہوتی ہو۔

بالواسطہ تدابیر مزارعین کا طریقۂ کاشتکاری اور آلات زرعی دقیانوسی ہیں۔ انہیں اپنی زمینوں کی زرخیزی بڑھانے کی فکر نہیں۔ عمدہ تخم کے استعمال کا حوصلہ نہیں۔ ان کے مکانات گندہ اور تاریک ہیں۔ انکی صحتیں کمسنی کی شادیوں کی بدولت تباہ و خستہ ہیں۔ زراعت سے انہیں معقول آمدنی نہیں ہوتی لیکن آبادی کی اکثریت اسی میں مصروف ہے اور دیگر گھریلو یا دستی صنعتوں کی جانب مائل نہیں۔ ساہوکاروں کے ظلم و ستم کے وہ شاکی ہیں مگر اسی سے طالب پناہ

اور خواہاں امداد ہوتے ہیں۔ اس سے نجات پانے کے بجائے اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتے جا رہے ہیں۔ ان سب خرابیوں کی اصل وجہ ان کی جہالت ہے۔ وہ کاشتکار ہوتے ہوئے بھی کاشتکاری کے اصل مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ زراعت کے معنی ان کے نزدیک وہی ہیں جو صدیوں پیشتر ان کے اباو اجداد کے ذہنوں میں تھے۔ تبدیل شدہ حالات اور جدید ضروریات سے وہ بیگانہ ہیں۔ شفیق و مہربان حکومت نے جو آسانیاں انھیں بہم پہنچائی ہیں نہ ان سے پورے طور پر آگاہ ہیں نہ ان سے استفادہ کرنا جانتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے مزارعین کو دوسری سہولتوں کے علاوہ سب سے بڑی سہولت تعلیم ہے۔ وہاں کے مزارعین اس قدر پڑھے لکھے ہوتے ہیں کہ حکومت کی جاری کی ہوئی اصلاحات و طریق ہائے کاشت کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جن کی اصلاح مقصود ہو اگر انہیں مہیا کردہ سہولتوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو فلاح و بہبود کی ساری کوششوں کا بے نتیجہ رہ جانا یقینی ہے۔

دور جدید میں جن ملکوں نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے حیرت انگیز ترقی کی ہے ان میں سے ہر ایک نے اپنے مرض کا علاج تعلیم کے نسخہ ہی سے شروع کیا جاپان اور ترکی کے علاوہ روس کی ترقی کی ابتدا بھی تعلیم ہی سے ہوئی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک محب وطن کا قول ہے کہ "ہمیں معلوم ہے کہ ہماری آبادی کی اکثریت تہی دست رہے گی لیکن ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ وہ تہیدستی کے ساتھ جہالت کے بھی شکار نہ رہیں۔" موضع میں خواندہ افراد کی تعداد ناقابل لحاظ ہے۔ ایسے موضع کے مدرسۂ تحتانیہ میں جہاں کی آبادی دو ہزار ہو ایک سو بیس لڑکوں کا زیر تعلیم ہونا موضع کی تعلیمی پستی کا آئینہ دار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مدرسہ میں طالب علموں کی تعداد میں اضافہ کے علاوہ تعلیم بالغان کے لئے مدارس شبینہ قائم کئے جائیں۔ غلام احمد صاحب مددگار تحتانیہ کی کوششیں لائق ستایش ہیں کہ آپ نے ذاتی دلچسپی اور ہمدردی سے کام لے کر حال ہی میں ایک دارالمطالعہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ جہاں روزناموں کے علاوہ ماہوار رسایل کا بھی انتظام ہے۔ محکمۂ تعلیمات کی جانب سے مدارس شبینہ کا قیام بے حد ضروری ہے۔ تعلیم نسواں کی خاطر ایک معلمہ موجود ہے لیکن ضرورت ہے کہ پروپگنڈے سے کام لے کر گاؤں کی لڑکیوں میں تعلیم کا شوق پیدا کیا جائے اور ساتھ ہی ان پڑھ عورتوں کو کفایت شعاری صفائی اور اصول حفظان صحت سے واقف کرایا جائے۔

بلاواسطہ تدابیر

لیکن ظاہر ہے کہ ان تدابیر سے کما حقہٗ مستفیض ہونے کے لئے ایک عرصہ لگے گا۔ نیز کسانوں کو حصول تعلیم و پابندیٔ حفظان صحت پر مائل کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ ان کی مادی حالت

کی اصلاح کی تدابیر فی الفور اختیار کی جائیں۔ ان کی سقیم حالت نے انھیں قسمت پرست بنا دیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر اس درجہ الم پسند ہو گیا ہے کہ وہ اپنی زبوں حالی کو اپنی قسمت کا نتیجہ سمجھنے لگ گئے ہیں اور اس لئے اس تباہ حالی سے نجات پانے کی کوئی تدبیر ان کو کارگر معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ان کی مادی حالت کے ارتفاع کی موثر تدابیر اختیار کی جائیں تو یقین ہے کہ انھیں تقدیر سے زیادہ تدبیر پر اعتقاد ہو جائے گا۔

مزارعین کی اصلاح کی کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کو قرض کے موجودہ بار گراں سے نجات نہ دلائی جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ موضع کی اکثریت ساہوکاروں کے آہنی گرفت میں ہے اور اسی آہنی گرفت نے زرعی ترقی کو پابہ زنجیر کر رکھا ہے۔ پروفیسر گنگولی کا بیان ہے کہ "گراں شرح سود ہی ہماری دیہی آبادی کی روزافزوں افلاس کا سبب ہے۔ میرا ایقان ہے کہ جب تک اس خطرہ کو کھلے بندوں رہنے دیا گیا اس سے ہماری زرعی معیشت کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی رہیں گی"۔ ان خطرات کے سدباب کے لئے حسب ذیل تجاویز مفید نظر آتی ہیں۔

۱۔ سودی لین دین کے کاروبار کے لئے ساہوکاروں کو لائسنس کا پابند بنایا جائے۔

۲۔ قانوناً شرح سود مقرر کی جائے۔

۳۔ ساہوکاروں کو مجبور کیا جائے کہ لین دین کے باقاعدہ حسابات رکھیں۔ اصل اور سود کی ادا شدہ رقوم کی رسید جاری کریں۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ منجانب سرکار مطبوعہ حسابات کے رجسٹر اور رسید قیمتاً ساہوکاروں کو فراہم کئے جائیں۔ محکمہ پولس و مال کے عہدہ دار بحین دورہ وقتاً فوقتاً ان رجسٹرات کی تنقیح کرتے رہیں۔ اگر ان ساہوکاروں کے حسابات کی جانچ پڑتال کے لئے ہر تعلقہ میں ایک آڈیٹر بطور خاص مقرر کیا جائے تو زیادہ مفید نتائج کے برآمد ہونے کا قرینہ ہے۔ ان آڈیٹروں کی تنخواہیں اس آمدنی سے ادا کی جائیں جو ساہوکاروں کے اجرائی لائسنس سے حاصل ہوگی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اوسطاً ہر تعلقہ میں دو سو یا پونے دو سو مواضعات ہوتے ہیں۔ ساہوکاروں کی اقل ترین تعداد فی موضع ایک بھی فرض کی جائے تو پورے تعلقہ میں (۱۵۰) ساہوکار رہوں گے۔ اگر لائسنس کی اجرت سالانہ بیس روپیہ بھی رکھی گئی تو (۳۰۰۰) روپے کی آمدنی ہوگی اور اس رقم سے آڈیٹر کی تنخواہ کا نکلجانا کوئی مشکل کام نہیں۔

۴۔ موجودہ رقوم قرض کے متعلق بطور سرکاری مفصل تحقیق کرائی جائے۔ اگر ساہوکاروں نے اصل کے سود میں کافی رقم حاصل کر لی ہے تو ساہوکاروں کو ایسے قرضوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا جائے اور جن مزارعین کے ذمہ

اتنا قرضہ ہو کہ ان سے دست برداری ساہوکاروں کے مالی نقصان کا موجب ہو بشرطیکہ ان سے ساہوکار نے سود میں اصل کے بقدر مساوی یا اس سے زاید رقم وصول نہ کی ہو تو حکومت کی جانب تحقیق کے بعد اصل رقم کو چند کر کے مناسب اقساط مقرر کر دی جائیں۔ حکومت کو اس کا لحاظ نہ کرنا چاہئے کہ ساہوکار کا دعویٰ کس قدر رقم کا ہے بلکہ اس امر پر نگاہ ہونی چاہئے کہ ساہو نے فی الحقیقت کس قدر اصل قرض دیا ہے۔

۵۔ قرض سے نجات کے لئے انجمنہائے امداد باہمی کا توسط بے انتہا مفید ثابت ہوگا۔ مگر ان انجمنوں کو حقیقی طور پر منفعت بخش بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے انتظام کی اصلاح کی جائے۔ بعض مقامات پر انجمنوں کے ہوتے ہوئے بھی مزارعین ساہوکاروں کے مرہون منت رہنے پر مجبور رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ساہوکار آدھی رات کو بھی مزارعین کو قرض دینے پر آمادہ رہتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ناگہانی اور معمولی ضرورتوں کی پابجائی کے لئے ان انجمنوں میں قلیل المدت قرضوں کی سہولت مہیا کی جائے۔ یہ شکایت عام ہے کہ انجمن امداد باہمی سے قرض حاصل کرنے میں ایک تو کافی مدت درکار ہوتی ہے اور جو رقم ملتی بھی ہے اس کا ایک قابل لحاظ جز دوپیر کاری میں صرف ہو جاتا ہے۔ بعض فرض ناشناس ملازمین انجمن ہائے امداد باہمی کی دیانت پر نگرانی رکھی جائے۔ آج سے سترہ برس قبل موضع میں انجمن امداد باہمی کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن اب یہ بند ہے۔ انجمن کی ناکامی کا سبب یہ ہوا کہ ابتدا میں وصولیابی رقم کی جانب غفلت کی گئی اور جب کئی سال ہو گئے تو وصولی رقم میں سختی کی جانے لگی۔ چنانچہ اب ہر سال انجمن کا عامل یہاں آتا اور مقروض مزارعین کی زمینیں نیلام کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مزارعین کو پروپگنڈے و تعلیم کے ذریعہ امداد باہمی کے اصولوں سے واقف کرایا جائے اور ان کی بدگمانیوں کو رفع کیا جائے۔

۶۔ ان محکموں کو موضع کے لئے عملی طور پر مفید بنایا جائے جن کا تعلق دیہی فلاح و بہبود سے ہے۔ خصوصاً محکمہ ہائے زراعت اور امداد باہمی کی جانب سے باقاعدہ پروپگنڈے و تبلیغ کی ضرورت ہے۔ مزارعین کو اس بات کا یقین دلانا چاہئے کہ ہر زرعی مشکل میں محکمہ کی خدمات ان کے لئے وقف ہیں۔ اصلاح شدہ آلات زرعی اور تخم کا استعمال عام کرنے کی کوشش کی جائے۔ انتخاب کھاد و طریق استعمال میں مزارعین کی رہنمائی کی جائے۔ ذرائع آب پاشی کے فقدان کی تلافی ڈرائی فارمنگ کے عام کرنے سے کی جاسکتی ہے۔

۷۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ایسے موضع میں جہاں کی مالگزاری سالانہ بیس ہزار ایک سو پینتالیس (۲۰۱۴۵) روپیہ ہو، طبی امداد کا کوئی انتظام نہیں۔ بعض خوشحال مزارعین (بلکہ ساہوکاروں) کے علاوہ جو شاہ آباد سے طبی امداد طلب کرتے ہیں دیگر مزارعین کیلئے کسی قسم کے علاج معالجہ کی سہولت حاصل نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موضع میں حتی الامکان عجلت سے کم از کم ایک حکیم یونانی کا تقرر عمل میں آئے۔

۸۔ زائد از ضرورت افراد کو زراعت سے نکال کر گھریلو دستکاریوں میں لگایا جائے جس سے مزارعین کے اوقات فرصت بھی پیدا ور بن سکتے ہیں۔ دستی پارچہ بافی کی صنعت کی موضع میں اس لئے زیادہ گنجائش نہیں ہے کہ اوّل تو یہاں پارچہ باف خاندانوں کی تعداد کم ہے، دوم یہ کہ یہاں کی کپاس کی پیداوار بھی قلیل ہے۔ سوم یہ کہ دستی پارچہ کی قسمیں مشین کے بنائے ہوئے پارچہ کے مقابل گراں ہوں گی اور کسان بجائے دستی پارچہ کے بوجہ ارزانی و نفاست مشین ساختہ پارچہ خریدنے ہی کو مفید سمجھیں گے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ خانگی ضروریات کے لئے عورتوں کے اوقات فرصت میں دستی پارچہ کی تیاری کی ترغیب دی جائے۔ گھر کے مرد بھی اپنے فرصت کے اوقات میں تاگا کاتنے اور بُننے میں مصروف رہ سکتے ہیں اگر اس صورت سے ان کی پوشش ضروریات بھی پوری ہو جائیں تو ان کے حق میں نہایت سود مند ہوگا۔

مقامی حالات کے اعتبار سے مرغیوں اور بطخوں کی پرورش سے مزارعین کی ایک معقول تعداد کی آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ کی توقع ہے۔ شاہ آباد اور واڑی جنکشن سے قربت کی وجہ سے مرغیوں اور انڈوں کی فروخت کی سہولت موجود ہے کیونکہ ان اسٹیشنوں سے روزانہ مرغیاں اور انڈے کثیر تعداد میں بمبئی بھیجے جاتے ہیں۔

چند مزارعین کے لئے بکریوں کی پرورش بھی مفید ہو سکتی ہے۔ مزید براں باشندگان موضع کی ضروریات تمباکو نوشی کے پورا کرنے کے لئے بیڑیاں بنانے کی صنعت بھی کئی خاندانوں کی مجموعی آمدنی میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہے۔

بہر حال باشندگان موضع کی اس حد سے بڑھی ہوئی فلاکت کے دور کرنے کی خاطر کسانوں میں وسعت نظر، خود اعتمادی اور خود اعانتی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ان کی آمدنیوں میں اضافہ کی خاطر ان کی زراعت کو زیادہ منفعت بخش، ان کے اوقات فرصت کو پیداآور بنایا جائے۔ خصوصاً ساہوکاری لین دین کی لعنتوں سے انھیں نجات دلائی جائے۔ اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ ان امور کے جانب موثر اور عملی توجہ کی گئی تو باشندگان موضع کی خوش حالی کے وسیع قراین موجود ہیں۔ فقط

شیخ محبوب علی متعلم بی اے

بیداری

خزاں کا دور ہوا ختم پھر بہار آئی
عروسِ گل نے اٹھائی نقاب چہرے سے
نئے سرے سے ہوئے تازہ داغ لالہ کے
صبا نے چوم لیا منہ حسین کلیوں کا
نسیمِ صبح نے جھولے جھلائے شاخوں کو
چمن میں چڑیوں نے گائے نئے نئے گانے
ہر ایک چیز میں پیدا اک انقلاب ہوا
مری حیات نے بھی ایک تازہ کروٹ لی
مرے خیال نے بھی اک نیا ورق الٹا

قدیم نظریے بیکار سے نظر آئے
پُرانے شوقوں میں دلچسپیاں ذرا نہ رہیں
نئے خیال نئے ولولے نئے ارماں
غرض بدل گئے میرے تمام احساسات
مری نگاہ نے رمزِ حیات ڈھونڈھ لیا
سمجھ میں آگئے اسرارِ زندگی مجھکو
کُھلا کہ ذرّہ بے مایہ بھی نہیں ناچیز
ہر ایک چیز کے دل میں ہے آرزوئے کمال
ہر ایک شے کو ازل سے ہی جستجوئے کمال
نہ صرف سینۂ گل ہی میں ہے بہارِ کمال
ضمیرِ خار میں بھی ہے نہاں شرارِ کمال
جو بن پڑے تو یہ کانٹے گلاب بن جائیں
گلاب بن کے گل آفتاب بن جائیں
کُھلا یہ راز تو سب کچھ بُھلا دیا میں نے
ہر ایک نقشِ تمنا مٹا دیا میں نے
مگر وہ داغِ محبت کہ ہے جو حاصلِ زیست
تلاشِ منزلِ تکمیل میں اُٹھوں گا جب

وہی چراغ ہدایت بنے گا میرے لئے
اُسی کے نور میں یہ راہ طے کروں گا میں
مرے حبیب! تجھے ساتھ لے چلوں گا میں
کہ تو نہ ہو تو ہے بے صرفہ جستجوے کمال
ترے بغیر ہے ناممکن العمل یہ خیال
"بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم"
چلیں تلاش کریں منزل حقیقت کو
بہم عبور کریں بحرِ زندگانی کو
خوشی کے گیت بھی گائیں بہ ہر خوشیِ شباب
بہ سعیِ مقصد فطرت بہائیں آنسو بھی
بناؤں گا میں تجھے اپنا ہمدم و دمساز
رفیقِ رنج و مسرت شریک راز و نیاز
مری حیات کا مقصود بن کے آجا تو
یہ انتظار رہے اب کیوں بلا توقف آ!
جھجک فضول ہے بے پردہ بے تکلف آ!
نگاہ ناز کی باتیں سمجھ رہا ہوں میں
"نہیں" "میں" "ہاں" کے اشاروں کو جانتا ہوں میں

اُٹھا کے کسوتِ فانوس آ بھی جا باہر
یہ قیدِ خلوتِ ناموس تا کجا آخر
حیاتِ عشق کی رسوائیوں کو دیکھ ذرا
پھر اپنے حسن کی معصومیوں کو رسوا کر
کہ حسن و عشق پہنچ جائیں ایک منزل پر
وہی کمال کی منزل ہے جس کا نام "بقا"
جہاں فنا کا گزر ہے نہ رنجِ فرقت کا
جہاں حیات کو موجِ نسیم کہتے ہیں
"جہاں خلش کو سکونِ عظیم کہتے ہیں"
وہی مقام ہے سرچشمہ عشق و الفت کا
وہی ہے نقطۂ آغاز سرحدِ تکمیل
وہاں پہنچ کے پرانے نظام کو چھوڑیں
جہانِ زندگیٔ ناتمام کو چھوڑیں
نئی حیات کا ہو اُس مقام سے آغاز
کریں فضائے محبت میں اب دل پرواز

ختم

خطبۂ افتتاحیہ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر

صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

رائٹ آنریبل نواب مستطاب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے انڈین اکونامک کانفرنس کے اکیسویں اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جو تدبر آفریں خطبہ ارشاد فرمایا تھا ہر چند کہ وہ بعض مقامی اخباروں میں شایع ہو چکا ہے اس کی بے نظیر افادیت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس خطبہ کو "مجلۂ عثمانیہ" میں شایع کرنے کا شرف حاصل کیا جائے تاکہ مستقبل میں ملک و ملت کی باگیں سنبھالنے والے وابستگان "عثمانیہ" کی توجہ ایک مرتبہ اور اس امر کی جانب ملتفت ہو سکے کہ سر اکبر کا دماغ سلطنت کی فلاح و بہبود اور اس کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے کیسی کیسی انوکھی اور بے مثال تدبیریں سوچ رہا ہے۔

مدیر

خواتین و حضرات!

مجھے اجازت دیجئے کہ میں سب سے پہلے اراکین مجلس استقبالیہ اور مجلس کے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں

اظہار تشکر کروں کہ انھوں نے انڈین اکونامک کانفرنس کے اکیسویں اجلاس کا افتتاح کرنے کی مجھے دعوت دی، ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے دار السلطنت میں ملک کے اتنے ممتاز ماہرین معاشیات کو خوش آمدید کہنے کا جو موقع مجھے آج ملا ہے اُس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ میں یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ آپ نے اس سال حیدرآباد کو اپنے اجلاس کا مرکز منتخب کیا۔ درحقیقت میں آپ کے اس انتخاب کو بہت معنی خیز سمجھتا ہوں۔ ماہرین معاشیات کی حیثیت سے آپ قدرتاً اُن تعلقات سے باخبر ہیں جو ہندوستانی ریاستوں کو برطانوی ہند سے منسلک کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آج آپ کی اس جگہ موجودگی سے ریاستوں کے اُس مرتبہ کی اہمیت کا ایک اور ثبوت ——— اگر کسی ثبوت کی ضرورت ہو ——— ملتا ہے جو مادر وطن کے اجتماعی نظام میں اب مسلمہ ہے۔

اُس زمانہ کو گذرے ہوئے تو بہت دن ہو گئے جب ریاستوں کو نامرغوب ملحقات میں سمجھا جاتا تھا۔ اب تو یہ امر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ریاستیں اُس سیاسی تحریک عمل کے روایتی علمبردار ہیں جو ہماری تاریخ کو طویل صدیوں میں اپنے کو نمایاں کرتی رہی ہے۔ یہ تحریکِ عمل اُن تمدنوں کی حیرت انگیز وسعت و اقسام سے پیدا ہوئی جن میں ہندوستان کا جاہ و جلال مضمر ہے۔ ان تمدنوں کی حفاظت ہماری قومی وراثت کا ایسا ہی ایک جزو ہے جیسا کہ ہمارے ملک کا یہ حق کہ وہ اپنے مستقبل کا خود مختار ہو۔ ریاستیں بہت قدیم زمانہ سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے روایتی گہوارے ہیں اور ان گہواروں نے اوضاع زمانہ کے تمام تغیرات میں ملک کی قدیم تہذیب کے تصورات کو محفوظ رکھا ہے۔ ہندوستان کی بیش بہا مقامی تہذیبوں کی یہ کثرت ملک کی ترقی میں سدراہ نہیں ہوسکتی اور برطانوی ہند میں جس صوبہ واری خود مختاری کا چند روز ہوئے افتتاح ہوا اس کے ذریعہ مقامی اختلافات کا وہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے جو ہمارے ملک کے اساسی اتحاد ہی کا دوسرا پہلو ہے۔ دراصل اس عظیم الشان سرزمین ہند کی عافیت اسی پر منحصر ہے کہ اُن دو قوتوں کے درمیان صحیح توازن قائم رہے جن میں سے ایک اتحاد و اتفاق کی تشکیل کرتی ہے اور دوسری اُس جدوجہد سے تقویت حاصل کرتی ہے جو مقامی خود مختاری کے لئے ہر زمانہ میں جاری رہی ہے اپنے اپنے مخصوص دائرۂ عمل میں ان دونوں قوتوں کا توازن ناگزیر ہے اور تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ جب کبھی ایک قوت دوسری قوت کے حلقۂ عمل میں دخل انداز ہوئی تو سارے ملک نے نقصان اُٹھایا۔ مجھے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کی اجازت دیجئے کہ اسی بنیادی حقیقت کے احساس نے خانوادۂ آصفیہ کو ہمیشہ اس حکمتِ عملی کے اختیار کرنے پر مائل کیا کہ ایک طرف ہندوستان کے

اجتماعی مفاد کو ترقی دیں اور دوسری طرف ان قدیم انتظامی، تمدنی، سماجی اور معاشی روایات کی دولت کو محفوظ رکھیں جو ممالک محروسہ کے باشندوں کے فطری جوہر کا امتیاز ہیں۔ اسی لئے حیدرآباد میں ہم بعض اعتبارات سے تمام ہندوستان کی حیثیت مجموعی کی ایک چھوٹی سی تصویر دیکھ رہے ہیں۔ اس دکنی تمدن کو جو ہماری امتیازی خصوصیت ہے گزری ہوئی صدیوں میں مختلف نسلوں اور مختلف مذاہب کے باہمی امتزاج نے رفتہ رفتہ تعمیر کیا ہے اور دکنی تمدن کی اس ترکیب ہیئت میں مسلمان ہندو اور بدھ مت والے تمام عناصر نے حصہ لیا ہے۔

خواتین و حضرات! مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنی اس سیاحت میں جو ہمارے لئے باعث مسرت ہے حسن کاری اور فن تعمیر کے اس گہوارہ میں اُن گرانقدر خزانوں کو بچشم خود دیکھنے کے مواقع ملیں گے جو ہندوستانی تمدن کی دولت میں گویا حیدرآباد کا مخصوص حصہ ہیں۔ اور میں آپ کو یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ادبیات و علوم کی دنیا میں بھی وہ دکنی تمدن جس کا میں نے ذکر کیا ہے اپنی مخصوص فتوحات جتلا سکتا ہے اس طرح اعلیحضرت بندگان عالی کی سلطنت کے اندر ہماری زندگی "کثرت میں وحدت" کی مثال رکھتی ہے جو تمام ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

پس جس طرح ہم نے اپنی قومی وراثت میں بیرونی تمدنی اثرات کا خیر مقدم کیا ہے اور انھیں اپنی تہذیب کے عناصر میں داخل کر لیا ہے اسی طرح آج اس موقع پر بھی ہم آپ سے توقع کرتے ہیں کہ آپ اپنے تجربہ کی روشنی اُن مسائل پر ڈالیں گے جو ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہیں۔

کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں مختصراً بعض اُن مباحث کی طرف اشارہ کروں جو آجکل تمام ہمدرد انسانوں کی گہری توجہ کا مرکز ہیں۔ وہ ایک مسئلہ جو شاید سب سے زیادہ اور سب سے پہلے ہم سب کے خیال میں آجاتا ہے بیروزگاری کا مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر بہت لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اور بیروزگاری کے اسباب کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے جانچا گیا ہے۔ مگر فی نفسہٖ اس مسئلہ کی بنیادی حقیقت بہت سادی ہے۔ یعنی یہ کہ اس وقت اُن لوگوں کے لئے جو پیداآور محنت کرنا چاہتے ہیں کافی کام موجود نہیں۔ میری رائے میں یہ مسئلہ در اصل حالات میں از سر نو تطابق پیدا کرنے کا مسئلہ ہے۔ ہمارے ملک میں تقریباً ہر قسم کے قدرتی ذرائع موجود ہیں۔ اگر ان کو زیادہ وسیع پیمانہ پر استعمال کیا جائے تو کم از کم میں تو یقین نہیں کر سکتا کہ ہر شخص کو کام نہیں ملے گا۔ بہر صورت حالات میں از سر نو تطابق پیدا کرنا ضروری ہے۔

ایک طرف تو یہ لازم ہے کہ ہم اپنے نظم معیشت میں اس قدر ترمیم کر دیں کہ سائنس کے طریقوں اور اصولوں کے مطابق ہم اپنے قدرتی ذرائع کو استعمال کر سکیں اور دوسری طرف ہم کو اپنے روائتی طرز تعلیم میں اس طرح تغیر و تبدل کرنا چاہئے کہ ہماری نئی نسل اُن مواقع اور امکانات سے کافی فائدہ اُٹھا سکے جو اس تغیر سے پیدا ہوں گے۔

میری رائے میں بیروزگاری کا اصلی علاج یہی ہے کہ ہم اپنے طرز تعلیم کو مسائل حاضرہ کے مطابق بنا دیں۔ جس قدر جلد ہم یہ تغیر پیدا کر سکیں گے اسی قدر جلد ہم موجودہ بے ترتیبیوں کا خاتمہ کر سکیں گے اور ان تکلیف دہ مشکلات کو بھی رفع کر سکیں گے جن کا سامنا گریجوئٹ اور انڈر گریجوئٹ نوجوانوں کو کرنا پڑتا ہے جو کام کے باوجود کام کی بے سود تلاش میں سرگرداں ہیں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس ریاست میں طریق تعلیم کی از سر نو تنظیم اسی خیال پر مبنی ہے کہ اُس کو اہل ملک کی ضروریات کے مطابق بنایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس حکمت عملی سے ہم دوہرا فائدہ حاصل کریں گے۔ یعنی ایک طرف تو ہم کو یہ امید ہے کہ ہم اس طرح بڑی حد تک تعلیم یافتہ بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرلیں گے اور دوسری طرف ہمارا مقصود یہ بھی ہے کہ ہم ملک کے اقتصادی ذرائع کو وسیع پیمانہ پر ترقی دے سکیں۔ ان فوائد کے یکجا جمع ہونے سے کئی دوسرے فوائد بھی حاصل ہوں گے۔ وہ نئے طریقے اور وسائل جو ہم کو سائنس اور علوم کی ترقی اور ان کے استعمال سے معلوم ہوئے ہیں جب کام میں لائے جائیں گے نتیجتاً ہماری معاشی تنظیم میں زیادہ توازن پیدا ہو جائے گا۔ اس طرح حکومت اور رعایا دونوں قدرتی وسائل اور تربیت یافتہ ذہانت کے ترقی پذیر اتصال سے یکساں مستفید ہوسکیں گے پورے اعتماد کے ساتھ آپ حضرات سے توقع کرتا ہوں کہ آپ کے مباحث ان مسائل میں بہت سے مسائل پر روشنی ڈال سکیں گے۔

ایک اور مسئلہ جو بلاشبہ آپ کے پیش نظر ہوگا مقامی ساہوکاری کا سوال ہے۔ اس مسئلہ کی بعض مشکلات جو اس ریاست کے درپیش ہیں تقریباً وہی ہیں جن کا آپ میں سے اکثر حضرات نے مختلف صوبوں میں مطالعہ کیا ہوگا۔ دوسرے مقامات کی طرح حیدرآباد میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ملک کے لاتعداد چھوٹے اور بڑے ذرائع اصل کے درمیان تعلق اور ارتباط پیدا کیا جائے۔ اس حد تک ہمارا کام بھی بالکل وہی ہے جو بحیثیت مجموعی تمام ملک کا کام ہے۔ گو اب کاروبار میں ہندوستانی سرمایہ کے ضرب المثل شرمیلے پن کا ذکر ہم بہت کم سنتے ہیں۔ تاہم ملک کے لئے ایک ایسے طریق بنک کی ارتقار میں ابھی تک دشواریاں نظر آتی ہیں جنہیں موجودہ سرمایہ کو بہترین طریقہ پر استعمال کرنا ممکن ہو

حیدرآباد میں ہم اس وقت جس خاص نہج پر ان امکانات کی تحقیق کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام ذرائع اصل میں اس طرح تطابق پیدا کر دیا جائے کہ ہم ان کو ریاست کی زراعتی اور صنعتی تعمیر جدید میں زیادہ سے زیادہ موثر بنا سکیں آج کل مسئلہ کے اس پہلو پر ماہرانہ تحقیقات کی جا رہی ہے اور ہم کو امید ہے کہ آپ کے مباحث سے بھی ہم خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ مقامی ساہوکاری سے تجارتی گردش کا مسئلہ بھی وابستہ ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم بار بار پیدا ہونے والی تجارتی مرفہ الحالی اور کساد بازاری کا تجزیہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ہم میں سے اُن لوگوں کے لئے جو نظم و نسق سے تعلق رکھتے ہیں، یہ معاملہ بہت ہی اہم ہے اس لئے کہ یہ مد و جزر جس معاشی بربادی کا باعث ہوتا ہے وہ لازماً حکومت کی تمام ہیئت ترکیبی میں برہمی پیدا کر دیتی ہے یہ صورت حال ایسی ہے کہ بہت سے مغربی ممالک میں بھی جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گا۔ حکومت کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو تجارتی گردش کی رفتار پر ایسے طریقوں سے اثر ڈالے جو عارضی مرفہ الحالی کی اونچائی کو ہموار کرتے رہیں اور کساد بازاری کے ڈھال میں تدریج قائم رکھیں۔

آپ کے پروگرام کا ایک موضوع صوبہ واری مالیات کی بحالی کا مسئلہ ہے۔ یہ معاملہ بھی انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ صوبوں میں حکومت خود اختیاری کی کامیابی کا معیار صرف وہ فائدہ ہے جو حکومت رعایا کو پہنچا سکے اور یہ کامیابی بڑی حد تک لازماً اس امر پر منحصر ہو گی کہ وہ لوگ جو صوبہ واری حکومت کی عنان اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں وہ کہاں تک اُن مالی ذرائع کو سائنٹفک طریقہ پر استعمال کر سکیں گے جن پر انھیں اختیار حاصل ہوا ہے۔ شاید آپ کے لئے وہ طریقۂ کار دلچسپی کا باعث ہو جو بہت محتاط تجربات کے بعد ہم نے حیدرآباد میں اختیار کیا ہے۔ یہاں ہمارا سررشتۂ مالیات ہر سررشتہ کے لئے اس کے سالانہ اوسط اخراجات کی بنیاد پر سہ سالہ تعین بندی کرتا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ یہ طریقۂ کار ایک طرف تو ترقی کی دور رس تجاویز کا معاون ہوتا ہے اور دوسری طرف اُن اخراجات کو روکتا ہے جو سالانہ بجٹ کے تحت، جہاں بچت واپس کرنی پڑتی ہے، کبھی کبھی ختم سال کے قریب سررشتوں پر عائد ہوتے ہیں نیز ہم نے یہ مزید نزاکت پیدا کر دی ہے کہ سہ سالہ تعین بندی کے اختتام پر جو بچت ہوتی ہے اُس کو پس انداز کنندہ سررشتوں اور اُن سررشتہ جات کے مابین تقسیم کر دیا جاتا ہے جو قومی تعمیر کے کاموں میں مصروف ہیں۔ خود ہمارا تجربہ یہ ہے کہ یہ طریقۂ کار انتظامی معاملات میں کفایت شعاری اور بہتر کارکردگی کا معاون ہے۔ ممکن ہے — میں قطعی طور پر ادعا نہیں کر رہا ہوں — کہ

یہ طریقہ کار جو ہمارے لئے اس قدر مفید ثابت ہوا ہے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی مفید ثابت ہو۔ لیکن اس کا تو مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے تجربے جن سے ہم کو حیدرآباد میں مالیات کی سررشتہ داری سبیل بندی کا خیال پیدا ہوا اگر تمام ملک میں کئے جائیں تو وہ خود بحیثیت مجموعی ملک کے لئے فائدہ سے خالی نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بمقابلہ برطانوی ہند کے ہندوستانی ریاستوں میں تجربے کرنا آسان ہے اور اس موقع پر پھر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ان فوائد کا اندازہ کریں جو ہمارا ملک بحیثیت مجموعی اس "کثرت" حالات سے حاصل کر سکتا ہے جس سے ہمارے ملک کی "وحدت" تعمیر ہوئی ہے۔

ان تمام مسائل کی جن کا میں نے ذکر کیا ہے ایک اصولی شرط یہ ہے کہ معاشی حقایق کی کافی معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔ چنانچہ گذشتہ سال اس جگہ سائنس کانگریس کے اجلاس پر میں نے علم الاعداد کی اہمیت پر توجہ دلائی تھی۔ ماہرین معاشیات اور ارباب حکومت دونوں کے لئے صحیح اعداد ہی تنہا رہنما ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ صحیح واقعات کی جانبدارانہ جانچ کے مقابلہ میں اپنے ذاتی رجحانات کے تحت نتایج اخذ کرنا زیادہ آسان ہے لیکن اگر ہم صحیح اعداد کا علم نہیں رکھتے تو کوئی شخص ہم سے یہ توقع کیونکر کر سکتا ہے کہ ہمارے فیصلے ذاتی تعدیل سے متاثر نہیں ہوں گے۔ سیاسی جماعت بندیاں، انتخابی سرگرمیاں اور رائے عامہ کو اپنے موافق بنانے کی ضرورت، ان سب کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی ایک یا دوسرے نقطۂ نظر کا جانبدار بن جاتا ہے۔ صحیح اعداد کی امداد کے بغیر ہمارے پاس کوئی ایسا مواد نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر ہم صحیح فیصلہ کر سکیں اور اگر ایسا مواد دستیاب بھی ہو جائے تب بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اس پر غیر جانبدارانہ غور کریں۔ ہم کو فرقہ پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہئے اور ہم کو اپنے اغراض کے بنیادی اتحاد کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اگر مجھے اجازت ہو تو میں کہوں کہ اس سمت میں انڈین اکونامک کانفرنس جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن میں علمی تجربوں نے غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے معاملات دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے ملک کے مدبروں اور ارباب حکومت کی بیش بہا رہنمائی کر سکتی ہے۔ حیدرآباد میں ہم نے اُن فرائض کا صحیح اندازہ کرنے میں تاخیر نہیں کی جو انڈین اکونامک کانفرنس تمام ملک کے لئے انجام دے رہی ہے۔ خود ہم نے بھی ۱۹۱۹ء سے ایک سررشتہ اعداد و شمار قایم کیا ہے، نیز ریاست کے معاشی مسائل کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے کے لئے

اپنی ایک اکیونامک ایسوسی ایشن قائم کرلی ہے اور جامعہ عثمانیہ میں بھی ایک " اسکول آف اکنامکس" قائم ہوچکا ہے جو اپنی توجہ کا ایک حصہ اعلیحضرت بندگانعالی کی سلطنت کی معاشی ضروریات کے مطالعہ میں صرف کررہاہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایسے محققین کی ایک جماعت کو یکجا کرکے جن کی نظر ہم سب کے مشترکہ مفاد پر مستقل مزاجی کے ساتھ جمی ہو ہم نہ صرف ریاست کی معاشی ترقی میں عملی اضافہ کرتے ہیں بلکہ ہم اُس فرقہ واری احساس اور جانبدارانہ فیصلے کو بھی مسترد کردیتے ہیں جس سے غیر ضروری تصادم پیدا ہوا کرتا ہے۔

حیدرآباد کی صورت حال ایک معاشی لائحہ عمل کی متقاضی ہے۔ ہم کو خود ان خطرات کا قوی احساس ہے جو ان مسائل میں کافی غور و فکر کے بغیر سرکاری مداخلت سے پیدا ہوسکتے ہیں۔ نیز جب تک معاشی ترقی ایک مُرتبہ نقشہ کے مطابق روبہ عمل نہ ہو تمام گذشتہ محنت اور تحقیق بے سود ثابت ہوگی اور متوقعہ ترقی محض بے مقصد راہ روی ہوکر رہ جائے گی پس ان ہی اصولوں پر ہم ان مسائل کا مقابلہ اور ان پر غور و فکر کررہے ہیں جو معاشی دائرہ میں ہمارے درپیش ہیں۔ میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ ہم امداد باہمی (کو اپریٹیو) کی تعلیم پر کس قدر زور دے رہے ہیں اور میں بنکوں اور لین دین کے کاروبار کے متعلق موجودہ تحقیقات کا بھی تذکرہ کرچکا ہوں۔ علاوہ بریں کھیتوں کی یکجائی اور قرضہ کی ادائی اور زیادہ محفوظ حق اراضی کے ذریعہ سے اور اسی کے ساتھ —— جیسا کہ بلاشبہ ضروری ہے —— طریق کاشت اور زمین کی حالت کو بہتر بنا کر ملک کے مزارعین کو معاشی گرانباری سے سبکدوش کرنے کے امکانات پر بھی تحقیقات جاری ہیں۔ توقع ہے کہ لین دین اور بنک کے کاروبار کی تحقیقات کے سلسلہ میں ایسے مواقع پر جہاں باقاعدہ خرید و فروخت اور پیداوار کی درجہ بندی کا کام ہورہا ہے ہم قرض گیری کے لئے مزید آسانیوں کی داغ بیل ڈال سکیں گے۔ اس کے علاوہ ہم سستی برقی قوت مہیا کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں اور اب اس غرض سے پیمائش کا کام جاری ہے تاکہ اس ریاست میں پانی سے برقی قوت مہیا کرنے کے ذرائع سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس طرح مزید ریلوے کی توسیع بھی ان رقبوں کا راستہ کھول دے گی جو بہت بڑے معاشی امکانات رکھتے ہیں۔ اصلاح و ترقی کا نقشہ جو ہم نے بنایا ہے اُس کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہوگا کہ ہم اچھی طرح سوچ لیں کہ خانگی کاروبار اور سرکاری دائرہ عمل میں توازن قائم رکھنے کا بہترین طریقہ کیا ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کا بہت زیادہ وقت نہیں لیا ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ میرے ان کلمات سے

آپ یہ محسوس کر سکے ہوں گے کہ ہم سب آپ کے اس اجتماع میں کس قدر گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور کس قدر ذوق و شوق کے ساتھ آپ کے مباحث کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ مباحث بلاشبہ ان سائل پر روشنی ڈالیں گے جو ہمارے اور آپ کے لئے مشترکہ طور پر باعث فکر و تردد ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ملک کے معاشی مفاد کے لئے ہم سب صدق دل سے آپ کی سرگرمیوں میں شریک ہیں۔

خواتین و حضرات ! میں نہایت مسرت کے ساتھ انڈین اکنامک کانفرنس کے اکیسویں اجلاس کا افتتاح کرتا ہوں۔

اقبال کا اثر اُردو شاعری پر

اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ ان کے کلام سے اُردو شاعری کا متاثر ہونا لازمی ہے لیکن ہم سے زیادہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس اثر کو ٹھیک ٹھیک طور پر متعین کر سکیں گی۔ کسی شاعر یا ادیب کی زندگی میں اس کی خدمات کا کامل اندازہ مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر اقبال جیسے شاعر کی خدمات کا، جس کی ذہنی دنیا میں اب تک کئی انقلاب آئے، اور جس کا ہر نیا کارنامہ ایک نئے رنگ میں رنگا ہوا منظر عام پر آتا رہا۔

اقبال کی شاعری ان کے قلب و دماغ کی کشمکشوں کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اپنے جدید مجموعہ کلام میں اپنی نسبت بالکل ٹھیک لکھا ہے

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں　　کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

مگر یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے شاعر اعظم کا سوز و ساز اور پیچ و تاب بیکار نہیں ثابت ہوا۔ اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک نئی بہار اپنے ساتھ لا رہا ہے۔ ان کی فطرت پرستی، ان کی وطن دوستی، ان کا فلسفہ، مولانائے روم سے ان کی والہانہ عقیدت، ان کا ذوق آگہی، ان کی تہذیب مغرب سے بیزاری، ان کی جرأت رندانہ، ان کی فقیری و قلندری، غرض ان کے ذہنی ارتقاء کا ہر پہلو ایک نئی شان سے ان کے کلام میں جلوہ گر ہے۔ وہ جو چاہیں موضوع اختیار کریں ان کا کمال شاعری ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی غیر معمولی وسعتیں اور بے پناہ گہرائیاں ان کے ہر طرز کے کلام پر اثر انداز ہیں۔ وہ جس رنگ کا چاہیں

جامہ پہن لیں ان کا اندازِ قد چھپ نہیں سکتا۔

اقبال کی شاعری کے مختلف دور، ان کے کلام کی اہم خصوصیتیں، اور اردو شاعروں میں ان کا درجہ، یہ سب ایسے موضوع ہیں جن پر اطمینان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے کارنامے اردو شاعری کو کس طرح متاثر کر رہے ہیں، اور اردو کے جو شاعر ان سے متاثر ہو رہے ہیں وہ ہندستان کی جدید سیاسی فضا میں اس اثر کو کس حد تک باقی رکھیں گے، اور مستقبل کی ضرورتوں کے لحاظ سے اس رنگ میں کس طرح کی تبدیلیاں کریں گے اس کا صحیح اور کامل اندازہ مستقبل ہی میں ہو سکے گا۔ اس وقت تو یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ خود اقبال اپنے اس مسلسل سوز و سازاور پیہم پیچ و تاب کی وجہ سے کس منزل پر جا کر ٹھہریں گے؟ اور ان کی شاعری ابھی کس کس طرح کی فن کاریوں سے مزین اور کیسے کیسے کمالات سے بہرہ ور ہونے والی ہے؟ تاہم "زرہ مثال اثر" اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کہنا ضروری ہے اس لئے اردو شاعری کی تاریخ پر آئندہ کے متعلق جو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں انہی کے بل بوتے پر اظہار خیال کرنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہماری شاعری اب تک جو مدارج طے کرتی آئی ہے اور جس طرح مختلف زمانوں میں مختلف رجحانات کی حامل رہی ہے وہ زیادہ تر اقبال جیسے عظیم الشان شاعروں ہی کی آفرینیوں کا نتیجہ ہیں۔ ابتدا میں اردو شاعری مذہبی خیالات کی تبلیغ اور عقاید کی اشاعت کے لئے استعمال کی گئی۔ چنانچہ بزرگان دین نے عوام کی خاطر اردو میں شعر لکھے جو عام مجالس سماع میں گائے جانے کے علاوہ شرفا کی محفلوں میں بھی مثنوی مولانا روم کی طرح پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔

یہ اردو کا ابتدائی دور تھا۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ ہندستان میں اسلامی حکومت استوار ہو گئی۔ اور استحکام سلطنت کے ساتھ ہی رزم آرائیاں بزم آرائیوں میں منتقل ہونے لگیں ایسے وقت میں گولکنڈہ کے ایک اہل ذوق تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اردو شاعری کے ابتدائی مذہبی رجحان کو ادبی رنگ سے بدل دیا۔ وہ پہلا عظیم الشان اردو شاعر ہے جس نے ہماری شاعری کو جملہ فن کارانہ خصوصیتوں سے مالا مال کر دیا۔ اس کا نام نہ صرف شہر حیدرآباد کا بانی ہونے کی حیثیت سے تاریخ میں زندہ رہے گا بلکہ اردو شاعری کو فارسی کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرنے کے سبب اور جملہ اصناف سخن میں پہلا اردو دیوان مرتب کرنے کی وجہ سے بھی ہر اردو دان سے خراج عقیدت حاصل کرتا رہے گا۔

یہ پہلا استاد سخن تھا جس کے اثر سے ہماری شاعری مذہبی رنگ اور محدود اصناف سخن کی قیود سے آزاد ہو گئی۔

اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد دوسرا عظیم الشان اُردو شاعر جس نے ہماری شاعری کو متاثر کیا وَلی اورنگ آبادی ہے جس کو بابائے ریختہ کہا جاتا ہے اور جس کی عہد آفرینی کی یاد میں گذشتہ سال اسی فرخندہ بنیاد میں دوصد سالہ جشن منایا گیا تھا۔

وَلی ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا جب سلطان محمد قلی کی سلطنت کے ساتھ ساتھ اس کا پیدا کیا ہوا دورِ شاعری بھی ختم ہو رہا تھا۔ ایسے نازک وقت میں اردو کو سنبھالنا اور اُردو شاعری کا بول بالا کرنا ولی ہی کی کرامت تھی چنانچہ وَلی نے فاتحین کے روزمرے اور دہلی کے لشکر یا اُردوے معلیٰ کی زبان سے مفتوحین کی زبان یعنی دکنی اُردو کا امتزاج کیا اور اس طرح اُردو دکن کے علاوہ شمال میں بھی شعر و شاعری کے لئے رواج پاگئی ورنہ اس سے قبل وہاں کی علمی و ادبی زبان فارسی تھی اور اگر اس وقت تک وہاں اُردو میں کچھ لکھا بھی گیا تھا تو اس کی حیثیت ویسی ہی تھی جیسی دکن میں محمد قلی کی عہد آفرینی سے قبل کے اردو کارناموں کی تھی۔ وَلی کا اثر اتنا ہمہ گیر تھا کہ دہلی کے تمام فارسی گو شاعروں نے وَلی کی تقلید میں اُردو میں شعر کہنا شروع کر دیا اور یہ زبان جو اُس وقت تک بازاروں میں بولی جاتی تھی اور عوام کے اظہارِ خیال کا ذریعہ تھی خواص کی محفلوں اور ادبی مجلسوں میں باریاب ہوگئی۔

وَلی کے بعد مرزا مظہر جانِ جاناں کی ایسی ہستی تھی جس نے پھر اردو شاعری کو متاثر کیا اور اس کا رُخ بدل دیا۔ مرزا مظہر نے یہ تحریک شروع کی کہ وَلی کی زبان میں شعر کہنے کے بجائے دہلی کے شعرا کو خالص اردوے معلیٰ کی زبان میں شاعری کرنی چاہئے۔ "کیونکہ ایک دوسرے ملک کی زبان اور محاورہ کی تقلید میں کامیابی حاصل کرنا غیر فطری امر ہے"۔ حضرت جانِ جاناں کی یہ تحریک آسانی سے کامیاب نہ ہو جاتی اگر میر و سودا جیسے رفیع المرتبت شعرا ان کے خیال پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ ان دو اساتذۂ سخن کا اُردو شاعری پر اتنا اثر پڑا کہ اُردو زبان سے دکنی عنصر کم ہونے لگا اور چونکہ دکنی الفاظ کو کم کر کے مغلیہ لشکر یا اُردوے معلیٰ کے الفاظ اور محاورے رائج کئے گئے تھے اس لئے اس زبان کا نام ہندستانی باقی نہ رہا بلکہ زبان اُردو قرار پایا۔

اس دور سے پہلے ہماری زبان کا نام اُردو نہیں تھا۔ بلکہ ہر جگہ کے لوگ اس کو اپنے مقام کی ہندستانی یا ہندی کہتے تھے۔ مثلاً دکن کے عہد قطب شاہیہ کے شعرا یا مصنفین نے اپنی زبان کو یا تو ہندستانی کہا یا دکنی۔ غرض میر و سودا

کی وجہ سے مغلیہ لشکر یا اردو کے الفاظ کا ہماری زبان پر قبضہ ہو گیا۔

میر و سودا کے بعد لکھنؤ میں ناسخ و آتش نے اس زبان اور شاعری کو متاثر کیا جس کی وجہ سے اردو میں ہمہ گیری پیدا ہو گئی اور ایک ایسی باضابطہ اور منضبط زبان بن گئی کہ اب تک ہمارے شاعر لکھنؤ ہی کی معین کی ہوئی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔

ناسخ و آتش کے بعد آزاد و حالی نے پھر اردو شاعری پر اثر ڈالا۔ اس دفعہ زبان سے زیادہ خیالات متاثر ہوئے کیونکہ لکھنوی شعراء نے زبان پر اتنا زور دیا تھا کہ اس کا ردعمل ہونا ضروری تھا مطالب و معانی کی خوبیوں کا اتنا خون ہوا تھا کہ اس کا رنگ لانا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ اس دور کی اردو شاعری اپنے عہد کی زوال پذیر معاشرت کی ترجمان تھی اس لئے اس میں وہ تمام عناصر راہ پا گئے جو قوموں کو ترقی سے زیادہ تنزل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حالی اور آزاد نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنی اپنی حد تک اپنے مقصد میں کامگار رہے لیکن جس طرح مرزا مظہر جان جاناں کی تحریک میر و سودا کی وجہ سے کامیاب ہوئی اور اردو شاعری کی شکل بدل گئی بالکل اسی طرح حالی اور آزاد کی اصلاحی کوششیں آج کلام اقبال کی وجہ سے تکمیل کو پہنچ رہی ہیں۔

اقبال نے تخیل کی جولانیوں کے لئے ایسے ایسے میدان کھول دئے ہیں جن کی طرف اس سے قبل اردو شاعروں کی توجہ کبھی منعطف ہی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے خیالی اور مصنوعی شاعری کو نظروں سے گرا دیا۔ اردو شاعروں کا فرضی معشوق اپنی کمر کی طرح اب خود بھی عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ مصنوعی عشق بازی اور جھوٹی معاملہ بندی اب ہماری شاعری کی جان نہیں رہی۔ قصیدوں کی مبالغہ آمیزیاں اور مثنویوں کے فوق الفطری قصے جنوں اور پریوں کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال نے لفظی چٹکلوں اور دور از کار محاورہ بندیوں کی جگہ حقایق کی تلمیح اور سیاسیات حاضرہ کے ناگفتہ بہ مسائل کو اس خوبی سے شاعری میں داخل کر دیا ہے کہ اب اردو شاعری کے موضوع ہی بدل گئے۔ اور شاعری واقعی ساحری بن گئی اقبال نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق ۔۔۔ نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش ۔۔۔ میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بیگانے تو ناخوش رہتے ہی ہیں لیکن اقبال سے اپنوں کا خفا ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ انھوں نے غالب کی طرح قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی روش اختیار کی اور خیالی معاشقے یا فرضی بادہ و ساغر کے بیانات سے اپنے کلام کو آلودہ نہیں کیا

وہ کہتے ہیں ؎

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو
نہ کر خار اشگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

عزیز تر ہے متاع امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی

میری مینائے غزل میں تھی ذراسی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے لوازم غزل کی پابندی نہیں کی اور ایسے ناما نوس اور خشک مضامین باندھے جن کی ہماری شاعری متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ زبان و محاورہ کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس کا جواب خود اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں اس طرح دیا ہے :-

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگ صور سرافیل دلنواز نہیں

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ مے خانہ

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

غرض اقبال نے شاعری کا اسلوب ہی بدل دیا۔ آزادہ روی، حقیقت نگاری، شاعری کے لوازم ہوتے جا رہے ہیں۔ معاملہ بندی، آسمان یا معشوق کے ظلم و ستم کا ماتم، رقیب روسیاہ کے رشک و حسد کا گلہ، غزل کی زبان کا لحاظ، دلی یا لکھنو کے محاوروں یا روزمروں کی پابندی غرض طرح طرح کی قید و بند سے ہماری شاعری آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ مولوی حالی نے پھر بھی قدیم مشرقی مروت سے کام لیا تھا اور شعرائے نازک خیال کے تکلفات لایعنی اور خیالی لوازم شعری کی مدافعت اس مہذب پیرایہ میں کی تھی کہ ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن اقبال ضروریات زمانہ کے پیش نظر سخن آرائی کے قایل ہی نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی سخن آرائی کے لحاظ نے حد سے زیادہ ہمارے شاعروں کو گمراہ کر کے معانی و مطالب کی گہرائیوں سے بے پروا کر دیا اور اردو شاعری

یا تو قافیہ پیمائی یا محاورہ بندی کے لئے وقف ہوگئی یا چند موضوعوں کے لئے محدود کردی گئی۔ اقبال اسلوب سے زیادہ مطالب و معانی کے قائل ہیں۔ وہ اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس کو پیرایۂ بیان بھی خود بخود اچھا ہی مل جائے گا۔ اور بغیر مشاطگی یا پروپگنڈے کے اس کے سننے اور سمجھنے والے بھی پیدا ہو جائیں۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو ۔۔۔ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر ۔۔۔ مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

دوسرے شعرا کی طرح اقبال اپنے کلام کو جام مے بنا کر گردش میں لانا نہیں چاہتے بلکہ وہ اہل محفل کو دعوت عمل دیتے ہیں کہ اس ثمر سے وہ خود مئے لالہ فام نکال لیں۔ اور جو اس دعوت پر لبیک کہنا نہیں چاہتے اور ذوق خودی نہیں رکھتے ان سے تو وہ مخاطب بھی نہیں ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ ۔۔۔ کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہندستان کی محفل ان کے کلام کو سمجھنے اور اس سے کما حقہٗ محظوظ ہونے کے قابل نہیں ہوئی۔ ان کا تخیل دور نکل گیا ہے اور ان کے ساتھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا خود ان کو بھی احساس ہے وہ کہتے ہیں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا ۔۔۔ مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شعرا تو کجا اہل مدرسہ و اہل خانقاہ بھی اس ذوق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں اور اسی محرومی کی وجہ سے اب تک ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اقبال کا شعر ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے ۔۔۔ فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اس خیال کو ایک اور جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

جلوتیاں مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق ۔۔۔ خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ ۔۔۔ میری تمام سرگزشت کھوے ہوؤں کی جستجو

ان کے خیال میں اضطراب و اثر اور خون جگر کے بغیر سخن بے فیض ہے اور شاعر ساحر نہیں بن سکتا ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات ۔۔۔ ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر ۔۔۔ نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال نے ہمارے شاعروں کے سب سے بڑے نقص یعنی اظہار بوالہوسی اور زلف و کاکل خد و خال" اور جوبن و کمر کے مضامین باندھنے کی کیا اچھی توضیح کی ہے کہ ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا — ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ مصرعہ کہ آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار جتنا اردو کے شاعروں اور خاص کر غزل گو شعرا پر صادق آتا ہے دنیا کے کسی اور فن کار پر منطبق نہیں ہوتا۔

عشق عاشقی اور معاملہ بندی کی جگہ اقبال چاہتے ہیں کہ ہمارے شاعر حقیقت نگاری سے آشنا ہوں اور اپنی خودی کی حفاظت کریں۔ جب آدمیوں اور شاعروں میں یہ احساس پیدا نہ ہوگا کوئی شاعری ملک و قوم کے لئے وجہ حیات اور باعث وقار ثابت نہیں ہو سکتی

سرود و شعر و سیاست کتاب دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جو کلام حقیقت پر مبنی نہ ہو اور زندگی کے سبق نہ سکھلائے وہ بیکار ہے۔ وہ باد سحر ہی کیا جس کے جھونکے چمن کی افسردگی کو شگفتگی میں نہ بدل سکیں۔ اقبال کہتے ہیں ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اسی خیال کو ایک اور نظم میں اس طرح واضح کیا ہے ؎

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہے گلستاں — بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ　　از ہر چہ بآئینہ نماید بہ پرہیز

آخر میں ہم اقبال کی اس نظم کے چند شعر بھی سُنائے دیتے ہیں جو ہمارے نوجوان شاعروں کے لئے لائحۂ عمل کا کام دے رہے ہیں اور جن میں اقبال شاعر ہی سے مخاطب ہیں ؎

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نَے　　شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم　　اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو　　شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے

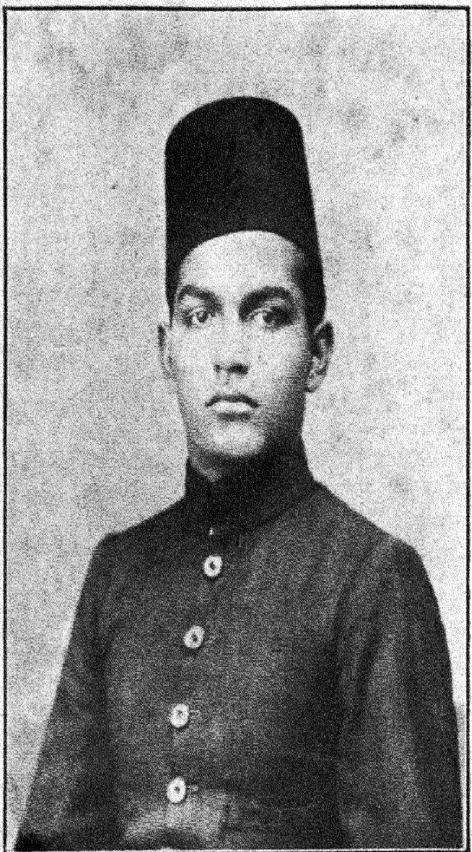
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ ہے وہ وسعتِ نظر اور مرحلۂ شوق کی گوناگونی جو اُردو شاعری کو متاثر کر رہی ہے۔ اقبال کی تلخ نوائی نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ سلیم و سیماب، اور جوش و ساغر جیسے پختہ مشق شاعروں کو بھی متاثر کر دیا۔ اقبال کے اثر سے رفتہ رفتہ قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ میں ناسخ و آتش کے اثر سے الفاظ محاورات اور اسالیب بیان متروک ہو گئے تھے۔ اور آج اقبال کے اثر سے بہت سے فرسودہ خیالات لایعنی تکلفا اور غیر ضروری لوازم شعر متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جہاں تک مطالب و معانی کا تعلق ہے اُردو شاعری اق کے کلام سے متاثر رہے گی اور اہل اُردو میں زندگی اور زندہ دلی قائم رکھنے کا باعث ہوگی۔

سید محی الدین قادری زور



مسٹر ابوالخیر صدیقی معتمد انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ



مسٹر امجد علیخان مہتمم کتب خانہ انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ

وفاق ہند

اس مضمون نے انجمن شبان الصدقین کے فی البدیہ انعامی مقابلہ میں دوسرا انعام حاصل کیا
مدیر

مملکت کی دو طرح سے تقسیم کی گئی ہے ایک مملکت فردیہ اور دوسرے مملکت وفاقیہ۔ فردیہ مملکت میں تمام اختیارات نظم ونسق عاملہ، مقننہ وعدلیہ صدر عاملہ، بادشاہ یا صدر جمہوریہ کو حاصل ہوتے ہیں اختیارات کی مرکزی ومقامی تقسیم نہیں کی جاتی بلکہ مرکزی حکومت کی جانب سے صوبہ دار اور دیگر اعلیٰ عہدہ دار مقرر کئے جاتے ہیں ان کو اختیارات بھی مرکزی حکومت کے ملتے ہیں مرکزی حکومت ان کو اختیارات دے سکتی ہے اور پھر واپس لے سکتی ہے اس کی عمدہ مثال ہماری ریاست ابدمدت اور افغانستان وغیرہ میں مل سکتی ہے۔ مملکت وفاقیہ میں اختیارات کی تقسیم کی جاتی ہے مرکزی اور مقامی امور الگ کرلئے جاتے ہیں مرکزی امور مرکزی وفاقی حکومت کے تحت رہتے ہیں اور مقامی امور مقامی حکومت کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ مرکزی امور میں ملک کی مدافعت وحفاظت، مالیات، فوجی تنظیم، ذرائع حمل ونقل مثلاً ریلوے جہازات ہوائی جہاز وغیرہ کروڑگیری وجنگی اسکہ ڈٹپہ شامل ہیں یہ تمام امور وفاقیہ مملکت میں وفاقی مرکزی حکومت کے تحت ہوتے ہیں۔ وفاقی مملکت میں مرکزی اور مقامی حکومتیں ہوتی ہیں مقامی امور مقامی حکومتوں کے تحت ہوتے ہیں تعلیمات، حفظان صحت، تعمیرات، و دیگر قومی فلاح وبہبود کے جتنے بھی امور ہیں وہ سب مقامی حکومتوں کے تحت ہوتے ہیں۔

مملکت وفاقیہ کی مثال ہمیں امریکہ، کناڈا، اسٹریلیا، سوئیٹ روس اور سوزرستان میں ملتی ہے بقول پروفیسر پنیپا وفاق دو طرح سے قایم ہوتا ہے (۱) اگر ملک کی وحدتیں آپس میں منتقل نہ ہوں انتشار پایا جاتا ہو اور مشترکہ قومی مفاد کا خیال نہ ہو اور باہر سے حملہ کا خوف ہو تو اُن وحدتوں میں اتفاق ہو جائے گا اور وفاق قایم ہوگا۔ امریکہ میں جنگ آزادی شروع ہونے سے قبل تیرہ مختلف نوآبادیات تھیں آپس میں پھوٹ اور نااتفاقی تھی مرکزی حکومت ناپید تھی قومی مشترکہ مفاد نظر انداز کر دیا گیا تھا مگر جب جنگ آزادی کا اعلان ہوا تو مشترک دشمن انگلستان کے خلاف تمام نوآبادیات نے جنرل واشنگٹن کے تحت اتحاد کر لیا اور جنگ میں متحد ہو کر کامیابی حاصل کی امریکہ آزاد ہو گیا تمام نوآبادیات میں وفاقی حکومت قایم کی گئی مرکزی امور مرکزی حکومت کے تحت دیئے گئے اور مقامی امور قومی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے مقامی حکومتوں کے تحت رکھے گئے اور ان تمام مقامی ریاستوں کی نمایندگی مجلس مقننہ میں مساوی طور پر ہوتی ہے صدر جمہوریہ تمام قوم کی رائے سے منتخب ہوتا ہے۔ وفاق کی دوسری قسم یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں جغرافیائی معاشرتی مذہبی اور لسانی ونسلی اتحاد نہ ہو آپس میں یگانگت و یک جہتی نہ ہو اور ہمیشہ اختلافات رہتے ہوں تو اُن اختلافات کو مٹانے کے لئے وفاق قایم کیا جاتا ہے اس کی مثال ہمیں کناڈا میں ملتی ہے۔ کناڈا میں انگریزی اور فرانسیسی قومیں آباد ہیں جن کا مذہب اور تمدن علیحدہ تھا زبان الگ تھی سیاسی انتشار تھا آپس میں رشک وحسد پایا جاتا تھا، ان اختلافات کو مٹانے کے لئے وفاق قایم کیا گیا۔

اس طرح سے وفاق دو قسم سے قایم کیا جاتا ہے ایک تو سیاسی وفاق ہوگا جیسا کہ امریکہ میں ہے دوسرا سماجی مذہبی وتمدنی وفاق جیسا کہ کناڈا میں ہے اور ہندوستان میں قایم کیا جا رہا ہے پروفیسر پنیپا نے اپنی کتاب "ہندوستان بہ سلطنت وفاق" میں لکھا ہے کہ ہندوستان کا وفاق نہ صرف سیاسی نوعیت کا ہے بلکہ وہ سماجی تمدنی اور مذہبی وفاق بھی ہے۔ برطانوی حکومت کا یہ عطیہ ہے کہ ہندوستان ایک وحدانی حکومت بن گیا دورِ قدیم و قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان بہ حیثیت کل کسی شاہنشاہیت کے تحت نہ تھا۔ گپتا، موریا، مغلیہ شاہنشاہیتوں کے زمانہ میں جنوبی ہند شمال سے بالکل آزاد رہا ہے یہ صرف برطانوی حکومت کا طفیل ہے کہ نظم ونسق مملکت اور حکومت کے لحاظ سے ہندوستان ایک وحدت بن گیا ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک تمام ملک میں تمدنی، تہذیبی۔ معاشرتی، لسانی، نسلی غرضکہ ہر طرح کے اختلافات موجود ہیں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوا کرتے ہیں ملک میں اتحاد و اتفاق کا نام تک نہیں افراد مملکت

میں انتشار ہے کسی نقطہ خیال پر بھی اتحاد نہیں ہے ہندوستان جغرافیائی لحاظ سے ایک برّاعظم ہے یہاں کئی قومیں مختلف زبانیں بولنے والی مختلف تمدن و تہذیب و طرز معاشرت رکھنے والی آباد ہیں ہندوستان میں مختلف تہذیب و تمدن مختلف زبانیں مختلف طرز معاشرت اور مختلف طرز خیال پائے جاتے ہیں اور مذہبی اختلافات کی تو کوئی حد ہی نہیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی اندرونی طور پر کئی کئی فرقے پائے جاتے ہیں۔ ان سب اختلافات کو دور کرنے سیاسی، معاشی اور تمدنی وحدت قایم کرنے کے لئے وفاق مفید طریق حکمرانی ہو سکتا ہے۔ انھیں اختلافات کو پیش نظر رکھ کر ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے رو سے ہندوستان میں وفاق قایم کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر مختصراً ہندوستان کی سیاسی ارتقا پر روشنی ڈالنا مناسب ہے۔ بقول صاحب سیرۃ المتاخرین انگریزوں کا ستارہ اقبال کرناٹک (ارکاٹ) میں طلوع ہوا پلاسی میں چمکا اور بکسر میں بلند ہو کر افق ہند پر جگمگانے لگا ۱۷۷۳ء تک بمبئی، کلکتہ، مدراس کی حکومتیں مجلس نظما (لندن) کے تحت تھیں گورنر مقرر کئے جاتے تھے مگر ۱۷۷۳ء میں قانون تنظیم نافذ کیا گیا جس کے ذریعہ کلکتہ کا گورنر بہ اجلاس کونسل گورنر جنرل مقرر کیا گیا جس کو جنگ و صلح کے اختیارات دیئے گئے ۱۷۸۴ء کا قانون پٹ (Pitts India Bill) کے رو سے بھی گورنر جنرل کے اختیارات کی توسیع کی گئی ۱۸۳۳ء میں لارڈ ولیم بنٹنک کے عہد حکومت میں مرکزی حکومت عاملہ اور مقننہ اور تمام ہند میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ذرائع حمل و نقل کی ترقی ریل، تار برقی اور دیگر سہولتوں کی بدولت صوبہ جات ہند مرکزی حکومت کے قریب تر ہو گئے مرکزی حکومت کے اثرات صوبوں پر پڑنے لگے ۱۸۶۱ء میں لارڈ منٹو کے عہد حکومت میں صوبوں کو کچھ مالیاتی اور اندرونی نظم و نسق کے اختیارات عطا کئے گئے جو موجودہ صوبہ جاتی خود اختیاری کا پہلا قدم تھا۔

۱۸۵۷ء کا غدر حقیقت میں مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن اور اختلافات کا تصادم تھا گو اہل ہند کو ناکامی ہوئی مگر حکومت ہند کو اپنے طریق حکومت میں تبدیلی کرنی پڑی مغربی تعلیم کا آغاز لارڈ بینٹنگ اور لارڈ میکالے کے زمانہ حکومت ہی سے ہو چکا تھا کلکتہ بمبئی مدراس وغیرہ میں جامعات قایم کئے گئے جس کی بدولت اہل ہند مغربی تعلیم پا کر مغربی اثرات سے متاثر ہو کر حکومت سے مساوات اور حقوق کا مطالبہ کرنے لگے ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا کانگریس کا قیام عمل میں آیا اس کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہند کی جائز شکایتیں حکومت کے سامنے پیش کر کے رفع کی جائیں اور حکومت سے حقوق طلب کئے جائیں اہل ہند کو عہدے دیئے جائیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ کانگریس میں شریک ہونے لگا۔ لارڈ کرزن نے بغور ہندوستان کی سیاسی ذہنیت و تمدن کا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ ان کے آپس کے اختلاف سے فایدہ اٹھایا جائے تو برطانوی حکومت عرصہ دراز

تک قایم رہ سکتی ہے ۔ اس لئے اس نے بنگال کی تقسیم کروادی بنگالی ہندؤوں نے اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں نے تائید کی اس طرح ہندو مسلم اختلاف پیدا ہو گیا ۱۹۰۹ء میں مارلے منٹو اصلاحات نافذ کئے گئے جس کے ذریعہ مسلمانوں کو مجلس مقننہ میں علیحدہ نشستیں دی گئیں اور ان کا حلقہ انتخاب بھی الگ کر دیا گیا گویا اس طرح سے ہندو مسلم اختلاف کی خلیج کو اور وسیع کر دیا گیا ۔ یہ جداگانہ حلقہ انتخاب قومی ارتقاء میں حائل ہو گیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا مسلمانوں نے اپنا علیحدہ نمائندہ سیاسی ادارہ قایم کر لیا ۔ گو مسلم لیگ اور کانگریس میں وقتی طور پر ۱۹۱۶ء میں اتحاد ہوا تھا مگر یہ اتحاد زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکا ۔ ۱۹۱۷ء میں برطانوی حکومتوں نے اعلان کیا کہ اہل ہند کو ذمہ دار حکومت دی جائیگی ۱۹۱۸ء میں بمبئی کانگریس نے ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا اور اعلان کیا کہ اہل ہند اتنے باشعور ہو گئے ہیں کہ وہ حکومت چلا سکیں ۔ ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات جاری کئے گئے جس کے رو سے صوبہ جاتی امور کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ایک امور محفوظہ اور دوسرے امور منتقلہ صرف امور منتقلہ کو ہندوستانی وزراء کے تفویض کیا گیا اور وزراء مجلس قانون ساز کے سامنے ذمہ دار قرار دیے گئے ۔

جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری اور جذبہ قومیت و آزادی پیدا ہونے لگا اس کے دو اسباب ہیں ایک تو جنگ عظیم جس میں برطانیہ فرانس و امریکہ کو فتح ہوئی گویا جمہوریت کا غلبہ رہا ۔ جمہوری خیالات اہل ہند کو متاثر کرنے لگے دوسرے کانگریس ۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں کانگریس نے ہندوستان کی سیاسی نمائندہ کی حیثیت حاصل کرلی اور تمام تعلیم یافتہ ہندو اس میں شریک ہو گئے اور محب وطن آزاد خیال مسلمان بھی کانگریس میں داخل ہو گئے ۔ کانگریس کی جد وجہد اور کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سیاسی بیداری اور جذبہ قومیت و آزادی پیدا ہو گیا بیگم شاہ نواز نے راونڈ ٹیبل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "جنگ کے اثرات اور کانگریس کی کوششوں سے ملک میں جذبہ آزادی و قومیت کو فروغ ہو رہا ہے ہر نوجوان مرد و عورت شہر اور دیہات میں آزادی اور قومیت کی باتیں کرتے ہیں"۔ ۱۹۲۲ء میں عالمی کساد بازاری عام معاشی پستی رولٹ بل کی مخالفت اور خلافت تحریک کی وجہ سے کامل قومی اتحاد ہو گیا تھا مگر یہ اتحاد بھی وقتی تھا کانگریس ذمہ دار حکومت کا پیہم مطالبہ کر رہی تھی اس دوران میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام وقوع پذیر ہوا تمام ہندوستان میں ایک سنسنی پھیل گئی ہر طرف غم و غصہ اور نفرت کا جذبہ سرایت کر گیا قومی وقار کو بڑھانے کے لئے کانگریس نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون، عدم تشدد اور سیول نافرمانی کی تحریکات کا آغاز کیا اور عام شورش برپا ہو گئی کانگریس نے سوراج کا مطالبہ شروع کیا جذبہ قومیت کو فروغ دینے اور سوراج کے مطالبہ کو

کامیاب بنانے کے لئے برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا جانے لگا سودیشی مال کا پروپگنڈا شروع ہوا گو تمام تحریکات میں ناکامی ہوئی مگر جذبۂ قومیت اور احساس آزادی عوام میں پیدا ہوگیا۔ جمہور سے کانگرس کے تعلقات قایم ہوگئے عوام میں سیاسی بیداری کو فروغ ہوا۔ برطانوی حکومت نے تحقیقات کے لئے سائمن کمیشن ۱۹۲۷ء میں مقرر کیا مگر کانگرس نے اس کا بائیکاٹ کیا اور ۱۹۲۷ء میں مدراس کانگرس نے بصدارت پنڈت جواہر لال نہرو مکمل آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا ۱۹۲۸ء میں لاہور کانگرس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ کانگرس مکمل آزادی کا مطالبہ کرتی ہے وہ اپنا دستور بنائے گی اس کو پارلیمنٹ کے بنے ہوئے دستور پر عمل کرنے سے انکار ہے۔

سائمن کمیشن نے اپنے رپورٹ میں قیام وفاق کی سفارش کی اور صوبہ داری خود مختاری عطا کرنے کے متعلق حکومت برطانیہ کو توجہ دلائی۔ ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے پھر عدم تشدد اور سیول نافرمانی کی دھمکی دی اس پر ۱۹۲۹ء کو لارڈ ارون وائسرائے ہند نے ایک اعلان جاری کیا کہ سائمن کمیشن نے ملک معظم کی حکومت سے استدعا کی ہے کہ اس کی سفارشات اور رپورٹ شائع ہونے کے بعد جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں تحقیقات کے لئے پیش ہونے سے قبل ایک کانفرنس برطانوی ہند کے نمایندوں اور والیان ریاست کے نمایندوں کی منعقد کی جائے جس میں ایک ایسا حل دریافت کیا جائے جو سب کے لئے قابل قبول اور اختلافات کو مٹانے والا ہو۔ ملک معظم کی حکومت نے انعقاد کانفرنس کا اعلان کیا ۲۳ر ڈسمبر ۱۹۳۰ء کو لارڈ ارون نے گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے لیڈروں سے ملاقات کی اور کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی ان لیڈروں نے کانفرنس کو سیاسی جال سمجھ کر انکار کردیا بہرحال گاندھی اور ارون میں ایک طرح کی مفاہمت (Gandhi Irwin Truce) ہوگئی مگر پھر حالات بدلے ۱۹۳۰ء میں گاندھی ڈنڈی کو روانہ ہوئے تاکہ نمک کے قانون کی خلاف ورزی کی جائے جب کہ ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر تھی انھیں حالات میں پہلی گول میز کانفرنس کا اجلاس لندن میں ۱۹۳۰ء میں ہوا حکومت کے نامزدہ ارکان شریک تھے۔ سائمن کمیشن کی سفارشات کے بموجب وفاق کی اسکیم پیش کی گئی مسلمانوں نے وفاق کی تائید کی مولانا محمد علی مرحوم سر محمد اقبال اور سر محمد شفیع نے وفاق کی تائید میں تقاریر کیں مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ چونکہ اقلیت میں ہیں لہذا ان کے تہذیب و تمدن طرز معاشرت مذہب اور اصول زندگی زبان اور روایات کی حفاظت ہونا چاہئے یہ وفاق ہی میں ممکن ہوسکتا ہے۔ مسٹر شفیع نے بہ دوران تقریر گول میز کانفرنس کے سامنے کہا تھا کہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال ہند پر حکومت کی ہے ابتدا سے اب تک ہندوستان میں جمہوری نظام کی حکومت قایم نہیں ہوئی تھی مگر اس کا تجربہ کیا جارہا ہے

مسلمان اقلیت میں ہیں جمہوری نظام کے تحت وہ اکثریت کے غلام بن جائیں گے اور ہندو راجپوت سکھ مرہٹے جو ان کے دشمن ہیں مسلمانوں کو غلام بنا دیں گے اگر صوبہ جاتی خود اختیاری عطا کی جائے تو پنجاب بنگال سرحد اور سندھ میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور دوسرے صوبوں میں ہندو اکثریت میں ہیں ہر دو اپنی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کریں گے اس طرح ہندو مسلم مسئلہ طے ہو جائے گا وفاق ہی ہندوستان کے لئے مفید طریقہ حکمرانی ہو سکتا ہے اس میں تمام اقلیتوں مثلاً مسلمان، سکھ، پارسی عیسائی وغیرہ کے حقوق مذہب، تمدن، زبان اور طرز معاشرت کی حفاظت ہو سکیگی اس طرح سے وفاق ہند نہ صرف سیاسی بلکہ تمدنی اور سماجی اختلافات کا حل ہو جائے گا۔ کناڈا میں انگریزی فرانسیسی سماجی و مذہبی تمدنی لسانی اختلافات کا واحد حل یہی وفاق ثابت ہوا ہے اسی طرح ہندوستان میں وفاق نہ صرف سیاسی جغرافی بلکہ سماجی بھی ہو گا۔

دیسی ریاستوں نے بھی وفاق کی تائید کی۔ سب سے پہلے وفاق کی تائید کرنے والے ہمارے اعلیحضرت بندگان اقدس ہیں جنھوں نے ہندوستان کے لئے وفاق کو مفید تصور فرمایا والیان ریاست اس لئے وفاق میں شریک ہو کر اپنے پوزیشن وقار اور طریق حکومت و اندرونی خود اختیاری کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں کہ آجکل ہندوستان ایک انقلاب انگیز دور سے گذر رہا ہے مغربی اثرات جذبہ قومیت، جمہوریت اور آزادی کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ برطانوی ہند میں جمہوری طرز حکومت مقبول ہو رہی ہے اور وہ شاہی مطلق العنانی کے دشمن ہو رہے ہیں یہی جمہوری خیالات دیسی ریاستوں کی رعایا کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔ اور ان کی رعایا موجودہ شاہی طرز حکومت پر نکتہ چینی کر رہی ہے کانگرس بھی ہندوستان میں جمہوری طرز کی حکومت قایم کرنا چاہتی ہے وہ والیان ریاست کے بھی خلاف ہے اس اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے والیان ریاست "قوت بالادست" (Paramount Power) کا سہارا ڈھونڈتے ہیں مسلمان اکثریت کی حکومت سے ڈر کر اور والیان ریاست جمہوریت کے سیلاب سے خوفزدہ ہو کر وفاق میں شریک ہو کر اپنے پوزیشن وقار اور حقوق کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔

کانگرس وفاق کی مخالفت کر رہی ہے اس کا مطالبہ مکمل آزادی ہے وہ ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قایم کرنا چاہتی ہے جس میں اکثریت کی حکومت ہو گی وفاق کی کانگرس اس وجہ سے بھی مخالفت کر رہی ہے کہ اس میں رجعت پسند طبقہ اور ریاستیں شریک ہو رہی ہیں۔ برطانوی حکومت ہند رجعت پسند طبقہ اور ریاستوں کو کانگرس کے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے اس لئے کانگرس ریاستوں کو وفاق میں شریک ہونے سے منع کر رہی ہے ورنہ ان دونوں میں دشمنی ہو جانے کا

اندیشہ ہے کہ کانگریس کے موجودہ رجحان جمہوریت و اشتراکیت سے والیان ریاست ڈر رہے لہذا ان دونوں میں تصادم ہوگا۔ اس کے لئے مجلس مقننہ کا میدان طیار کیا گیا ہے کانگریس اس وجہ سے بھی وفاق کے خلاف ہے کہ کناڈا اسٹریلیا جو شاہنشاہیت برطانیہ کے اجزا ہیں ان میں وفاق قایم کرنے سے قبل ذمہ دار حکومت دیدی گئی تھی صرف افعت اور خارجہ پالیسی برطانیہ کے تحت رکھی گئی افراد قوم اور مختلف علاقوں کے لوگوں کے مشورے سے تمام مقامی اختلافات کو مٹا کر مدبران ملک نے وفاقی دستور بنایا تھا پوری قوم کی رائے اس دستور وفاقیہ میں شامل تھی اور انھیں کی مرضی کے مطابق برطانوی حکومت نے وفاق کناڈا اسٹریلیا میں قایم کیا۔ مگر ہندوستان میں معاملہ بالکل برعکس ہے یہاں ذمہ دار حکومت نہیں اور نہ دستور افراد قوم کی رائے سے بنایا گیا ہو۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اس وفاقی دستور کو وضع کیا ہے اور ہندوستان کے گلے میں پھر طوق غلامی بنا کر ڈال رہی ہے تاکہ تاحیات اس سے خلاصی نہ پاسکے انھیں تمام وجوہ پر کانگرس وفاق کی سختی سے مخالفت کر رہی ہے مگر حکومت ہند گاندھی جی کے ذریعہ کانگرس سے سمجھوتہ کر کے وفاق قائم کرا ہی دیگی۔ عدالت وفاقیہ کا قیام عمل میں آچکا ہے اب آیندہ وفاق کی طیاری ہے۔ وائسرائے ہند نے اپنی کسی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ قریب میں وفاق قایم کیا جائے گا۔

۱۹۳۵ء کے قانون ہند دو اجزا میں تقسیم ہے ایک صوبہ جاتی خود اختیاری (۲) وفاق۔ صوبہ جاتی خود اختیاری کا قیام عمل میں آچکا ہے قانون کے رو سے عدن اور برما حکومت ہند سے علیحدہ ہوگئے صوبہ سندھ اور صوبہ اڑلیسہ کا قیام عمل میں آیا مقامی صوبہ جاتی تمام امور قانون کی رو سے ہندوستانی وزرا کے تحت دیئے گئے صوبہ جاتی خود مختاری کے معنی ہی یہ ہیں کہ تمام صوبے اندرونی نظم ونسق میں آزاد رہیں گے اور اکثریت کی حکومت ہوگی جس پارٹی کا مجلس قانون میں غلبہ ہوگا اس کے رہنماؤں کی وزارت قایم کی جائے گی چھ ماہ کے تعطل کے بعد کانگرس نے عہدے قبول کئے اور صوبہ جاتی خود اختیاری کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے پہلا جز قانون کا مکمل ہوگیا اب وفاق قایم کیا جائے گا جس میں برطانوی ہند کے صوبہ جات کے ساتھ ریاستیں بھی وفاق میں شریک رہیں گی۔

وفاق میں شرکت کا سوال ریاستوں کے لئے بہت اہم ہے۔ گول میز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے راجہ ناؤنگر نے کہا تھا کہ ہم وفاق میں شریک ہونے کے لئے راضی ہیں بشرطیکہ ہمارے اندرونی نظم ونسق اور طریق حکومت میں مداخلت نہ کی جائے ہمارے موجودہ مشکلات رفع کئے جائیں والیان ریاست اندرونی معاملات میں مداخلت کو کبھی گوارا نہیں

کر سکتے"۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک ہے اور اُس کو برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں میں تقسیم کرنا یہ صرف سیاسی تقسیم ہے جغرافیائی سماجی معاشی تمدنی لحاظ سے تمام ہندوستان ایک معاشی و سیاسی وحدت ہے۔ ذریعہ حمل و نقل کی ترقی اور مغربی تعلیم کے اثرات سے تمام ہندوستان میں ایک سیاسی بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے چند امور مثلاً مدافعت فوجی نظام ضابطہ ٹیارف، تامین، تجارت، ذرائع حمل و نقل کی ترقی، ایسے امور ہیں جن میں پورے ہند کا مفاد مشترک طور پر وابستہ ہے ان تمام امور پر پورے ہند کو متحد ہو جانا چاہئے۔ بیگم شاہ نواز نے کہا تھا کہ وہ دن خوش قسمت ہوگا جبکہ ریاستیں اور برطانوی ہند مشترکہ مفاد کی خاطر متحد ہو جائیں گے اس سے حقیقت میں ہندوستانی قومیت کو تقویت ہوگی۔

والیان ریاست کا دعویٰ ہے کہ وہ اندرونی معاملات ریاست میں آزاد ہیں انھیں اقتدار اعلیٰ حاصل ہے صرف امور اور مدافعت کا سوال "قوت بالادست"، یعنی تاج برطانیہ کے ساتھ ہیں مگر کہا جاتا ہے کہ حکومت ہند ان کے اندرونی معاملات میں عمل دخل کرتی ہے اور معاہداتی موقت کو بھلا کر ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے ان کے وقار اور آزادی کو سلب کرتی ہے۔ یہ تضاد اس وقت سمجھ میں آتا ہے جبکہ ہم (Paramount Power) "قوت بالادست کی تشریح کو سمجھ لیں۔ والیان ریاست اور تاج برطانیہ میں تعلقات بین الاقوامی قوانین پر مبنی نہیں ہیں نہ وہ معاہداتی موقت پر مبنی ہیں بلکہ تعلقات محض سیاسی ہیں۔ قوت بالادست سیاسی حالات کے لحاظ سے ان کے معاملات میں مداخلت کرتی ہے اس کا کوئی تعین نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کسی طرح سے بھی آزاد نہیں ہیں معاہداتی رو سے ان کے خارجی تعلقات تاج برطانیہ کے تحت ہیں بیرونی حملہ کی مدافعت برطانیہ کے ذمہ ہے اندرونی معاملات میں گو وہ اپنے نظم و نسق عدالت قانون وغیرہ میں ہر طرح آزاد ہیں مگر رزیڈنٹ کے کسی مشورہ کو رد نہیں کر سکتے قوت بالادست کو بھی ہر طرح اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق ہے وہ وزیر اعظم دیوان بہادر کا تقرر کروا سکتی ہے برطانوی عہدہ دار مقرر کر سکتی ہے رزیڈنٹ مشورہ دیتا ہے اندرونی بغاوت کو فرو کرنے کا حق بھی برطانیہ کو حاصل ہے ریاست کی تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ جانشین کا جھگڑا بھی تاج برطانیہ طے کر سکتا ہے ملک میں نظم و نسق کی نگرانی کی جاتی ہے اگر بدنظمی و بدامنی پھیل جائے تو برطانوی حکومت مداخلت کر سکتی ہے اس طرح اندرونی اور بیرونی طریقہ پر والیان ریاست قوت بالادست کے تحت ہیں۔ لارڈ کرزن کے نظریہ کے تحت ان کے تمام اختیارات تاج برطانیہ کے دیئے ہوئے ہیں اب جبکہ ان کے آس پاس جمہوری طرزِ خیال فروغ پا رہا ہے۔ شخصی حکومت سے نفرت پھیل رہی ہے تو

والیان ریاست بھی اپنے پوزیشن اور تخت و تاج کی حفاظت کے لئے وفاق میں شریک ہو رہے ہیں۔

ریاست حیدر آباد اور مسئلہ وفاق

ہندوستانی والیان ریاست کی نظریں شرکت وفاق کے مسئلہ کے متعلق ریاست حیدر آباد کے طرزِ عمل پر لگی ہوئی ہیں۔ ہماری ریاست کو اس وقت تمام ریاستوں کی لیڈری حاصل ہے کیونکہ اپنی وسعت، جغرافیہ اور آبادی، تاریخی روایات اور عظمت و وقار کے لحاظ سے ریاست حیدر آباد کا سیاسی موقف شاندار اور عظیم المرتبت ہے لہذا ہمارے ارباب مقتدر کو نہایت ہی حزم و احتیاط کے ساتھ آگے قدم اٹھانا چاہیے۔

حیدر آباد کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے ایک خود مختار سلطنت کی حیثیت سے برطانوی سلطنت سے معاہدات کئے ان معاہدات کے ذریعہ یہ طے پایا تھا کہ امور خارجہ کی حد تک ہم حکومت برطانوی ہند کے علم و مشورے کے بغیر کوئی عملی اقدام نہیں کریں گے فوجی انتظامات کے سلسلے میں دونوں حکومتوں سے باہمی امداد اور مدافعت کا اقرار کیا لیکن جملہ معاہدات میں صراحتاً یہ امر درج ہے کہ سلطنت آصفجاہی کے اندرونی معاملات میں حکومت برطانوی ہند کو مداخلت کا کوئی حق نہ ہوگا۔ چنانچہ یہ امر صراحتاً معاہدہ ۱۸۰۰ء کے فقرہ نمبر ۱۵ میں درج ہے جس کے رو سے تاجداران دکن اپنی رعایا یا ملازمین اور اقربا کی حد تک مختار مطلق ہیں حیدر آباد اور حکومت برطانوی ہند کے باہمی تعلقات کے تعین کے لئے فقرہ مذکور ایک اہم ترین اور ناقابل ترمیم معیار ہے۔

اس معاہدہ میں حلیفی کے نام سے یاد کیا گیا ہے جیسا کہ کئی اور موقعوں پر بھی ثابت کیا گیا ہے۔ اس سے ریاست حیدر آباد کا اقتدار اعلیٰ بالکل متاثر نہیں ہو سکتا کسی مشورے کے ماننے کی کوئی پابندی لازمی بھی نہیں ہے باوجود اس تاریخی معاہدہ کے ۱۹۳۰ء کے جدید ترین معاہدہ برار میں ایک سے زائد مرتبہ حیدر آباد کو برطانوی حکومت نے اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) کا مالک تسلیم کیا ہے مثلاً ان ممالک محروسہ میں جو ہزاگزالٹڈ ہائی نس دی نظام آف حیدر آباد کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہیں چند علاقہ جات موسوم بنام برار شامل ہیں حضور نظام حقیقی معنوں میں سلطنت مغلیہ کے جانشین ہیں۔ تاریخ ہند گواہ ہے کہ ابتدا میں انگریزوں اور حضور نظام کے تعلقات ایسے ہی تھے جیسے ایک معطی اور معطی لہ کے ہوا کرتے ہیں برطانوی ہند معروضہ گذرانا کرتی تھی اور خود کو نظام حیدر آباد کی مرضی کا پابند اور ان کے فضل و کرم کا امیدوار و محتاج سمجھتی تھی۔ مسٹر پانیکر نے لکھا ہو کہ:

"انگریزوں کا یہ دعویٰ کہ وہ مغلوں کے جانشین ہیں بے بنیاد اور لغو ہے کیونکہ حکومت برطانوی ہند نے خود یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت حیدر آباد حقوق و فرائض کے لئے حکومت مغلیہ کی جانشین ہے۔"

ہم ریاست حیدرآباد کی خود مختاری ثابت کرنے کے لئے غیروں کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ "ٹائمس آف انڈیا" ۱۴ جنوری ۱۸۷۵ء کی اشاعت میں لکھا ہے : "یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضور نظام معاہدہ پیرس میں جو ۱۷۶۳ء میں طے ہوا تھا بالکل خود مختار شاہ دکن تسلیم کئے جاچکے ہیں جس کا اظہار مجلس نظار نے بھی کیا ہے" "اسٹیٹسمین" یکم جولائی ۱۸۸۱ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ :-

"اندرونی معاملات میں جو خود مختاری حیدرآباد کو از روئے معاہدات حاصل اور محفوظ ہے اُس پر محض اس وجہ سے کہ نواب میر محبوب علی خان بہادر شاہ دکن ابھی کم سن ہیں کوئی اثر نہیں پڑ سکتا"

گورنر جنرل "لارڈ ڈلہوزی" نے ۲۷ مئی ۱۸۵۱ء میں جو یادداشت لکھی ہے اُس میں لکھتے ہیں "ہم اعتراف کرتے ہیں کہ نظام خود مختار ہیں۔ ہم معاہدات کے ذریعہ اپنے کو پابند کرچکے ہیں کہ ہم ان کی حفاظت کریں گے اور ہم نے انکو اُن کی اولاد، رشتہ دار و ملازمین اور رعایا کی حد تک مقتدر کل تسلیم کرلیا ہے لہذا حکومت برطانوی ہند ایماندارانہ طور پر کبھی ایسے آزاد اور خود مختار حاکم پر جبر نہیں کرسکتی اور نہ ہم مجاز ہیں کہ حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں دخیل ہوں"

اگر کوئی قوت یہ دعویٰ کرے کہ وہ معاہدات کی جس طرح تعبیر کرسکتی ہے محض اس وجہ سے کہ وہ قوت دارہی یا اُس کو فوجی برتری حاصل ہے" تو یقیناً یہ نظریہ دنیائے سیاسیات میں ایک تہلکہ ڈال دے گا حقیقت میں سوال اصول کا ہے نہ کہ برتری اور قوت کا لہذا ملک اور حکومت کے حقوق کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور ان کی خود مختاری کے خلاف حکومت برطانوی ہند اگر اپنی حسب مرضی عمل کرے تو یہ کسی طرح درست نہیں ہوسکتا برطانوی ہند کو چاہئے کہ ایمانداری اور انصاف کے نقطہ نظر سے اپنے رویہ کا ثبوت دے۔

حضرت بندگان اقدس جملہ قوانین کا سرچشمہ اور جملہ عدالتی و عاملانہ اقتدار کا منبع و ماخذ ہیں تاجدار دکن حضرت بندگان عالی کے حکم محکم کا مرافعہ کسی دنیاوی عدالت کے روبرو پیش نہیں ہوسکتا یہ ایسا واقعہ ہے جو اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ خسرو دکن ریاست حیدرآباد کے مقتدر اعلیٰ ہیں یہ ہماری آئینی حیثیت ہے اور اس اقتدار کا ایک خاکہ جس کے ہم قانوناً اور انصافاً مستحق ہیں جو از روئے معاہدات حاصل ہونے چاہئے مرور زمانہ کے جو بدعنوانیاں ان باہمی تعلقات میں رونما ہوتی ہیں وہ ہر طرح قابل اصلاح ہیں ہم کو چاہئے کہ جو طریقہ عملدرآمد رائج ہوگیا ہے یعنی قوت بالادست کی اندرونی معاملات میں مداخلت اس کو ختم کردیا جائے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے۔ اپنے معاہداتی حقوق پر اصرار کرنا شیوۂ دوستی کے خلاف نہیں ہے ہمارے جائز اور آئینی حقوق کا مطالبہ، باہمی تعلقات کو صحیح اور پائیدار اصول پہ

منضبط کرنے کی کوشش کسی اعتبار سے بھی اپنے حلیف سے مخالفت کے مترادف نہیں ہوسکتی۔ ہمیں اس امر کے اعلان پر ذرا بھی تامل نہیں کہ ہم حکومت برطانوی ہند کے ایسے دوستانہ تعلقات رکھنے پر قائم ہیں جو دو مساوی الحیثیت ہمسایہ حکومتوں میں ہونا چاہیے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنے شاہی حقوق پر دست اندازیوں کو روا رکھیں شاہی حقوق کے مفہوم کو بھی واضح کر دینا ضروری ہے حیدرآباد میں رعایا اور راعی کا مفاد حقیقتاً مشترک ہے۔

تاجداران آصفی کی تمنا اور کوشش بجز اس کے اور کچھ نہیں رہی کہ حیدرآباد میں امن و خوش حالی اور باعزت زندگی بسر کریں۔ رعایا کی انتہائی تمنا بھی اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے اس مشترکہ تمنا کی تکمیل کے لئے شاہی اقتدارات لازمی ہیں کیونکہ کوئی ذمہ داری اقتدار کے بغیر تکمیل نہیں پاسکتی یہ جداگانہ سوال ہے کہ اقتدارات شاہی کا استعمال کن اصولوں پر مبنی ہو لیکن کوئی ذی شعور حیدرآبادی اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ اقتدارات شاہی کا مرکز حیدرآباد ہی میں رہے اور بلاشرکت غیرے رہے۔

ہماری ریاست حیدرآباد کے تاریخی خصوصیات و روایات ایسے شاندار اور عظیم المرتبت ہیں کہ کوئی دوسری ریاست اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی حکمران حیدرآباد "شاہنشاہانہ حیثیت" کے حامل ہیں ہز ہائی سلطان مکلہ و شحر حیدرآباد کے ایک جاگیردار ملازم ہیں ہز ہائی نس ہولکر مہاراجہ اندور حیدرآباد کے مواضع پارنہ و بابل گاؤں کے موروثی پٹیل ہیں اور اسے پر اصرار کرتے ہیں ہز ہائی نس مہاراجہ جودھپور حیدرآباد کے ایک جاگیردار ہیں اور موضع جونت پورہ ان کو حاصل ہے جے سنگھ پورہ ہز ہائی نس مہاراجہ جے پور کی جاگیر ہے اور ان دونوں ریاستوں کے نمائندے عیدین میں صوبہ اورنگ آباد کو جہاں وہ علاقے ہیں نذر پیش کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت بندگان اقدس کو مسلمانان ہند کی قیادت بھی حاصل ہے ۲۴ جنوری ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں جس میں جارج پنجم آنجہانی کے اپنے دستخط ہیں اس میں یہ تسلیم اور اقرار کیا گیا ہے کہ حضور نظام ہندوستان میں "قائد اسلامی والئی ریاست کی حیثیت سے لطف اندوز ہیں"، جنگ عظیم کے آغاز پر مسلمانان ہند خلیفۃ المسلمین کے خلاف جنگ کرنے سے انکار کر رہے تھے مگر اعلیٰ حضرت نے اعلان شائع کیا جس کے بعد ہندوستان کے مسلمان ترکوں کے خلاف سیاسی جنگ میں شام و فلسطین عراق میں لڑے اور بڑے بڑے مہمات سر کیں۔ نواب فتح علی خاں ٹیپو سلطان کے اور مرہٹوں کے خلاف ہماری ریاست نے انگریزوں کو ہر طرح امداد دی اور بعد ازاں غدر ۱۸۵۷ء جبکہ برطانوی حکومت ہند کا خاتمہ قریب تھا اور بقول

گورنر بمبئی اگر نظام گئے تو ہر چیز ہاتھ سے نکل جائے گی" ایسی صورت میں حضور نظام نے انگریزوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا۔ برطانوی حکومت ہمارے احسانات فراموش نہیں کرسکتی۔ لیکن موجودہ دور میں سیاسی معاشی اور سماجی حالات بدل رہے ہیں اس لئے مشترکہ مفاد کی خاطر برطانوی ہند اور ریاستوں کو آپس میں متحد ہوجانا چاہئے ایسے امور جو برطانوی ہند اور ریاستوں سے متعلق ہیں مثلاً مدافعت، خارجی تعلقات، ضابطہ ٹیارف بورڈ، قانون تجارت، ذرائع حمل ونقل میں ترقی اور صنعتی وسماجی ارتقا میں تمام ہندوستان کو متحد رہنا چاہئے اور ایک ہی طرز عمل اختیار کرنا بھی ضروری ہو ہندوستانی قومیت قایم کرنے کے لئے ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہند کا اتحاد لازمی ہے خسرودکن اعلیحضرت بندگان عالی کی ہمدردی ابتداہی سے وفاق کے ساتھ ہے اور انھیں ایک عظیم ہند کی تخلیق کی توقع ہے وفاق کا نصب العین جاذب نظر بھی ہے حضرت اقدس واعلیٰ نے پہلی گول میز کانفرنس میں اپنا وفد ہ میں ہدایت بھیجا تھا کہ وفاق ہند کے مسئلہ کی طرف ہمدردی لیکن ساتھ ہی دانشمندانہ احتیاط کے ساتھ قدم اٹھائیں اور اس ہدایت کی حیدرآبادی وفد نے نقطہ بہ نقطہ تعمیل کی۔ اور اب تک حضرت اقدس واعلیٰ کی ہمدردی وفاق کے ساتھ ہے۔

سرصدر اعظم بہادر نے اعلان فرمایا تھا کہ شرکت وفاق سے متعلق تصفیہ ہونے سے قبل نوشتہ شرکت اور مسئلہ وفاق کے بارے میں ایک زرد کتاب شائع کی جائے گی تاکہ عوام الناس کو اطلاع دی جاسکے اور رائے عامہ معلوم کی جاسکے رائے عامہ تسلیم کی جائے گی اور محبان وطن کے مشوروں پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔ صورت حال یہ ہے کہ محبان وطن کا تعلیم یافتہ طبقہ خاموش ہے زرد کتاب کی اشاعت کے بعد جس کا وعدہ کیا گیا ہے اظہار خیال کیا جائے گا۔

سر رشتہ ڈاک میں تقریر کرتے ہوئے سرصدر اعظم بہادر نے فرمایا تھا کہ" ابتدائے گول میز کانفرنس سے اس وقت تک حکومت سرکار عالی نے یہ صاف طور پر واضح کردیا ہو کہ وہ ڈاک کے حقوق سے جسے وہ علامت اقتدار سمجھتی ہے دستبردار ہونا تو درکنار اس میں کسی قدر ضعف پیدا ہونے کو گوارا نہ کرے گی" اس اقتباس سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ اگر ریاست حیدرآباد شریک وفاق ہو تو ڈاک کا کامل تحفظ کرلیا جائے گا۔ دوسرے موقع پر عدالت العالیہ میں بہ دوران تقریر فرمایا تھا کہ "میر مجلس عدالت العالیہ اپنے تقریر میں اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ عدالت کو بیرونی مداخلت سے آزاد اور محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے اور اس کے جواب میں بحوالہ دفعات قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یقین دلایا گیا کہ ایسی مداخلت وفاقی عدالت کی جانب سے نہ ہوگی" سرصدر اعظم کا یہ یقین دلانا کہ عدالت میں وفاقی عدالت

مداخلت نہ کرے گی اور دوسرے یہ کہ وفاقی عدالت کا بھی خیر مقدم کرنا یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ شرکت وفاق کے موقع پر عدالت کا بھی تحفظ کیا جائے گا ان مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد وفاق ہند میں شریک ہو رہی ہے اسی وجہ سے عوام الناس میں ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب پیدا ہوگیا تھا ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں تھیں رائے عامہ اس غلط ترجمانی کے خلاف ہو رہی تھی اور والسرائے بہادر کی آمد اور طویل قیام سے یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ ریاست حیدرآباد وفاق ہند میں شریک ہو جائے گی مگر حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ حکیم السیاست کا تدبر کس طرح سے رعایا کی صحیح ترجمانی کر سکتا ہے۔ آفتاب تدبر و سیاست کے مقابلے میں دشمنوں کی مٹھی بھر دشمنی کا وجود عدم مساوی ہے اعلیٰحضرت بندگان عالی نے والسرائے بہادر کی آمد پر جو محلہ مبارک کی ضیافت کے موقع پر اپنی تقریر دلپذیر کے ذریعہ نہ صرف وابستگان دولت آصفیہ کی ترجمانی کی بلکہ نا امیدی و یاس کو امید و اور تمناؤں سے بدل دیا رعایا کے قلوب اپنے شاہ ذیجاہ کی تقریر سے شاد ہوگئے۔

اعلیٰحضرت حکیم السیاست نے اپنی زبان حکمت نشان سے بدوران تقریر فرمایا کہ "ابتدا میں میرے پیش نظر جو نصب العین تھا وہی آخر تک قایم رہے گا یعنی اس عظیم الشان تاریخی ریاست کی رعایا کی فلاح و بہبود۔ جب وفاق کی مکمل تصویر ہمارے سامنے ہوگی اس وقت قبل ازیں کہ میں مہتم بالشان فیصلہ کروں میری رعایا کو جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے ان مسائل کے مطالعہ اور اپنی تمناؤں کے اظہار کا موقع دیا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا اقتدار اعلیٰ اور میرے معاہداتی حقوق بہر صورت محفوظ ہیں خانوادہ آصفیہ کی میراث کا محافظ ہونے کی حیثیت سے اس مقدس امانت کے متعلق خاص حقوق و روایات ہیں ان کے تحفظ کا خیال لازماً میرا دامنگیر رہے گا"

اعلیٰحضرت بندگان عالی نے بجا طور پر "اقتدار اعلیٰ" اور "معاہداتی حقوق" پر زور دیا ہے اور اپنی سب سے مایوس ہو کر آپ ہی کے ذات والاصفات سے ساری آرزوں کو وابستہ رکھنے والی رعایا کو جس کے موجودہ تردد و تشویش کی نظیر شاید اس سے قبل نہیں مل سکیگی یہ یقین دلایا ہے کہ جتنے خاص حقوق و روایات ہیں ان کے تحفظ کا خیال لازماً دامنگیر رہے گا" حضور والا کی رعایا کو بھی حضرت ظل سبحانی و آیہ رحمانی کے "اقتدار اعلیٰ" اور "معاہداتی حقوق" کی افادیت پر اتنا شدید اعتماد ہے کہ وہ دل سے ان کی حفاظت و صیانت کی آرزو ہے اور انھیں عملی صورت میں نہایت آزاد دیکھنا چاہتی ہے۔

خواجہ معین الدین متعلم سال چہارم

نوجوان سے خطاب!

بیگانۂ رسمِ دہر ہو جا　　تو ذرہ ہے گر تو مہر ہو جا
موجوں کی طرح رواں دواں ہو　　تو خاک ہے گر تو پرفشاں ہو
پیمانۂ مثال بے کراں بن　　تو غنچہ ہے گر تو گلستاں بن
دنیا سے بسانِ بو گذر جا　　آوارۂ دشت کام کر جا
پھولوں سے نشاطِ زندگی سیکھ　　اے موجِ ہوا سبک روی سیکھ
برق افگنِ قید و بند ہو جا　　پستی سے نکل بلند ہو جا
اُٹھ پردۂ کیف و کم اُٹھا دے　　دنیا سے بساطِ غم اُٹھا دے
ہر ذرہ کو آفتاب کر دے　　ہر جلوے کو بے نقاب کر دے

دھوکا ہے فنائے زندگانی　　غافل ہستی ہے جاودانی
محروم نہیں نگاہ محرم　　ذرہ میں لبسا ہوا ہے عالم

پیغام حیات سرمدی کا
خود موت ہے راز زندگی کا

کس درجہ بسیط ہیں فضائیں　　کس درجہ لطیف ہیں ہوائیں
عرفان حیات زندگی ہے　　فطرت پردہ الٹ رہی ہے
اب زندگی و عدم ہیں کچھ اور　　اس راہ کے پیچ وخم ہیں کچھ اور
سوکھی ہوئی شاخ پھل رہی ہے　　دنیا چولا بدل رہی ہے
آئندہ کا راز کس نے جانا　　ماضی بھولا ہوا فسانہ

ہم حال میں سانس لے رہے ہیں　　خود درس حیات دے رہے ہیں
نقطہ سے ہے دائرہ کی ہستی　　بستی ہے اسی طرح سے بستی
آئین کہن شکستہ پا تھا　　وہ خواب کہ ہمت آزما تھا
دنیا منزل تک آچکی ہے　　آلام دوش اٹھا چکی ہے
گم کردہ ظلمت گراں ہیں　　ہم رفتہ گرد کارواں ہیں
مطلوب ہے گر نشان منزل　　مقصود ہے گر سکون ساحل

آہستہ روی ہے موت کا نام
آپہونچا ہے دوڑنے کا ہنگام

سُن لیں یہ سبھی حقیقت اندیش
تعمیر کا مرحلہ ہے درپیش

تخریب کا ساز چھڑ چکا ہے
ایوانِ قدیم گر رہا ہے

گمراہ کرے نہ فکرِ باطل
تقلید کی مے ہے زہرِ قاتل

پندارِ خود آزما سے ہوشیار
اس فتنۂ نا سزا سے ہوشیار

جو کیفِ طرب کا راز ہوگا
وہ بادہ خانہ ساز ہوگا

کھودے نہ کہیں خوش اعتقادی
مشرق کی حیاتِ انفرادی

اغیار کے ساغروں میں پینا
ہے ننگِ زمانہ بن کے جینا

یوں فکرِ اصول تو بنائے
سارے عالم کو رشک آئے

یہ دورِ شباب امتحاں ہے
منزل کا نشاں ابھی کہاں ہے

تسلیم

*

مادّہ ایک معمّہ ہی — ناقابلِ حل

(ماخوذ از جے۔ ڈبلو۔ این سلیوان (J. W. N Sullivan

آگ ایسی چیز ہے جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ سب سے پہلے حضرت انسان کو کب اس چیز سے سابقہ پڑا۔ مگر از منۂ قبل تاریخ کی چیز ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح عرق انگور کی تخمیر، دھاتوں کی صفائی اور سنگی مجسموں کا تراشنا بھی تاریخ سے قبل کے علوم معلوم ہوتے ہیں۔ قدیم مصری، مختلف فنون اور صنعتوں سے کافی واقف تھے۔ چنانچہ وہ روغنیات اور چہرہ کے لئے غازہ بنانے پر قادر تھے۔ لوہا ڈھالنا، شیشہ سازی اور دھاتوں کی ملمع کاری بھی ان میں رائج تھی۔ ظاہر ہے کہ اس منزل پر پہونچنے سے قبل ان کو علم کیمیا نیز طبیعیات سے ایک حد تک واقفیت حاصل کرنی پڑی ہوگی۔ نظری مسائل کی چھان بین سب سے پہلے یونانیوں نے شروع کی تھیلز (Thales) نے دریافت کیا کہ قدرت میں ایک طرح کی دوریت سی پائی جاتی ہے۔ ہوا، مٹی اور پانی کا ایک دور ہوتا ہے جو پودوں اور حیوانات کے اجسام میں سے ہوتا ہوا پھر ہوا میں پہونچ جاتا ہے۔ پودوں اور حیوانات کی غذا اس کے خیال کے بموجب رطوبت ہے اور اس لئے ہر شئے میں پانی موجود رہتا ہے۔ کسی میں تکثیف کی حالت میں اور کسی میں تلطیف (Rarefaction) کی حالت میں۔

مادی کائنات کی سب سے اہم خصوصیت اس کا تنوع ہے۔ ذرا آنکھ اٹھائیے دیکھئے بیک وقت،

آہستہ روی ہے موت کا نام　　　آپہونچا ہے دوڑنے کا ہنگام
سُن لیں یہ سبھی حقیقت اندیش　　　تعمیر کا مرحلہ ہے درپیش
تخریب کا ساز چھڑ چکا ہے　　　ایوانِ قدیم گر رہا ہے
گمراہ کرے نہ فکرِ باطل　　　تقلید کی مے ہے زہرِ قاتل
پندارِ خود آزما سے ہوشیار　　　اس فتنۂ ناسزا سے ہوشیار
جو کیفِ طرب کا راز ہوگا　　　وہ بادہ خانہ ساز ہوگا
کھو دے نہ کہیں خوش اعتقادی　　　مشرق کی حیاتِ انفرادی
اغیار کے ساغروں میں پینا　　　ہے ننگِ زمانہ بن کے جینا
یوں فکرِ اصول تو بنائے　　　سارے عالم کو رشک آئے

یہ دورِ شباب امتحاں ہے
منزل کا نشاں ابھی کہاں ہے

تسلیم

مادّہ ایک معمّہ ہی ــــ ناقابلِ حل

(ماخوذ از جے۔ڈبلو۔این سلیوان J. W. N Sulliv-an)

آگ ایسی چیز ہے جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ سب سے پہلے حضرت انسان کو کب اس چیز سے سابقہ پڑا۔ مگر ازمنۂ قبل تاریخ کی چیز ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح عرق انگور کی تخمیر، دھاتوں کی صفائی اور سنگی مجسموں کا تراشنا بھی تاریخ سے قبل کے علوم معلوم ہوتے ہیں۔ قدیم مصری، مختلف فنون اور صنعتوں سے کافی واقف تھے۔ چنانچہ وہ روغنیات اور چہرہ کے لئے غازہ بنانے پر قادر تھے۔ لوہا ڈھالنا، شیشہ سازی اور دھاتوں کی ملمع کاری بھی ان میں رائج تھی۔ ظاہر ہے کہ اس منزل پر پہونچنے سے قبل ان کو علم کیمیا نیز طبیعیات سے ایک حد تک واقفیت حاصل کرنی پڑی ہوگی۔ نظری مسائل کی چھان بین سب سے پہلے یونانیوں نے شروع کی۔ تھیلز (Thales) نے دریافت کیا کہ قدرت میں ایک طرح کی دوریت سی پائی جاتی ہے۔ ہوا، مٹی اور پانی کا ایک دور ہوتا ہے جو پودوں اور حیوانات کے اجسام میں سے ہوتا ہوا پھر ہوا میں پہونچ جاتا ہے۔ پودوں اور حیوانات کی غذا اس کے خیال کے بموجب رطوبت ہے اور اس لئے ہر شئے میں پانی موجود رہتا ہے۔ کسی میں تکثیف کی حالت میں اور کسی میں تلطیف (Rarefaction) کی حالت میں۔

مادی کائنات کی سب سے اہم خصوصیت اس کا تنوع ہے۔ ذرا آنکھ اُٹھایئے دیکھئے بیک وقت،

پانی، بادل، درخت، مٹی، چٹان، گھاس، پھول، خود ہمارا جسم اور لباس، غرض کتنی چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال قدرتاً ہمارے دل میں پیدا ہوگا کہ اتنی مختلف اشیاء کی کس طرح سے جماعت بندی کیجائے۔ یونانیوں کو سب سے پہلے مختلف قسم کے مادوں کی مختلف شکلوں اور کثافتوں نے متاثر کیا اور اس لئے انہوں نے مادہ کی چار قسمیں کیں جنکو کثافت کی کمی کے اعتبار سے اس طرح لکھ سکتے ہیں۔ مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ آگ کو بھی وہ نہایت لطیف قسم کا مادہ تصور کرتے تھے۔

اب چونکہ مادہ کی مختلف اقسام کے مابین امتیازی فرق کثافت کو قرار دیا گیا اسلئے ظاہر ہے کہ ان چار عناصر میں سے کسی ایک کو منبع اور بقیہ کو اسکے مشتقات ہونا چاہئے۔ مشتقات اسی کی تکثیف یا تلطیف سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ تھیلز نے پانی کو منبع تصور کیا، انیکسمینس (Anaximenes) نے ہوا کا انتخاب کیا اور ہرقلیطوس (Heraclitus) کے نزدیک آگ تمام کائنات کی جڑ تھی —— نہایت ہی لطیف قسم کی اثیری آگ جسے وہ کائنات کی روح سمجھتا تھا —— لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی تسلیم کیجاتی تھی کہ یہ چاروں عناصر ایک دوسرے کے تابع نہیں ہیں۔ صقلیہ (Sicily) کے فلسفی امبیدا قلس (Empedocles) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تمام اشیاء جن سے ہم کو سابقہ پڑتا ہے ان ہی چاروں عناصر کے اجتماع سے بنتی ہیں البتہ تناسب بدلتا رہتا ہے اور تناسب کا حصر دو مخالف قوتوں —— جذب و دفع —— پر ہے۔ انسانی فطرت میں یہی قوتیں محبت اور نفرت کے جذبات برانگیختہ کرتی ہیں۔

یونانی علماء کے خیال کے بموجب جلنے سے چیز اپنے اجزائے ترکیبی میں بٹ جاتی ہے۔ مصری لکڑی جلائی جائے تو آگ پیدا ہوتی ہے، کچھ دھواں فضاء میں اڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور لکڑی کے سرے پر پانی کے بلبلے بننے لگتے ہیں۔ آخر کار ذراسی راکھ اس ظلم کی نشانی کے طور پر باقی رہ جاتی ہے۔ جو بظاہر مٹی کی ہم جنس معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد ہی غلط ہے کیونکہ احتراق کا جو مفہوم اسمیں مضمر ہے وہ سراسر ناقص ہے۔ احتراق کی ماہیت بھی صدیوں تک ہماری نظر سے پوشیدہ رہی۔

یوں تو دماغ کی ایک اور اہم پیداوار۔ دیمقراطیس (Democritus) کا نظریۂ جواہر ہے۔ مادہ کے ایک ٹکڑے پر اگر مسلسل تقسیم کا عمل جاری رکھا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اس کے تمام خواص برقرار

رہیں گے ؟ کیا شکر کا نہایت چھوٹا ریزہ بھی میٹھا ہوتا ہے ؟ یونانی علماء میں سے بعض کا خیال تھا کہ مادہ کے خواص ناقابل تصرف ہیں۔ تقسیم کا عمل جس حد تک چاہیں جاری رکھئے مثلاً پانی نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ اس زاویہ نگاہ کا یہ ہوا کہ مادہ کی تقسیم ناممکن سمجھی جانے لگی۔ دیمقراطیس اس نظریہ کے خلاف تھا۔ اس کے الفاظ ہیں "عام مسلمات کے بموجب بعض چیزیں شیریں ہیں اور بعض تلخ ہیں۔ بعض گرم ہیں اور بعض سرد۔ علاوہ بریں رنگ بھی ایک چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں چیزیں صرف دو ہیں۔ ایک جوہر اور دوسرے خلا" اس کے خیال کے بموجب تمام جواہر ایک ہی مادہ کے ہوتے ہیں البتہ جسامت اور شکل میں اختلاف ممکن ہے۔ مادہ کی مختلف اقسام اس وجہ سے نظر آتی ہیں کہ ہر ایک مختلف شکل اور جسامت کے جوہروں پر مشتمل ہے۔

یہ نظریہ موجودہ نظریہ جواہر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے البتہ بعض باتوں میں عدم مشابہت ہے۔ سائنس کے نقطۂ نظر سے تو یہ نظریہ اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکا جب تک کہ کیفیت کے ساتھ اس کو کمیت کا جامہ نہیں پہنایا گیا۔ موجودہ نظریہ کے ساتھ یہ اس حد تک ہم آہنگ ہے کہ دونوں کی رو سے مادہ کی اصلی دنیا اس رنگین دنیا سے بالکل مختلف ہے جو حواس خمسہ سے محسوس ہوتی ہے۔ اور یہیں سے اصلی دنیا ایک بیرنگ تیین کی شکل میں ہمارے تخیل میں داخل ہوئی جس میں نہ تو بو ہوتی ہے اور نہ ذائقہ یا آواز

موجودہ کیمیا کے پیش رو کیمیاگروں یعنی (alchemists) کو بھی مادہ کی جماعت بندی میں چند در چند مشکلات سے سابقہ پڑا۔ وہ لوگ رنگ کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر کسی دھات کا رنگ سونے کی طرح بنا دیں تو وہ سونے میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ خیال ایک عام طرز نظر کا نتیجہ تھا۔ افلاطون کے فلسفہ کی رو سے یہ بات مسلم تھی کہ کسی چیز کی حقیقت ان خیالات میں مضمر ہے جو ہمارے دماغ پر اس کی وجہ سے طاری ہوتے ہیں۔ آدمی کی قیمت جس طرح اس کی روح کی نوعیت کے لحاظ سے بدلتی ہے نہ کہ جسم کے گوشت کے لحاظ سے، اسی طرح خواص کے مقابلہ میں ہم مادہ کی مادیت کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ علم نجوم میں خاص خاص روحانی خصوصیات کے حامل ہیں اسی طرح دھاتیں بھی ویسی ہی خصوصیات سے متصف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کیمیا والوں نے فلکی اجسام اور دھاتوں میں ایک واضح ربط پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ سونے کو آفتاب کا ارضی نمائندہ سمجھتے تھے اور چاندی کو چاند کا خیال تصور کرتے تھے۔

کیمیا دانوں کا یہ خیال کہ مادّہ اپنے خواص سے بنتا ہے، اور اسی بنا پر یہ کوشش کہ اشیا کے خواص میں تبدیلی کرنے سے خود ان میں تغیر ہو جاتا ہے ایک لحاظ سے غلط نہیں ہے۔ البتہ یہ بات عجیب ہے کہ رنگ کی ان کے نزدیک غیر معمولی اہمیت تھی۔ مشہور عالم طبیعیات اور طبیب بوعلی سینا اپنے اس خیال میں بالکل منفرد تھا کہ دھاتوں کا باہمی فرق رنگ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گہرا ہے۔ اور صرف رنگ کی تبدیلی سے ایک دھات دوسری میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے باوجود رنگ کی اہمیت بدستور باقی رہی۔ مشہور کیمیائی نظریہ، جس کی بنیادیں گندک، پارا اور نمک ہیں، وہ بھی رنگ کی اہمیت سے منحرف نہ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ پارا اور گندک کی ترکیب سے چمکدار سرخ سلفائڈ بنتا ہے اس سے خیال ہوا کہ کوئی دھات اس رنگ کی ایسی ضرور موجود ہے جو سفید چاندی اور زرد سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر گندک اور پارے کو عمومی اہمیت دے کر ان سے اصول وضع کرلئے گئے۔ گندک کو آگ کا مبدا سمجھا گیا اور خیال ہوا کہ یہ گندک ہی ہے جو کسی شئے کو احتراق پذیر کردیتی ہے اور چیز کے جلنے پر گندک ہی غائب ہو جاتی ہے۔ پارے کی رقت کے باعث اس کو سیالوں کا مبدا تصور کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ پارا ہی ہوتا ہے جو جلنے والی شئے کے ایک حصہ کو مائع کی شکل میں کشید ہونے کا موقع دیتا ہے۔ نمک کو ٹھوس اشیا کا مبدا گردانا گیا اور خیال گذرا کہ کسی چیز کے جلنے پر بطور ثفل نمک ہی باقی رہ جاتا ہے۔ یہ زاویۂ نگاہ سترہویں صدی کے وسط تک عام رہا۔

(۲)

رابرٹ بائل نے سب سے پہلے یہ خیال ظاہر کیا مادی اشیا کی جماعت بندی کسی دوسری بنیاد پر ہونی چاہئے اس نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حرارت کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اشیا کو ان کے اجزا میں تحلیل کردے۔ مختلف درجہ ہائے حرارت کے اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اور اکثر اوقات ختم تعامل پر ہمارے پاس ایک نہایت ہی پیچیدہ چیز باقی رہ جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سونے کو ماء الملوک میں حل کردیں تو پھر اسے اصلی شکل میں حاصل کرسکتے ہیں اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ سونا جواہر پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ جواہر حل پذیری کے دوران میں بلا تغیر قائم رہتے ہیں۔ اسی بنا پر اس نے اپنا یہ خیال باصرار پیش کیا کہ تمام اشیا بعض ممتاز اور مستقل اشیا سے مرکب ہیں یہیں سے عناصر اور مرکبات میں بنیادی فرق قائم ہوا جو کیمیا کی جان ہے۔

مادی اشیا کی یہ نئی جماعت بندی آئندہ ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی چنانچہ عرصہ تک اس بات کی

چھان بین ہوتی رہی کہ کون سی چیزیں عناصر ہیں اور کون اشیا مرکبات ہیں۔ احتراق کا معمہ ابھی تک حل ہونا باقی تھا۔ لازما اس کی وجہ سے ترقی میں رکاٹیں پیش آئیں۔ جب کوئی چیز جلتی ہے تو اس میں سے دھواں سا خارج ہوتا ہے۔ قرون اولیٰ کے کیمیا داں اس دھوئیں کو گندک سمجھتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں اس کا نام فلوجسطون (Phlogiston) رکھا گیا۔ اور اس کی عجیب خصوصیت یہ قرار دی گئی کہ اس میں منفی وزن ہوتا ہے۔ کسی جسم میں اس کا اضافہ ہو تو جسم ہلکا پڑ جاتا ہے۔ یہ خصوصیت بالکل لازمی تھی کیونکہ بائل (Boyle) پہلے بتا چکا تھا کہ دھاتی اشیا جلتی ہیں تو حاصل شدہ بھوس کا وزن اصل دھات کے وزن سے زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی دھاتی شئے میں سے فلوجسطون نکل جائے تو وہ بھاری ہو جاتی ہے اس لئے فلوجسطون کا وزن صفر سے کم ہونا چاہئے

بائل کی تحقیقات سے معلوم تھا کہ ہوا مادی شئے ہے اور وزن دار بھی ہے لیکن یہ گیسوں کا آمیزہ ہے یا بسیط شئے ہے یہ دریافت طلب تھا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کے پاس گیسوں میں لے دے کے صرف ایک ہوا تھی اور کسی گیس کا علم بھی نہ تھا۔ پریسٹلی اور ہنری کیونڈش کے جیسے ذہین لوگ بھی فلوجسطون کے نظریہ کے اس حد تک قائل تھے کہ پانی کو اس کے اجزا میں تقسیم کر لینے کے باوجود کیونڈش آکیجن اور ہائیڈروجن کو ایک ہی چیز سمجھتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کی ترقی میں جتنی رکاوٹ اس فلوجسطون کے نظریہ سے پیدا ہوئی اتنی کسی اور چیز سے نہیں ہوئی۔

لاوآزیے (Lavoisier) نے احتراق کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے وزن اور پیمایش سے مدد لی۔ اس نے ایک بند برتن میں جس کی ہوا کا وزن معلوم تھا، پارے کی وزن کردہ مقدار گرم کی۔ ہوا میں کمی ہو گئی اور پارے پر سرخ سرخ زنگ بن گیا۔ اس زنگ کو گرم کیا تو پارہ پیدا ہوا اور ایک گیس خارج ہوئی۔ آزاد شدہ گیس اس کمی کے برابر تھی جو ہوا میں ہوئی تھی۔ لاوآزیے نے معلوم کیا کہ زنگ بننے کے بعد جو ہوا برتن میں باقی رہ گئی وہ احتراق میں ممد نہیں تھی اور نہ تنفس میں مدد دیتی تھی۔ برخلاف اس کے زنگ سے آزاد ہونے والی گیس تنفس میں بھی معاون تھی اور احتراق کو بھی برقرار رکھتی تھی۔ لاوآزیے کہتا ہے "اس تجربہ کے حالات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ پارا، گرم ہونے پر، فضا کا وہ حصہ جذب کر لیتا ہے جو احتراق اور تنفس میں مدد دیتا ہے اور باقی ماندہ شئے نہ تو تنفس میں معاون ہے اور نہ احتراق میں۔" اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ فضا کی ہوا دو ایسے لچک دار سیالوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے کی مخالف نوعیت کے ہیں۔ اس تجربہ سے فلوجسطون کا نظریہ ہمیشہ کے لئے زندہ درگور ہو گیا۔

یہ رکاوٹ ایک مرتبہ راستہ سے ہٹ گئی تو مادہ کی جماعت بندی میں باقاعدہ ترقی شروع ہوگئی۔ چنانچہ یہ معلوم کیا گیا کہ ایک ہی شئے تین مختلف حالتوں ـــــ ٹھوس، مائع اور گیس ـــــ میں رہ سکتی ہے۔

یہ نظریہ کہ تمام اشیاء چھوٹے چھوٹے ناقابل تقسیم ذرات پر مشتمل ہوتی ہیں بہت ہی قدیم تھا۔ یونانی اس سے واقف تھے اور موجودہ سائنٹفک دور کے بانی، گیلیلیو، نیوٹن اور بائل بھی اس کو ایک حد تک صحیح تصور کرتے تھے۔ لیکن اب مانچسٹر کے ایک مدرس جان ڈالٹن کی محنتوں سے یہ بارآور ہوا اور اس میں کیفیت کے ساتھ ساتھ کمیت کا عنصر بھی داخل کیا گیا۔ ڈالٹن نے عناصر اور مرکبات میں نہایت ہی واضح امتیاز پیدا کردیا اس نے کہا کہ مرکب اشیاء دو یا دو سے زیادہ عناصر سے مبنی ہیں۔ ڈالٹن کے زمانے میں صرف بیس عناصر معلوم تھے۔ آج ہم کو بانوے (۹۲) عناصر کا علم ہے۔ ڈالٹن نے اپنے جوہری نظریہ کی گئی بنیاد یہ قرار دی کہ مختلف اشیا کے جوہروں کے اوزان مختلف ہوتے ہیں۔ نیز کسی خاص مرکب کی پیدائش کے لئے عناصر ہمیشہ ایک خاص تناسب میں ترکیب کھاتے ہیں۔

نظریۂ جوہر کو بنیاد مان کر آج مختلف اشیاء کو بانوے (۹۲) عناصر میں تقسیم کرلیا گیا ہے لیکن کیمیا آج تک اس گتھی کو سلجھا نہ سکی کہ مادی دنیا کن اصولوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ موجودہ دور کے کیمیا دانوں نے بیچیدہ اشیاء کو مختلف سادہ تر چیزوں میں تقسیم کردیا لیکن اس کے باوجود کائنات کے معمہ کو حل نہ کرسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کیمیا ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور زیر بحث مسائل بغیر طبیعیات کی مدد کے صاف نہیں ہوسکتے۔ کیمیا سے ہم کو سب سے اہم چیز جو ملی وہ یہ ہے کہ جوہر بھی ایک چیز ہوتی ہے اور کیمیا دانوں کا "جوہر" سخت ٹھوس قسم کا ذرہ ہوتا ہے جو غالباً کروی شکل کا مالک ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے جوہر اس ذرہ سے بہت مختلف ہے۔

مادہ کو جواہر میں تقسیم کرلیا گیا تو لوگ سمجھنے لگے کہ تحقیق معراج کمال پر پہنچ گئی لیکن یہ بات واضح نہ ہوسکی کہ جوہر کی ایک نہ دو بانوے (۹۲) اقسام کیوں ہیں؟ بعض علماء نے یہ خیال پیش کیا کہ جوہر کی ساخت اس قدر سادہ نہیں ہے جتنی کہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ بعض عناصر کو بعض خاص عناصر سے زیادہ رغبت ہے۔ اس سے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ ان عناصر کے جواہر کی ساخت یکساں ہوگی۔ جوہر کا وزن معلوم کیا گیا تو فوراً خیال پیدا ہوا کہ تمام جواہر کی ترکیب میں ہائیڈروجن کا جوہر شامل ہے کیونکہ ہائیڈروجن سب سے ہلکا عنصر ہے۔ یعنی تمام مادہ حقیقت میں ایک ہی ـــــ یعنی ہائیڈروجن تحقیقات کا دائرہ اور بڑھا تو معلوم ہو کہ اوزان جوہر سے اس نظریہ کی تصدیق نہیں ہوتی اور اس لئے کیمیا دانوں کو مادے کی بانوے (۹۲) مختلف اقسام ماننے پڑے۔ اس سے

قدرت کے ناقابل حل تنوع کا بھی پتہ چلتا ہے۔

(۳)

موجودہ دور ایک لحاظ سے ۱۸۹۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان ایسی ایسی تحقیقات کی گئیں جنہوں نے مادہ کے متعلق ہمارے تمام خیالات کی کایا پلٹ دی۔ اور طبیعیات کا جو مطلب اور مقصد ہم نے قرار دیا تھا اس میں بھی تغیر کرنا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پانچ سال کا زمانہ طبیعیات کی دنیا میں انقلاب عظیم کا زمانہ تھا۔ سب سے پہلا تجربی مظاہرہ یہ ہوا کہ ہائیڈروجن کے جواہر سے بھی چھوٹے ذرات موجود ہیں اور یہ ذرات برقائے ہوئے ہوتے ہیں۔ شیشہ کی ایک ہنڈلی کے دونوں سروں پر دو دھاتی برقیرے قائم کر کے اس میں تقریباً کامل خلا پیدا کر دیا گیا۔ اب اس میں سے برقی رو گذاری گئی تو برقاسے ہوئے ذرات پیدا ہوئے۔ مشاہدہ سے کسی چیز کی ایک دھار خط مستقیم میں نلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی ہوئی معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دھار کی بڑی مقدار ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل تھی جو برقائے ہوئے تھے اور ہائیڈروجن کے جوہر کے ۱/۱۸۰ گنے تھے بظاہر اس انکشاف میں کوئی بات انقلاب انگیز معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ خود ہائیڈروجن کے جوہر اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کا تصور ہم نہیں کر سکتے۔ اب یہ کہنا کہ ان سے بھی چھوٹے ذرات موجود ہیں ظاہر ہے کہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن قابل غور چیز یہ تھی کہ یہ ذرات برقائے ہوئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان ذرات یعنی برقیوں پر مزید تحقیق کی گئی تو مادہ کے متعلق ہمارے تخیلات کی ساری عمارت مسمار ہو گئی۔

ریاضی استدلال سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کسی جسم کو برقا دیا جائے تو اس کا سلوک ایسا ہو جاتا ہے گویا اس کی کمیت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے اب یہ بات مرکز توجہ ہو گئی کہ برقیہ کا کس قدر وزن اس کے برقی بار کی وجہ سے ہے پیمائش سے یہ حیرت خیز نتیجہ برآمد ہوا کہ برقیہ کی ساری کمیت اس برقی بار کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی برقیہ برقی بار کے سوا اور کچھ نہیں مادیت اس میں مطلق نہیں ہوتی۔ یہ نتیجہ نہ صرف تحیر خیز اور دلچسپ ہے بلکہ ایک خاص اہمیت بھی اس کو حاصل ہے۔ موجودہ سائنس کا یہ سب سے پہلا اشارہ اس امر کی جانب تھا کہ دنیا اس قسم کی مادی شئے نہیں ہے جیسی ہم تصور کرتے آئے ہیں۔ مادہ بتدریج ایک طیفی (spectral) چیز میں تبدیل ہونے لگا۔

اس نئے نظریہ کو فی الفور شرف قبول حاصل نہیں ہوا کیونکہ بہت سے قدامت پسند لوگ یہ بیان تسلیم کرنے کیلئے

تیار نہ تھے کہ برقی بار موجود ہے لیکن کسی مادی رہوا پر سوار نہیں ہے بلکہ آزاد ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ ہم حرکت کا ذکر کریں لیکن یہ نہ بتائیں کہ حرکت کرنے والے جسم کا کوئی وجود ہے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انکشاف کو اس وقت تک ذرا سمجھنا مشکل ہے جب تک مادہ کے متعلق ہمارے تصورات مجرد (Abstract) نہ ہو جائیں۔ اب ہم کو مادہ کے تخیل کی بجائے "سلوک" کا تخیل داخل کرنا پڑے گا۔

مادہ کے نئے تصور کی تمثیل ذرا مشکل ہے۔ کسی شئے میں سختی، ٹھنڈک اور رنگ وغیرہ خواص موجود ہو سکتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ شئے ـــــ وہ مادہ ـــــ کیا چیز ہے جو ان خواص کی مالک ہے۔ شئے سے اگر ہم اس کے خواص چھین لیں تو باقی کیا رہ جائے گا۔ جب ہم مادہ کے اس تخیل پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کا تصور ہماری اس اعصابی کوشش سے کوئی نہ کوئی ربط ضرور رکھتا ہے جو اس کا احساس کرتے وقت ہم کو کرنا ہوتی ہے اس قسم کے مادہ میں صرف جمود کی خاصیت ایسی ہے جسے ہم سائنٹفک کہہ سکتے ہیں اور جس کی پیمائش ممکن ہے۔

کوئی چیز متحرک ہو یا ساکن تا وقتیکہ اس پر کوئی بیرونی قوت عمل نہ کرے اس کی یہ حالت بدل نہیں سکتی مادہ کی اس خاصیت کو "جمود" کہتے ہیں یہ ایسی خاصیت ہے جس سے مادہ کی مادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ نور کو پہلے مادیت سے مبرا سمجھا جاتا تھا لیکن اب چونکہ ہم کو معلوم ہے کہ نور جس جسم پر واقع ہوتا ہے اس پر دباؤ عائد کرتا ہے اب ہم کو اس کے ساتھ مادیت کا تخیل آمیز کرنا پڑے گا۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ برقیوں میں بھی جمود کی خاصیت ہوتی ہے ہم کو یہ تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہئے کہ برقیے، جو برق کے غیر مجسم بار ہیں، مادہ کی طرح عمل کر سکتے ہیں۔ ان کا سلوک یہاں مادہ کے مماثل ہے۔ بعض اور صورتوں میں بھی برقیے مادی ذرات کی طرح سلوک کرتے ہیں۔ مثلاً برقیہ جگہ گھیرتا ہے اور عملی ضروریات مکان[1] (Space) کے ایک حصہ میں ہمیشہ واقع رہتا ہے۔ ہم نے "عملی ضروریات" کے الفاظ خاص طور سے استعمال کئے ہیں کیونکہ نظری طور پر برقیہ کا اثر مکان میں ہر سمت میں لامتناہی تک پھیلا ہوا رہتا ہے لیکن ایک خاص فاصلہ کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا۔ برقیہ حرکت کا بھی اہل ہے۔ اور مکان میں اس کا راستہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ ان خصوصیات کا لحاظ رکھیں تو ہمارے لئے اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ برقیہ واقعی مادہ کی طرح سلوک کر سکتا ہے۔ اس بیان میں قدرے ترمیم کی ضرورت ہے لیکن فی الحال ہمارے لئے یہی کافی ہے۔

---

[1] مکان کا لفظ آئندہ جس جگہ بھی استعمال ہو قارئین اس سے (Space) مراد لیں۔

اور جس قسم کے مادہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تصور ہمارے دماغ کے لئے ناقابل برداشت بار نہیں ہے۔ ہم اس منزل پر بلا کسی فاش غلطی کے برقیہ کو کرۂ جسم تصور کر سکتے ہیں۔ اب ہمیں مادہ کی ایسی تصویر بنانا ہے جو برقیوں پر مشتمل ہو ساتھ ہی مادہ کی ہر قسم کے لئے ایک علحدہ نمونہ تیار کرتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ تمام برقیوں پر ایک ہی قسم کا برقی بار رہتا ہے اور یہ بھی علم ہے کہ جوہر برقائے ہوئے محسوس نہیں ہوتے بلکہ برقی طور پر تعادل کی حالت میں رہتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جوہر کی تعمیر کے لئے صرف برقیے کافی نہیں ہو سکتے۔ ہر جوہر میں مثبت اور منفی باروں کی مساوی مقدار کی ضرورت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متضاد نوعیت کے یہ بار جوہر میں کس طرح رہتے ہیں؟ شروع شروع میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ مثبت بار کا ایک کرہ ہوتا ہے جس میں برقیے چھپے رہتے ہیں رودرفرڈ نے اس خیال کی تقلید کی۔ اس نے تجربوں سے بتایا کہ مثبت برق کے جوہر کے سارے جسم میں منتشر نہیں رہتی بلکہ مرکز حالت میں مرکز پر قائم رہتی ہے۔ اور برقیے اس مثبت بار کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ مرکز کی مثبت برق کو مرکزہ (Nucleus) کہتے ہیں۔ جوہر کی یہ تصویر چھوٹے پیمانہ پر نظام شمسی کی تصویر ہے یہ نظریہ اب تک قابل قبول ہے اور اس کی رو سے تقریباً تمام جوہر خلا پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ برقیہ کا قطر جوہر کے قطر کا $\frac{1}{100000}$ ہوتا ہے (جوہر کے قطر سے اس بیرونی مدار کا قطر مراد ہے جس میں برقیہ گردش کرتا ہے)، مرکزہ کا قطر بھی برقیہ کے قطر کے تقریباً مساوی ہوتا ہے۔ انسانی جسم کے تمام جواہر کو اگر اس طرح اکٹھا کر دیں کہ جواہر کے درمیان مطلق خلا باقی نہ رہے تو کل مجموعہ ایک چھوٹے نقطہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اتنا چھوٹا کہ اسے ہم خالی آنکھ سے دیکھ بھی نہیں سکتے مندرجہ بالا نظریہ کی رو سے تمام ٹھوس مادہ نہایت ہی خفیف المقدار چیز ہے۔

ریڈیم کا جوہر بہت وزنی ہوتا ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ جوہر جس قدر بھاری ہوگا اتنی ہی اس کی ساخت پیچیدہ ہوگی بھاری جوہر میں بہت سے برقیے گردش کرتے رہتے ہیں اور خود مرکزہ بھی پیچیدہ رہتا ہے سب سے ہلکا اور سادہ جوہر ہائیڈروجن کا ہوتا ہے یہ صرف ایک مثبت بار پر مشتمل ہوتا ہے جس کے گرد ایک برقیہ گردش کرتا ہے۔ اس مثبت برق کو بدئیہ (Proton) کہتے ہیں اس کا بار بھی برقیہ کے بار کے مساوی مگر مختلف العلامت ہوتا ہے۔ مگر کمیت برقیہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جوہر کا سارا وزن ان ہی بدئیوں کا نتیجہ ہے۔ ہائیڈروجن کے سوا تمام جواہر کے مرکزے میں بدئیے بھی ہوتے ہیں اور برقیے بھی البتہ بدئیوں کا وزن نسبتاً بہت زیادہ ہوتا ہے۔ زیادہ وزنی جواہر میں ان کی ترتیب اس قدر پیچیدہ رہتی ہے کہ یہ غیر قائم (Unstable) معلوم ہوتے ہیں۔ ان جوہروں کے مرکزے میں ہمیشہ تجزیہ ہوتا رہتا ہے۔

ریڈیم کی صورت میں تجزیہ کا عمل بہت تیز تیز ہوتا ہے۔ اور تجزیہ کی شرح نہ تو تپش یا دباؤ سے متاثر ہوتی ہے اور نہ ہمارے

کسی دوسرے عمل سے۔ تجزیہ کے دوران میں ریڈیم کے جوہر سے تین قسم کا اشعاع ہوتا ہے۔ ان کو عموماً عہ، بہ، جہ کہتے ہیں۔ عہ شعاعیں ذرات کو ایک دھارے پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہر ذرہ چار بدیوں اور دو برقیوں سے بنتا ہے۔ درحقیقت عہ ذرہ ہیلیم کے جوہر کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ ذرات محض برقیے ہوتے ہیں۔ جہ شعاعیں ذرات نہیں ہوتیں بلکہ نہایت ہی چھوٹی لاشعاعیں ہوتی ہیں۔ یہ تمام شعاعیں ریڈیم کے نہایت ہی پیچیدہ مرکز سے خارج ہوتی ہیں اور اس مظہر سے جوہر کی ساخت کے تمام نظریہ کی توثیق ہوتی ہے لیکن بحالت موجودہ ہم اس تجزیہ کی ماہیت سے بالکل بے خبر ہیں۔

اس نظریہ کی تجربی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں اس لئے ہم فرض کرلیں گے کہ عام اصولوں کی حد تک یہ نظریہ بالکل درست ہے۔ البتہ جوہر کی توانائی کے مبدا کا ذکر ضروری ہے۔ ایک اونس ریڈیم کے ایک گھنٹہ میں جو حرارت خارج ہوتی ہے اس سے ڈیڑھ اونس پانی کو جوش دیا جاسکتا ہے۔ مقابلتاً توانائی کی یہ مقدار ناقابل لحاظ ہے کیونکہ ریڈیم کے جواہر کے مجموعہ کے صرف آدھے حصہ کا تجزیہ ہوتا ہے اور کسی ہلکے عنصر مثلاً ہیلیم کے جوہر کو برق پاروں اور برقیوں سے تیار کرنے کے لئے زیادہ توانائی کی ضرورت ہے مثلاً ایک اونس ہیلیم بنانے کے لئے اس قدر توانائی کی ضرورت ہے جس سے سو اسپی طاقت کے انجن کو مسلسل آٹھ گھنٹے چلایا جاسکتا ہے واقعہ صورت یہ ہے کہ توانائی کا سب سے قوی مبدا، مادہ کی "تخریب" ہے۔ اگر ہم برق پارہ اور ایک برقیہ کو اتحاد کا موقع دیں تو بے اندازہ توانائی صرف ہوگی۔ اگر ایک قطرہ کیچڑ کی تخریب کریں تو اتنی توانائی حاصل ہوگی جس سے ایک بڑا جہاز بحراوقیانوس کے ایک طرف سے دوسری طرف تک جاسکتا ہے

یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ تخریب کا یہ عمل زمین پر نہیں بلکہ ستاروں میں جاری ہے ستاروں سے مسلسل توانائی کی بڑی بڑی مقداریں خارج ہورہی ہیں اور فلکیات میں یہ سوال ناقابل حل بنا ہوا ہے کہ یہ توانائی کہاں سے آرہی ہے۔ اس مسئلہ کا ایک اہم جزو یہ بھی ہے کہ اس سے ہم ستاروں کی عمر کے متعلق اندازہ لگا سکتے ہیں تخمینہ سے ستاروں کی عمریں 10^{12} سال کے ضعف میں حاصل ہوتی ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح مان لیں تو اب تک توانائی کے ان تمام مبدؤں کو ختم ہوجانا چاہئے تھا جن کے متعلق قیاس ہے کہ توانائی ان ہی سے آرہی ہے۔ کیونکہ وہ اس مدت مدید تک توانائی کی اس قدر کثیر مقدار خارج نہیں کرسکتے۔ سب سے زیادہ قابل قبول حل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں میں تخریب کا عمل جاری ہے اس بنا پر آفتاب سے ہر روز 36×10^{10} ٹن مادہ فنا ہو رہا ہے لیکن خود آفتاب کی کمیت اتنی ہے کہ یہ عمل آئندہ 15×10^{12} سال تک جاری رہ سکتا ہے۔

تخمینہ سے زمین کی عمر 10^{12} سال نکلتی ہے اور صرف مندرجہ بالا نظریہ سے اس تخمینہ کی تشفی ہوتی ہے۔ البتہ وقت کے اس پیمانہ کے

متعلق اگر شبہ ہوتا ہے تو وہ اس نظریہ سے جس کی رو سے کائنات برابر پھیل رہی ہے اور کائنات کی اتنی زیادہ عمر صحیح نہیں معلوم ہوتی بجائے اس کے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ زمین کی عمر (10^9) سال ہوگی۔ ایسی صورت میں یہ خیال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ ستاروں سے جو توانائی آرہی ہے اس کا سبب مادہ کی تخریب نہیں ہے بلکہ تعمیر ہے۔ اس ترمیم شدہ پیمانہ وقت کے لحاظ سے توانائی کی جو مقدار حاصل ہوتی ہے وہ اتنی ہے کہ ہائیڈروجن کے جواہر سے ہیلیم کے جوہر کی تعمیر میں خارج ہوسکتی ہے۔ اگر آفتاب صرف ہائیڈروجن پر مشتمل ہو تو اس ہائیڈروجن سے ہیلیم کے جواہر کی تعمیر میں اتنی توانائی حاصل ہوگی جو موجودہ شرح سے 10^{11} سال تک مل سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کائنات کے مادہ کی تخریب ہو رہی ہے یا تعمیر، یا دونوں عمل ساتھ ساتھ جاری ہیں۔ علما سائنس تا حال اس سوال کے جواب پر متفق نہیں ہوسکے۔ تقریباً تیس سال قبل ایک بہت زیادہ نفاذ (نفوذ کرنے والا) (Penetrating) اشعاع کا انکشاف ہوا جو ہماری فضا ارض میں سے گذر رہا ہے۔ یہ اشعاع زمین سے نہیں ہو رہا ہے کیونکہ غبارہ کی مدد سے دریافت کیا گیا ہے کہ سطح سمندر کے مقابلہ میں بلندیوں پر اس اشعاع کی طاقت نفوذ بہت زیادہ ہے۔ نیز یہ آفتاب سے بھی نہیں آرہا ہے کیونکہ دن اور رات میں اس اشعاع کی مقدار میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اب آفتاب خود ایک اوسط جسامت کا ستارہ ہے اس لئے یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ اشعاع کسی دوسرے ستارہ سے آرہا ہے۔ اس کو بیرونی مکان سے آنا چاہیے۔ اس کا حقیقی مبدا کیا ہے؟

اس اشعاع کا نام کونی اشعاع (Cosmic) ہے۔ اور زمین پر ہم کو اشعاع پیدا کرنے کے جو طریقے معلوم ہیں ان میں سے کسی سے بھی یہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے پیدا کردہ اشعاعوں میں سب سے زیادہ طاقتور اشعاع لا شعاعیں اور جیم شعاعیں ہیں۔ لا شعاعیں سیسے کی چند ملی میٹر موٹی تختی میں گذر سکتی ہیں، اور جیم شعاعیں چند انچ سے زیادہ سیسہ میں نہیں جا سکتیں لیکن یہ نیا اشعاع سیسے کی سولہ فیٹ موٹی دیوار میں سے گذر جاتا ہے۔ اب اگر اس کی ساخت بھی لا اور جیم شعاعوں کی ساخت کے مماثل فرض کرلی جائے تو اس کی طاقت نفوذ سے طول موج محسوب کیا جا سکتا ہے۔ اور اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی موجیں ہائیڈروجن کے جوہر کی تخریب سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح ان شعاعوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مکان کے کسی بعید حصہ میں برابر تخریب کا عمل جاری ہے۔ دوسری طرف بعض لوگوں نے خصوصاً (Millikan) ملیکین نے بتایا ہے کہ بعض عناصر پیچیدہ جواہر کی تعمیر میں ایسی شعاعیں پیدا ہونی چاہئیں یعنی کائنات میں تخلیق یا تعمیر کا عمل جاری ہے ہی۔

مؤخر الذکر نظریہ اول الذکر کے مقابلہ میں کم تر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پیچیدہ جواہر اچانک

کیونکر بن جائیں گے۔ تعمیر کے کام کو تدریجی ہونا چاہئے اور تدریجی تعمیر سے اس قسم کا اشعاع پیدا نہیں ہوسکتا۔ بہرکیف فی الحال یہ سوال تصفیہ طلب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کونی شعاعیں γ شعاعوں کے مماثل نہ ہوں بلکہ β ذرات کی طرح ذرات پر مشتمل ہوں۔ اس صورت میں ان کی رفتار نور کی رفتار کے تقریباً مساوی ہونی چاہئے کیونکہ بغیر اس کے اتنا اشعاع پیدا نہیں ہوسکتا۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ امکان صحیح نہیں ہوگا۔

(۴)

اس وقت تک برقیہ کو ذرہ فرض کیا گیا ہے۔ یہ تخیل ۱۹۲۵ء تک صحیح سمجھا جاتا تھا لیکن اب برقیہ کی بعض اور خصوصیات کا پتہ چلا ہے جن کی رو سے بعض صورتوں میں برقیہ کے خواص موجوں کے خواص کے مشابہ ہوتے ہیں یعنی برقیہ ذرہ کی طرح بھی سلوک کرتا ہے اور موجی گروہ (Group of waves) کی طرح بھی۔ بعض تجربات میں برقیہ ناقابل انکار طور پر ذرہ کی طرح عمل کرتا ہے لیکن ایسے تجربات بھی ہیں جن میں اس کا طرز عمل موجی گروہ کے سلوک کے مشابہ ہے۔ ان دوہری خصوصیات کے اظہار کے لئے ایڈنگٹن نے برقیہ کا نام موجک (Wavicle) تجویز کیا ہے۔ لیکن ہم ایسے برقیہ کا طبعی تصور کرنے سے قاصر ہیں جو بیک وقت ذرہ بھی ہے اور موج بھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ برقیہ اب ہمارے تصورات کی دنیا سے بہت بلند ہوگیا ہے۔

ان مشکلات کے باوجود ریاضیات کی مدد سے ہم برقیہ کے متعلق یہ حکم لگاسکتے ہیں کہ خاص حالات کے تحت کیا واقعہ پیش آتا ہے۔ ناقابل تصور برقیہ کی جگہ ہم چند علامات مقرر کرلیتے ہیں۔ ان علامات کا طبعی مفہوم ہم نہیں جانتے لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ کن کلیات کی پابند ہیں۔ لہذا ہم یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ یہ علامات جس چیز کی تعبیر کرتی ہیں اس کو خاص خاص شرائط کے تحت کیا افتاد پیش آئے گی۔ ریاضیات کا عالم اس بحث میں پڑتا ہی نہیں کہ برقیہ کا تصور بھی ممکن ہے یا نہیں وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ ریاضیاتی اعمال برقیہ پر جاری ہوسکتے ہیں یا نہیں اگر ہوسکتے ہیں تو مطلب پورا ہوگیا لیکن ظاہر ہے کہ ہر شخص، خواہ وہ سائنس داں ہی کیوں نہ ہو، ریاضیات کا عالم تو نہیں ہے اس لئے طبعی سائنس کی اس منزل پر عموماً لوگوں کے قدم جمنے نہیں پاتے۔

برقیہ کا اوپر بیان کردہ تصوری صورت سے خلاف توقع نہیں ہے۔ کیا ضروری ہے کہ قدرت کے تمام مظاہر ان ہی قوانین کے پابند ہوں جو ہم نے اپنے روزمرہ کے محدود تجربات کی بنا پر وضع کئے ہیں؟ مگر انیسویں صدی کے برطانوی سائنس داں ذرا تنگ نظر اور قدامت پرست واقع ہوئے تھے۔ وہ بقول لارڈ کلون کے کسی ایسی چیز کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ جس کا نمونہ تیار نہ کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ قدرت تو اس چیز کی پابند نہیں ہے کہ اس کے کسی مظہر کا

نمونہ انیسویں صدی کا برطانوی سائنس داں تیار کر سکتا ہے یا نہیں اس لئے آخر کار ان سائنس دانوں کو مجبوراً اپنی کوتاہ فہمی کا اعتراف کرنا پڑا۔ براعظم کے سائنس داں اتنے تنگ خیال نہ تھے۔ سمجھنے کا مفہوم ان کے نزدیک زیادہ وسیع تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج کل براعظم کے سائنس داں زیادہ کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ طبعی تحقیقات کے موجودہ دور میں وہ شخص بہت بدقسمت ہے جو کسی ایسی چیز کا ادراک ہی نہ کر سکے جس کی تصویر بنانے سے وہ قاصر ہے۔

عوام کے سامنے اگر ہم موجودہ سائنٹفک نظریات کا خاکہ پیش کرنا چاہیں تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا کیونکہ عوام کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ اس کو شکلوں اور نمونہ سے واضح کیا جائے۔ اور جب ہم ایسی چیز سے بحث کر رہے ہوں جو بیک وقت ذرہ بھی ہے اور موجوں کا گروہ بھی تو بتائیے کہ اس کی شکل بنائی جائے تو کیونکر اور نمونہ پیش کیا جائے تو کس طرح کا۔ بیسویں صدی کے سائنس دانوں کی قسمت میں اگر راہبانہ زندگی نہیں لکھی ہے تو انھیں سائنس کے معموں کی ایسی تصویریں مہیا کرنی پڑیں گی جنھیں عوام سمجھ سکیں یا پھر عوام میں وہ قوت پیدا کرنی ہوگی جس کی مدد سے وہ منطقی استدلال اور رابطوں کو سمجھنے کے لئے غیر مادی اشیا کا تصور کر سکیں۔ ذرا دیر کے لئے ایسی کائنات کا تصور کرنے کی کوشش کیجئے جو محدود بھی ہے اور پھر برابر پھیل بھی رہی ہے۔ آپ کامیاب نہیں ہو سکتے لیکن ریاضیات کا عالم جب اس چیز کو پیش کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات کا صرف ایک ہی تصور ایسا ہو سکتا ہے جس میں مکانی روابط (spatial relations) اور پیمائشی فاصلے بمقابلہ دوسری ریاضیاتی اسکیموں کے زیادہ صحت کے ساتھ جمائے جا سکتے ہیں۔ اب اگر اس ریاضیاتی تصویر پر چند منطقی اعمال جاری کئے جائیں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ مکان محدود بھی ہے اور اس میں مسلسل وسعت بھی ہو رہی ہے۔

اس قسم کے مکان کے تصور کی کوشش فضول ہے۔ کوشش سے صرف اس قسم کے سوال دماغ میں پیدا ہوں گے۔ اگر مکان پھیل رہا ہے تو کس چیز کے اندر پھیل رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال میں پہلے ہی سے یہ مفروضہ شامل ہے کہ ایک چیز کے پھیلنے کے لئے دوسری چیز کی ضرورت ہے جس کے اندر پہلی چیز پھیل سکے۔ اس لئے ریاضیات کا عالم اس سوال پر توجہ نہیں کرے گا بلکہ اس سوال سے اس کے دماغ میں ایک اعتراض اپنے نظریہ پر پیدا ہوگا اور وہ اس کی توجہ کو جذب کرے گا۔ اعتراض یہ ہوگا کہ "تمہارا یہ نظریہ کہ مکان محدود بھی ہے اور پھیل بھی رہا ہے خود اپنی تغلیط کرتا ہے"۔

عالم مذکور اس اعتراض پر غور کرے گا اور اس کی بنیادوں کو بھی پرکھے گا۔

قدرتی مسائل کی چھان بین میں اب ہم ایسی منزل پر پہونچ چکے ہیں کہ جہاں ہم ایسی چیزوں سے بحث کرتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس لئے ہم کو متعجب نہ ہونا چاہئے اگر اچانک یہ معلوم ہو کہ برقیہ جن کلیات کا پابند ہے وہ بھی اتنے ہی عجیب ہیں جس قدر کہ خود اس کی ساخت لیکن سائنس داں جب طبعی کلیات کی غیر معمولی نوعیت کا ذکر کرتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ وہ کون کلیات ہیں جن کو ہم معمولی سمجھیں اور موجودہ طبیعیات کے کلیات کس طرح ان کلیات سے مختلف ہیں؟ بشرط فرصت اس چیز پر کسی آئندہ اشاعت میں روشنی ڈالی جائے گی۔ فقط

حامد علی عباسی بی۔ ایس سی

نامۂ حبیب

ہائے کل بھی رات بھر آنکھوں میں نیند آئی نہیں — موجِ نکہت کوئی عشرت کی خبر لائی نہیں
سو رہی تھی ساری دنیا خواب کے آغوش میں — میں دلِ افگارِ تمنا تھی ابھی تک ہوش میں
چاندنی چھٹکی ہوئی تھی خامشی چھائی ہوئی — بہکی بہکی تھی فضا جیسے بہار آئی ہوئی
ذرہ ذرہ اپنے دامن میں چھپائے نور تھا — وادیِ ایمن نہ تھی روشن چراغِ طور تھا
آسماں پر اس طرح بکھرے ہوئے انجم تمام — منتشر شیرازۂ عالم کا جیسے ہو نظام
جھلملاتے جھلملاتے ڈوب جاتے تھے کبھی — ہستیِ موہوم کا نقشہ دکھاتے تھے کبھی

چھا رہا تھا دامنِ گیتی پہ کیفِ سرمدی — مجھ فسردہ دل کی دنیا میں وہی افسردگی
دیکھتے ہی دیکھتے یہ دل فریبی کا سماں — کروٹیں لینے لگا جیسے مریضِ ناتواں
تھک گیا جب یہ سرِ مغرب کا نکلا ماہتاب — سامنے کی وادیوں میں چھپ گیا جیسے خواب
چھا گئیں تاریکیاں تارے پریشاں ہو گئے — چاند کی فرقت میں مہ پارے پریشاں ہو گئے
میں سراپا دردِ طوفانِ حوادث میں گھری — آنسوؤں کے تار کا مالا بنانے میں رہی
کثرتِ گریہ سے جب بے نور آنکھیں ہو گئیں — رات کی تاریکیوں میں آرزوئیں سو گئیں
تم سرِ بالینِ حسرت تھے سراپا انتظار — اور تھی میں ناتواں غافل فریبِ اعتبار
ہر سکوتِ منتظر آغوش پھیلائے ہوئے — میری روٹھی نوجوانی کو تھا بہلائے ہوئے
چونک اٹھی جب تصور سے جدا تم ہو گئے — دفعتاً خاموش مثلِ بحرِ قلزم ہو گئے
اور کیا احوال میں تم کو جدائی کا لکھوں — ماجرائے سوزِ فرقت اور میں اب کیا لکھوں

جاں نواز آؤ کہ اب غم کی پذیرائی نہیں
دل نواز آؤ کہ اب تابِ شکیبائی نہیں

عزیز احمد عزیزؔ متعلم سال چہارم

جاہلیت کا ایک عرب جس نے یورپ پر سلطنت کی

مولوی محمد عثمان صاحب عمادی جامعہ عثمانیہ کے قدیم طالب علم ہیں اور آج کل ٹریننگ کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ موصوف اگرچہ سائنس کے گریجویٹ ہیں مگر ادب و تاریخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ سائنس اور ریاضی ایسے خشک مضامین کی درس و تدریس کے ساتھ ایسے تحقیقی اور علمی مضامین قلم بند کرنا آپ کے لئے خاص طور پر قابل ستایش ہے اور یہ فیض موصوف کو یقیناً اپنے والد ماجد علامہ عبداللہ العمادی مدظلہ سے حاصل ہوا ہے جن کے علم و فضل سے نہ صرف ہندوستان بلکہ عراق و مصر بھی مستفیض ہو رہے ہیں۔

مدیر

عربوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے بہت پہلے دنیا کے بیشتر ممالک پر حکومت کی اور ان کو تہذیب و تمدن سے روشناس کیا، ملک تبت کا نام انھیں کے ایک بادشاہ تبّع سے موسوم ہوا، یمن کا ایک بادشاہ شمر اپنی فوج لے کر ترکستان تک تمام علاقے فتح کرتا گیا، موجودہ سمرقند کا شہر اسی کے نام کی یادگار ہے، ایرانی جو اپنے مہذب و متمدن ہونے کے بڑے بڑے دعاوی پیش کرتے ہیں زمانۂ دراز تک اسی قوم کے غلام بنے رہے، عربوں کا ایک

قبیلہ وادیٔ نیل کے ساحل پر نازل ہوا اور اس نے مدت مدید تک مصریوں پر حکومت کی، چونکہ یہ لوگ خانہ بدوش تھے لہذا اہل ملک نے اس حکمراں خاندان کا نام ہی "ہکسوس" یعنی چرواہوں کا بادشاہ (ملوک الرعاۃ) رکھا، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے تعلقات بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے صدہا سال پہلے تمام اقصائے عالم سے ہو چکے تھے، دانایان فرنگ نے بہت سی جگہوں پر کھدائی (حفریات) کے ذریعہ ایسے آثار پائے ہیں جن سے ان تمام دعووں کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے، ہماری زبان میں ایک بے مثل کتاب "تاریخ عرب قدیم" ہے جس میں اس اجمال کی تفصیل مل سکتی ہے، لیکن آج کی صحبت میں ہم ناظرین کرام کا تعارف سلطنت روما کے ایک زبردست عرب شہنشاہ سے کرانا چاہتے ہیں جس کو مدت ہوئی کہ ہم بھول چکے ہیں مگر اُس کے کارنامے اب تک تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور ہم تک پہنچے ہیں، گبن نے اس شہنشاہ کا نام "فلپ" لکھا ہے۔

سنہ دو سو اڑتیس عیسوی کا عالم آشوب زمانہ ہے، چند ماہ کی ایک قلیل مدت میں روما کے تخت پر چھ شہنشاہ یکے بعد دیگرے بیٹھے اور قتل ہوئے، تمام شہر میں ایک اضطراب و ہیجان کارفرما ہے، لوٹ مار قتل و غارتگری کا طوفان برپا ہے، ہر شخص کی زندگی عام اس سے کہ وہ امیر ہو یا فقیر شہری ہو یا پردیسی خطرہ میں ہے، ایسے وقت میں فوج نے گارڈین کو جس کی عمر مشکل سے چودہ پندرہ سال کی ہے روما کے تخت پر بٹھا دیا اور تمام رومی دنیا نے اس کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا، گارڈین نے اپنے خسر مسی تھیس کی مدد سے انتظام سلطنت نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے انجام دیا، اور چند ہی روز میں روما کے باشندوں کو پھر امن و اطمینان نصیب ہو گیا۔

اسی اثنا میں ایرانیوں نے عراق کا ملک فتح کر لیا اور انطاکیہ پر پیش قدمی کر دی، روما میں جب یہ خبر پہونچی تو مسی تھیس نے سمجھا بجھا کر نو عمر شہنشاہ کو ایرانیوں کے مقابلہ پر آمادہ کیا، گارڈین تمام فوج لے کر مشرق کی طرف روانہ ہوا، ایرانیوں کو جب اُس کے ورود کی خبر پہونچی تو جتنے شہر اُنھوں نے فتح کئے تھے خالی کر کے دریائے دجلہ تک ہٹ آئے۔ گارڈین نے اس فتح کی خوشخبری روما کو بھیجی اور اپنے خسر کی بہت تعریف کی، اس پوری مہم میں مسی تھیس نے نہایت قابلیت اور جانفشانی و قابلیت کے ساتھ فوج کے آرام و آسایش کا انتظام کیا، رسد کی کثیر مقدار ہر منزل پر جمع رہتی جس سے کوئی تکلیف سپاہیوں کو نہ ہوئی اور ان کو شکایت و بغاوت کا موقع نہ ملا، لیکن مسی تھیس اسہال کی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا جس کے ساتھ ہی گارڈین کی خوش نصیبی بھی رخصت ہو گئی۔

شہنشاہ نے مسی تھیس کی جگہ فلپ کو سرلشکری عطا فرمائی (۲۴۳ء)، فلپ عرب تھا اور شہر بصریٰ اُس کا وطن تھا گبن کے بیان کے مطابق اوائل عمر میں "وہ قزاق تھا کیونکہ وہ عرب تھا" اگر عرب ہونا قزاق ہونے کے مترادف ہے تو بیسیوں ایسے

غیر عرب لٹیروں کے حالات ہمیں ملتے ہیں جنھوں نے آئینِ جہانداری و جہاں بانی کا سبق سکھایا، خود انگلستان کی تاریخ میں ایسے پادشاہوں کی نسبت کیا کہا جائے گا جن کی قزاقیوں کی داستانیں خود تاریخ میں مذکور و ماثور ہیں،

فلپ اپنے زور بازو سے جب ملک میں معروف ہو چلا تو قسمت آزمائی کے لئے رومی فوج میں شریک ہو گیا۔ بڑے بڑے معرکے اس نے سر کئے، اُس کے کارنامے بہت مشہور ہوئے اور جلد ہی ایک ادنی سپاہی سے ترقی کر کے سپہ سالار ہو گیا فوج میں اتنا ہر دلعزیز تھا کہ ادنی سے اعلیٰ تک ہر شخص اس کی عزت کرتا، گارڈین بھی اُس کو بہت مانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسی تھیس کے مرنے کے بعد اُس کی نظروں میں سوائے فلپ کے کوئی دوسرا اس عہدۂ جلیلہ کے قابل نہ دکھائی دیا۔ اس وقت فلپ کی عمر چالیس سال کی تھی، اُس کے حوصلے بہت بلند تھے، وہ ترقی کے انتہائی زینے پر گو ابھی تک نہیں پہونچا تھا تاہم قسمت اُس کی یاوری پر تھی، اولوالعزم سپہ سالار اپنے فرائض منصبی نہایت احتیاط و خوبی سے ادا کرتا رہا، لیکن وہاں تو روز ازل ہی سے روما کا تخت اُس کے حصہ میں آچکا تھا، اس لئے حالات و واقعات نے بھی اسی کے مطابق صورت اختیار کرنی شروع کی۔

زمان و مکان کے اتنے فاصلہ پر صحیح واقعات کا پیش کرنا بہت دشوار ہے، گبن کا بیان ہے کہ فلپ نے نہایت ہوشیاری سے ایسا انتظام کیا جس سے لشکرگاہ میں غلہ کی کمی محسوس ہونے لگی، سپاہی بہت برافروختہ ہوئے اور شہنشاہ کو اس کی نوعمری اور ناتجربہ کاری کا الزام دینے لگے، غیظ و غضب کے عالم میں وہ شہنشاہ کو تخت سے تختہ پر کھینچ لائے اور فوراً قتل کر دیا، اور بلا کسی تعویق کے اپنے محبوب سپہ سالار فلپ کو تخت نشین کیا، رومی دنیا نے بطیب خاطر اس "لٹیرے شہنشاہ" کو اپنی قسمتیں سپرد کر دیں (مارچ ۲۴۴ء) فلپ نے تخت پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے محسن کی یادگار کے طور پر ایک بڑا مقبرہ اس مقام پر تعمیر کرایا جہاں وہ قتل ہوا تھا۔

رومی مورخین کہتے ہیں کہ فلپ کے ایما سے گارڈین کو فوجیوں نے قتل کیا اگرچہ اوّل اوّل وہ اپنے محسن کی جان بخش دینا چاہتا تھا۔ یہاں ہم گبن کی دقت نظری اور منصف مزاجی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُس نے اِن تمام الزامات کو واقعات کی روشنی میں باطل قرار دیا اور اُس "لٹیرے شہنشاہ" کے زبردست کردار پر کوئی دھبہ نہ آنے دیا،

اُس کے دلائل یہ ہیں :-

گارڈین کے مرنے کے بعد فلپ رومی دنیا کے سیاہ و سپید کا مالک بلا شرکت غیرے ہوا، فوج اُس کی مطیع و فرمانبردار تھی، سینیٹ نے اُس کی اطاعت کا حلف اپنی رضا و رغبت سے اٹھا لیا تھا، وادی دجلہ سے لے کر بحر ظلمات تک اور افریقہ سے

لے کر فرنگستان تک جدھر اُس کی نگاہ اُٹھتی کوئی اُس کی راہ میں حائل و مزاحم نظر نہ آتا، گارڈین کے مرنے سے کوئی خوف اُس کو نہ تھا، بایں ہمہ اگر گارڈین فلپ کے اشارہ سے قتل ہوا تو یہ کیا ستم ظریفی تھی کہ اس کی یادگار میں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا؟ دوسری بات یہ ہے کہ سینٹ کے نام جتنے مراسلے اُس نے بھیجے ہر ایک میں اپنے کو اس جرم سے بَری کیا، اگر گارڈین اس کے حکم سے قتل ہوا تو اس عذرِ گناہ کے کیا معنی؟ ان دلائل کے علاوہ ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے، فوج فلپ کے تابع تھی، جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں گارڈین کے قتل کے بعد فوج نے اُس کو تخت پر بٹھایا، اگر خود فلپ نے محسن کشی کی تھی تو فوج کو اُسے تخت پر بٹھانے کی کیا حاجت تھی؟ اُس کے راستہ میں جب کچھ نہیں حائل تھا تو وہ خود ہی تخت و تاج کو غصب کر سکتا تھا، لیکن نہیں، عرب کا شریف زادہ تاریخ میں غاصب کے لقب سے مشہور ہونا نہیں چاہتا تھا، فوج کے اصرار پر اور مہمات ملکی کی فوری ضروریات پر اُس نے یہ بارِ گراں اپنے کندھوں پر اُٹھایا، رومی مقبوضات کو چھوڑ کر ایرانی پہلے ہی پسپا ہو چکے تھے اس نے سرحد کی حفاظت کا معقول انتظام کر کے اطالیہ کا رُخ کیا، اور نہایت شان کے ساتھ روما میں داخل ہوا، رومیولس کو دریائے طبرہ کے کنارے تھوڑے سے "چرواہوں اور ڈاکوؤں" کی مدد سے روما کی بستی بسائے ہوئے پورے ایک ہزار سال گزر چکے تھے، فلپ نے اس ہزار سالہ قیامِ سلطنت کا جشن اپریل ۲۴۸ء میں بڑی دھوم دھام سے منایا، دریائے طبرہ کے کنارے تین رات تک قربانیاں ہوتی رہیں، تمام منادر رقص و سرود کی آواز سے گونجتے رہے، چراغوں اور مشعلوں کی روشنی میں تمام شہر جگمگا اُٹھا، ستائیس غلمان اور اتنی ہی حوروں نے اپنی سریلی آواز میں حال اور مستقبل کے لئے دعا مانگی، فلپ کی شاندار نمائشوں اور ضیافتوں نے عوام کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا، لوگوں کی تفریحِ طبع کے لئے تماشا گاہوں میں ایک مدت تک طرح طرح کے کھیل ہوتے رہے، غرض رومیوں نے نہایت عقیدت سے اس جشن میں حصہ لیا، اور ہفتوں تک دن عید اور رات شب برات بنی رہی، لوگ جوق جوق قطع منازل و طے مراحل کر کے دیکھنے آتے، سارا شہر دن میں آدمیوں کا جنگل اور راتوں کو چراغوں کا فانوس نظر آتا۔

جس زمانے کا ہم ذکر کرتے ہیں پادشاہ اور رعایا کے درمیان رشتہ الفت ٹوٹ چکا تھا، رومی سوسائٹی کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی، یکے بعد دیگرے بہت سے شہنشاہوں کو اس تخت کے لئے عزیز جانیں دینی پڑی تھیں، خود فلپ کو بھی خوف ہر وقت لگا رہتا، آخر سنہ دو سو انچاس عیسوی کے موسم گرما میں یہ بلا خود اس کے سر پر بھی آئی، بیسیا کے دستہ فوج میں مرینس نامی ایک گمنام شخص نے بغاوت کر دی، فلپ اس خوف سے کہ کہیں یہ بغاوت سارے لشکر میں عام نہ ہو جائے

سینٹ کو اس سے آگاہ کیا، ساری مجلس ساکت و صامت تھی، ڈیسیس نے مہر سکوت کو توڑا اور شہنشاہ کو تسلی و دلاسا دے کر اطمینان دلایا کہ یہ بغاوت محض عارضی ہے اور اس کا اثر جلد زائل ہو جائے گا ڈیسیس کی یہ پیشین گوئی بہت جلد ظاہر ہوئی اور باغی قتل کر دیا گیا، لیکن فوج اب بھی غیر مطمئن تھی لہذا اُن کو ہموار کرنے کے لئے شہنشاہ نے ڈیسیس کو بھیجا یہاں فوج نے اُسے مجبور کر کے شہنشاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیا، یہ دیکھ کر فلپ اپنی آزمودہ کار فوج جرار کو لے کر بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ ہوا، جنگ میں اُس کو شکست ہوئی ایک روایت کے مطابق وہ فوراً قتل کر دیا گیا، لیکن دوسرے بیان سے ایسا واضح ہوتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد وہ ویرونا میں قتل ہوا،

جاہلیت میں تو مشرق کے ایک فرزند نے اتنا عروج حاصل کیا تھا، اس عہد میں کہ تہذیب و شائستگی کا عہد کہا جاتا ہے مشرق کو اپنے فرزندوں سے کیا کچھ اُمید نہ ہوگی۔ اگرچہ زمانہ کی زبان حال کہہ رہی ہے۔

امید نیست کہ قسیس بشکند ناقوس
ہمیں بس است نہ بندند مومناں زنار

محمد عثمان عمادی، بی ایس سی
(ٹریننگ کالج جامعہ عثمانیہ)

قومیت کا تصوّر

(زمانہ حاضرہ میں)

قومیت کا وجود احیائی دور کی فرمانروائی سے ہوا ہے اور اس میں حقوق انقلابی کو خصوصاً بڑا دخل ہے۔ قومی حکومت کی مقامی خود مختاری کا نظریہ اس خیال پر منحصر ہے کہ باشندوں کو اپنا ذاتی طریقہ حکومت پسند کرنے کا حق حاصل ہے اور اسی بنا پر اس تصور کی بنیاد پڑی کہ جو کوئی گروہ کافی مستقل اور متمیز ہستی رکھتا ہو اور ایسی روایات کا حامل ہو جو قومیت قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں، اس کو خود اپنے طریقہ حکومت کو ارتقاء کا موقع حاصل ہونا چاہئے۔ قومی امتیازات اور قومیت کی حد بندی عموماً دو باتوں سے کی جاتی ہے:-

(۱) نسل (۲) گرد و پیش کے حالات

(۱) نسل، ہمارے اسلاف کے واقعات کو ہمارے معاشرہ کی تنظیم میں بہت بڑا دخل ہے صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ ہر نسل اپنی پیش رو نسل کے خیالات اور جذبات کو قبول کرتی ہے چنانچہ موجودہ زمانہ میں بھی شکل و شباہت، عادات دماغی و جسمانی، قومی زبان اور لباس، ایسی چیزیں ہیں عہد ماضی کی یادگار ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں جن وجوہ سے طبقۂ انسان کی تقسیم مختلف گروہوں میں ہوئی تھی اب وہی اسباب ایک عالمگیر مجلس شوریٰ یا وفاق عالم کے قائم ہونے میں حائل ہیں۔ غرضکہ ہم میں سے ہر شخص فرداً فرداً اور من حیث الجماعت اُن نتائج کا مرقع ہے جو زمانۂ ماضی کے اثرات سے مترتب ہوئے ہیں۔

(۲) گرد وپیش کے حالات میں قدرتی اور انسانی کیفیتیں شامل ہیں۔ قدرتی ماحول، آب وہوا، اور جغرافیائی حدود کی بنا پر مختلف گروہ انسانی میں ایک بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان باتوں سے نسلی خصوصیات کے متعلق کوئی اصول نہیں بن سکتا ہو نکہ ممکن ہے کہ کسی قوم میں بعض صفتیں ہمیشہ برقرار رہنے والی نہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ خلقت انسانی کے عادات وخصائل پر آب وہوا کی کیفیت اور دیگر جغرافیائی عناصر کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک خاص قوم یا نسل کسی خاص صفت پر اس طرح بلا شرکت غیرے قابض ہو سکتی ہے جو اس کو اور قوموں یا نسلوں سے متاثر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ مختلف قومیں مختلف زمانوں میں ایک ہی مقام پر آباد ہوئیں اور ایک ہی مقام پر نشو ونما حاصل کیا لیکن ایک کو ترقی نصیب ہوئی اور دوسری اس سے محروم رہیں۔ اس کے علاوہ اکثر قومیں انھیں جغرافیائی حالات میں جن میں وہ ہمیشہ سے رہتی آئی ہیں مختلف زمانوں میں مختلف خصوصیات سے متصف رہی ہیں۔ بیان بالا سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ جغرافیائی عناصر کے اثرات اور نسلی عادات وفضائل کے متعلق مبالغہ سے گریز کرتے ہوئے اگر موجودہ حالت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت جو قوم جہاں جہاں اور جس جس حالت میں سکونت پذیر ہے وہ دوسری تمام قوموں سے مختلف واقع ہوئی ہے۔ ایک خاندان دوسرے خاندانوں سے بلحاظ خون جدا ہوتا ہے اور چونکہ وہ گروہ یا جمہور جسے ہم "قوم" کے لقب سے موسوم کرتے ہیں کم وبیش مختلف خاندانوں کا ایک مستقل مجموعہ ہوتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ دو قوموں کے درمیان خونی اختلاف بھی ہوتا ہے لیکن اس اختلاف کی شدت تبدیلی وطن تعلقات تجارتی اور ذرایع حمل ونقل کی فراوانی کی وجہ سے کم ہو جاتی ہے۔

انسانی ماحول سے وہ ذہنی اور جذباتی اثرات مراد ہیں جو ایک انسان سے دوسرے انسان پر اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ پر پڑتے ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص سیاسی مسائل پر اس وقت تک صائب رائے نہیں قائم کر سکتا جب تک کہ فرداً فرداً ہر شخص کی کارکردگی اور اس تغیر کو پیش نظر نہ رکھے جو گروہوں کے ایک دوسرے سے مل کر رہنے کے سبب تمام قوم میں رونما ہو جاتا ہے۔ گو جمہور یا قوم ایک نہایت ہی اہم اور قابل لحاظ شئے ہے مگر افراد کی ہستی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی جسمانی تعلقات کے علاوہ روایات کے میل جول اور تقلید کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ جو قومیں مدت دراز تک ساتھ ساتھ رہتی ہیں ان میں ان باتوں کے متعلق جو عادات وخصائل میں قابل ستایش یا زندگی میں فائدہ مند ہوتی ہیں اور اس امر کی نسبت کہ قانون اور حکومت کی کیا حیثیت ہونی چاہئے ایک خاص خیال یا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ یکساں سرگذشت اور یکساں معیار سے قومیت کی تشکیل میں اس قدر مدد ملتی ہے جتنی ایک خون سے نہیں۔ الغرض یہ ایسی قوتیں ہیں جن کے ذریعہ سے وہ انسانی

گروہ بنتا ہے جسے ہم "قوم" کہتے ہیں۔ انہیں قوتوں کے اعتبار سے قوم کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ سیاسی ارتقا میں بہ حیثیت ایک طاقت کے اس کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

آج ایسے صدہا گروہ موجود ہیں جن میں ایسے امتیازات اور اختلافات ہوتے ہیں جن کو تسلیم کرنے سے کوئی بھی ذی ہوش اہل خیال انکار نہیں کر سکتا۔ حالیہ خیال یہ ہے کہ ان اختلافات کو قائم رکھ کر مختلف قوموں کو ترقی کرنا چاہئے۔ اور اس کے کئی وجوہ ہیں، پہلے تو یہ کہ ایک فرد کی حیثیت کو مٹا دینے سے جس طرح اس کی ذاتی قابلیت مفقود ہو جاتی ہے اسی طرح تمام قوموں کو آئینی دستور، ملک اور حکومت کے لحاظ سے بالکل یکساں بنا دینے میں ہمت، ثابت قدمی، ذکاوت ایسی خاص صفات کے معدوم ہو جانے کا بھی احتمال ہے۔ ہر قوم میں ایسی خاص صفت ضرور ہوتی ہے جس کی حفاظت کرنا تمام انسانوں کی فلاح کے لئے بہت کارآمد ہوتا ہے لیکن ایسی صفات کا تحفظ اسی حالت میں ممکن ہے جب اس قوم کو اپنے ذاتی قوانین اور آئین حکومت کی امتیازی ترقی کے لئے موقع حاصل رہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب کوئی قوم اپنی خاص سیاسی زندگی سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کی کارگزاریوں کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور جب اس قوم کو سیاسی آزادی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے علوم و فنون سے تہذیب و تمدن میں عام ترقی ہونے لگتی ہے۔

قومیت کے اس تصور کے تین لوازم ہیں:۔

(۱) اولاً یہ کہ معقولات کے اقتضا کے بموجب ہم کو ایک چھوٹی سی حکومت سے بھی نسل انسانی کے اتنے ہی نفع بخش نتائج کی توقع رکھنی چاہئے جس قدر کہ عظیم الشان اور دولت مند سلطنتوں سے۔ چھوٹی حکومتوں کے قومی لیڈر، افراد کے باہمی تعلقات کی تمثیل پر یہ دعویٰ کیا کرتے ہیں، اگر ایک کمزور شخص ایک نہایت تندرست وحشی کے مقابلہ میں اپنے ابنائے جنس کو زیادہ فائدہ پہونچا سکتا ہے تو ہمیں چاہئے کہ فنا کرنے کے بجائے اسے ابھرنے کا موقع دیں۔ اسی طرح جب ایک گروہ، جسے اپنی مہذب روایات پر ناز ہے، ایسی چیزیں پیدا کر سکتا ہے جو طبقۂ انسان کے لئے عام طور پر مفید ہو سکتی ہیں تو اسے آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔

(۲) افراد کے باہمی تعلقات کی سیاسی تنظیم کا خواہ کوئی بھی طریقہ ہو وہ ہر قوم کے لئے درست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عملی سیاست میں ہر جداگانہ طور پر ہر قومی گروہ کو حقیقی سیاسی آزادی کا موقع دینا چاہئے۔ مختلف ملکوں میں قانون و عملداری کے طریق مختلف ہوتے ہیں اور اس تفریق میں انسانی جماعتوں کے امتیازات جھلکتے ہیں۔ خود مختاری کے علاوہ ایسی

خاص خاص باتوں کا بھی ارتقاء ہوتا ہے جو اُس قوم کی خصوصیات ہیں۔

(۳) اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر گروہ علیحدہ علیحدہ ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ کامل علحدگی کی حالت میں، افراد کی طرح کوئی قوم بھی کمال عروج پر نہیں پہنچ سکتی۔ اگر مختلف انسانوں کے درمیان رشتۂ دوستی ورابطۂ یگانیت قائم ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ سب اشخاص ایک ہی سانچے میں ڈھل جائیں مختلف قوموں کے درمیان اتحاد یا اخوت کے استحکام سے قومیت کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اور ترقی ہوتی ہے۔

یہاں تک جس قسم کی قومیت کا تصور پیش کیا گیا اُس میں جغرافیائی حدود کو بہت کچھ دخل ہے۔ ایک ہی ملک کے باشندے جو لحاظ تہذیب و تمدن یکساں ہیں، ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ یکسانیت ایک دم سے ظہور پذیر ہو جائے بلکہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، دو یا اس سے زائد مختلف نسل کے باشندے سیاسی، معاشی، تجارتی اور معاشرتی تعلقات کی بنا پر ایک ہی ملک میں رہتے رہتے ایک دوسرے سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کے اس تدریجی امتزاج سے ایک قوم کی تشکیل ہونے لگتی ہے۔ لیکن "قوم" کا لفظ ایسے افراد کے مجموعہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو ایک ہی مذہبی رشتہ سے منسلک ہوں خواہ اُن کی بود و باش کسی ملک میں بھی ہو مثلاً مذہب اسلام کے پیرو خواہ ہندوستان میں ہوں یا چین میں، عربستان میں ہوں یا یورپ میں، ایک ہی قوم کے افراد خیال کئے جاتے ہیں۔ ایسی قوم کی بنیاد مذہب اور صرف مذہب پر ہوتی ہے، مذہب ایسی قومیت کا جزو لازم ہوتا ہے اور مختلف لوگوں کے مذہب کی وحدت سے قومی زندگی ظہور میں آتی ہے۔ گو بعض حلقوں میں اس قسم کی وحدت کو بجائے قوم (Nation) کے نیشنیلیٹی (Nationality) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ان دونوں اصطلاحوں میں فرق بھی پیدا کیا جاتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ پان اسلامزم کا تصور اور صیہونیت کی تحریک اس قسم کی قومیت کے وجود کے سب سے بڑے ثبوت ہیں۔

کوئی شخص قومیت کا حامی ہو یا نہ ہو لیکن اس بات کے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سیاسیات حاضرہ میں قومیت کا تصور ایک زبردست قوت ہے۔ قومیت پہلے پہل انقلاب انگیز تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت یورپ میں خاندانی تقسیم اور جاگیرداری نظام کے آثار باقی تھے جن کا نیست و نابود کر دینا حریت، مساوات اور اخوت کا ضروری شاخسانہ سمجھا جاتا تھا؛ اور بعض حالتوں میں ایک قوم اپنے اصولوں کو زبردستی دوسری قوم میں رائج کرنا چاہتی تھی جیسا کہ آسٹریا نے اطالیہ میں کیا تھا چنانچہ اطالیہ کے نوجوانوں کی انجمن کے مقصد کے تین ناقابل تقسیم اجزا تھے یعنی خودمختاری، اتحاد اور مساوات

اور جن کا منشا یہ تھا کہ آسٹریا والے اطالیہ سے بیک بینی و دو گوش چلے جائیں نیز مختلف چھوٹی چھوٹی مملکتیں ایک ہی رشتۂ اتحاد سے منسلک ہوں اور ایسی جمہوری حکومتیں قائم کی جائیں جن کے افراد کو آزادی رائے حاصل ہو چنانچہ آجکل بھی اُن ملکوں میں، جہاں کے باشندے غیر ملکی حکومت کے محکوم ہیں، قومیت کا یہی منشا سمجھا جاتا ہے کہ ان غیر ملکی حکومتوں کا استیصال کر دیا جائے۔

قومیت کا دوسرا پہلو تعمیری ہے۔ تعمیری قومیت کا یہ مطلب ہے کہ ہر ایک قومی جماعت کو ذاتی خصوصیات کی ترقی اور ذاتی معاملات کے بندوبست کا اختیار رہے۔ غور و فکر سے جو خوبی نظر آتی ہے اور جس کو قومیت ترقی دینا چاہتی ہے وہ قومی سیرت اور خصلت کا امتیاز اور قومی روایات کی ترقی ہے۔ لیکن جب طرز حکومت ایسا ہو کہ عوام کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ جس نظم و نسق میں وہ رہتے ہیں اس کے ذریعہ سے ان کے اغراض نیز عادات و خصائل کی ترجمانی نہیں ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ غیر قوم کی حکمرانی سے یہ احساس زیادہ شدید ہو جائے تو عوام کے دلوں میں ایک قومی جذبہ سرایت کر جاتا ہے اور قومی تحریک زور پکڑتی جاتی ہے جس کا مقصد ایک طرف تو اس جبر و استبداد کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے جو حکومت کام میں لاتی ہے اور دوسری طرف اس سے از سر نو تنظیم کے لئے بھی تدابیر مہیا کرنا ہوتا ہے جن کے مطابق یہ قوم اپنے خاص پسند کے اصول قانون اور طرز حکومت رائج کرنا چاہتی ہے اور اس طرح ایک زبان اور یکساں رواج رکھنے والی قوموں کا واحد اور یکساں نظام حکمرانی کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہ اخذ کرنا چاہئے کہ قومیت کا معیار خواہ مخواہ شہنشاہیت کا مخالف ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دونوں معیاروں میں تصادم کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی لیکن بعض لوگوں کو ان دونوں معیاروں میں تصادم اس وجہ سے دکھائی دیتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی اندازہ اچھی طرح نہیں ہوتا۔ اگر قومیت کا منشا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی نظام حکومت میں متعدد نسلوں کے امتزاج سے اجنبیت دور ہو اور ان کے مابین ایک قریبی تعلق پیدا ہو جائے تو شہنشاہیت کا بھی یہ اقتضا ہے کہ ایک ہی حکومت کے اندر مختلف اغراض و مقاصد کا خیال رکھا جائے۔

قومیت کے اس تصور میں ایک نقص یہ نکالا جاتا ہے کہ اس سے سیاسی مقصد کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے، ایک قوم کی روح کو برقرار رکھنے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے اس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ علٰحدگی پسند وحشی پن پیدا ہو جاتا ہے، بین الاقوامی تجارت میں محصولات و دیگر پابندیوں سے طرح طرح کے روڑے اٹکائے جاتے ہیں، ہر ملک کوشش کرتا ہے کہ

معاشی پیداوار کے اعتبار سے وہ دوسرے ملکوں کا دست نگر نہ رہے نیز دوسرے ملکوں سے درآمد تو موقوف کردے لیکن برآمد میں اس قدر زیادتی کی جائے کہ تمام غیر ملکی منڈیاں اس کی مصنوعات سے بھر جائیں۔ اس قسم کی سیاسیات کی وجہ سے جو قومیت کی انتہائی تنگ خیالی پر مبنی ہیں اکثر قوموں میں باہمی رشک وحسد ہی نہیں بلکہ دشمنی بھی پیدا ہوگئی ہے چنانچہ فرانس کی قومی تحریک کا ایک زمانہ میں یہ نتیجہ نکلا کہ قریب قریب جرمن قوم کے ہر فرد سے وہاں وحشیانہ طور پر نفرت کی جانے لگی۔ ہر ایک نسل تعداد میں جس قدر بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک ملک گیری کے بارے میں اس میں رشک وحسد پیدا ہوجاتا ہے جو بالآخر بڑھ کر امپیریل حکمت عملی کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ قومیت پسندی میں بھی اس قدر زور وشور سے جنگ کی حمایت شروع ہوجاتی ہے جس قدر شد ومد سے شہنشاہیت پسندی میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ قومیت کو عدم مداخلت کے عجیب وغریب اصول کے ساتھ منسلک کردیا گیا ہے جس کا کسی زمانہ میں منشار تھا کہ اگر کسی جماعت میں جبر واستبداد کا عمل ہو تو دوسرے گروہ کو اس سے کچھ واسطہ نہ رہے۔ لیکن اس بات کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنا نہایت دشوار ہے کہ ایک قوم کو دوسری قوموں سے کب اور کس طرح سروکار رکھنا چاہئے۔ دوسروں پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت کرنا خواہ وہ ان کے فائدہ ہی کے لئے کیوں نہ متصور ہو ایک متروک طریقہ ہے لیکن اس کے برعکس دوسری قوموں کے معاشرتی نظام میں جو خرابیاں ہیں ان کی طرف سے کوئی مہذب جماعت یا فرقہ بے پرواہ نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی گئی تو ان خرابیوں کا دور دورہ ہوجائے اور پھر انسانیت کا بھی یہ تقاضا کہ دوسروں کو ٹھیک راہ پر لگایا جائے ایک قوم کو مداخلت کرنے کے لئے مجبور کردیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو غیر معمولی اہمیت دے کر تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر بین الاقوامی صورت حال کو نازک بنا دیا گیا ہے اور امن خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ وہی قومیت جو پہلے چھوٹی چھوٹی مظلوم نسلوں کا معیار تھی، شہنشاہیت سے مشابہ ہوگئی ہے، چنانچہ اطالیہ کے تسخیر حبش کا واقعہ اس جذبہ کا پتہ دیتا ہے جو قومیت کے غلط تصور پر مبنی ہے اور جو امپیریلیزم کے مترادف ہے۔ سیاسیات پر معقولیت کے ساتھ غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک قوم کے لئے دوسری قوم کو مٹا کر ترقی اور توسیع کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح کہ ایک فرد واحد کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ دوسرے افراد کی ہستی مٹا کر جادۂ ارتقاء میں گامزن ہو۔ دوسروں کو مٹا کر ترقی کرنا اسی حالت میں مناسب ہے جب مالتھس کے نظریہ آبادی کے مطابق بہم رسانی ضروریات کی کوئی خاص حد مقرر کردی جائے۔ لیکن قدرت سے امداد لینے کے لئے جو ذرائع کام میں لائے جاتے ہیں ان کی ترقی کے پیش نظر یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ دوسری

قوموں کو بیوقوف بنانے یا آلاتِ جنگ میں اضافہ کرکے ان پر ہیبت طاری کرنے کے لیے جو فہم و فراست، دولت و قوت کام میں لائی جاتی ہے اگر اس کا استعمال قدرتی ذرائع کی تحقیق و تجسس کے لیے کیا جائے تو تمام قوموں کے انتہائی آسائش و ترقی کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان مہیا ہو جائے۔ اگر حکمت عملی اور چالبازی سے کام لینے کے بجائے مناسب اور جائز راستے اختیار کئے جائیں تو ہر قوم کو دوسری قوموں کی ضروریات کا احساس ہونے لگے اور انسان اپنے طبقہ کی بربادی کے بجائے اس کی ترقی کے لئے قدرت سے کام لینے لگے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اعلیٰ ترین قومیت کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہر قوم کے افراد دوسری قوموں کو اپنا مخالف نہیں بلکہ رفیق سمجھنے لگیں۔ کسی قوم کا اپنی ذاتی خصوصیات کو معاندانہ حیثیت سے ترقی نہ دینا چاہیے۔ بلکہ ان کی جد وجہد قوموں کے حلیف اور بنی نوع انسان کی عام بھلائی و خوش حالی کی غرض سے ہونا چاہیے۔

محمد معروف بی اے (جامعہ عثمانیہ)

فضا میں ایک آواز

(کارنیپٹر)

فضائے بسیط میں ایک آواز بلند ہوتی ہے: "میری آواز تمام عالم میں ہے میں ہر ملک اور ہر شہر سے گزرتی ہوں۔ جو
انسان کا وطن ہے وہی میرا وطن ہے۔" اور ساری کائنات میں یہ صدا گشت لگاتی ہے :۔

(۱)

"یہ قوموں کی محافظ سربلند مغرور پہاڑیاں، یہ گنجان وادیاں، صحرا کے نشیب و فراز میں ہوا کا اتار چڑھاؤ، برف پوش
...دل کے اوپر تیزی سے اڑتے ہوئے نیلے گلابی اور کاسنی بادل، یہ وسیع میدان، سبزہ زار، چھوٹی بڑی آبادیاں،
...دیہات، اور یہ ہزاروں میل تک پھیلے ہوئے بڑے بڑے ملک، میں ان سب کو دیکھتی ہوں اور ان کو بھی جو
...ہیں آباد ہیں۔

تمام عالم میں میں پرواز کرتی ہوں۔ اور تمام انسانی اعمال کی شاہد ہوں۔

(۲)

اب اٹلی کے میدان وسیع سبزہ زار اور بار میڈا کے مقبوضات میری نظروں کے سامنے ہیں۔ وہ سمندر کی موجوں
...انتہا اونچی نیچی پہاڑیاں اور ان پر انگور کے باغیچوں کا وہ طویل سلسلہ کسانوں کے گلابی اور زرد رنگ کے کھیت، مکانات

اور گودام گنجان آبادیاں اور وہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے گھنٹہ گھر میں ان سب کو دیکھتی ہوں۔

وہ دیکھو بچاری اخروٹ کی سی رنگت والی ضعیف ماں تمام دن اکیلی گھر میں ادھر سے اُدھر پھرا کرتی ہے۔ سب لوگ کھیت پر چلے گئے ہیں وہ گھر میں بالکل تنہا ہے۔ کبھی اس کمرے میں کبھی اس کمرے میں وہ ایک خود فراموشی کی حالت میں یوں ہی چکر لگایا کرتی ہے۔ اس کی زندگی ماضی ہے حال سے وہ بے خبر ہے کبھی بالا خانہ پر چڑھ جاتی ہے اور خشک انگوروں کو سمیٹ کر یکجا کرتی ہے اور تازہ انگوروں کو پھیلانے لگتی ہے۔ یہی اس کے مشاغل ہیں۔ اور اس کی زندگی اتنی ہی محدود ہے۔

مزدور دن بھر درانتیاں ہاتھ میں لئے ننگے پاؤں دھوپ میں گھانس کاٹتے رہے اب خوشنما شام میں چھوٹے پہیوں والی گاڑی پر اپنی دن بھر کی محنت کا حاصل بار کرکے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ کسان کھیت میں ایک لکڑی والے ہل سے آخری لکیر ختم کر رہا ہے۔ اور اس کا لڑکا ناہموار سڑک پر اپنی گاڑی اور زرد بیلوں کے ساتھ ہچکولے کھاتا ہوا شہر کی طرف جا رہا ہے۔

لڑکیاں اور عورتیں زرد اور سرخ دستیاں لئے ہوئے سڑک کے کنارے ریشم کے کیڑوں کے لئے شہتوت کی پتیاں جمع کر رہی ہیں۔ گاؤں کے معززین گرجا کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے راہرو عورتوں کو تک رہے ہیں۔ بے فکر نوجوان ہوٹلوں میں "مورا" (ایک قسم کا کھیل جو انگلیوں سے کھیلتے ہیں) کھیلنے میں مصروف ہیں بچے گلیوں میں گیند اچھال رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔

زندگی کا صدیوں کا پرانا کھیل جاری ہے۔ ابھی سطح زمین پر رومن تباہ شدہ جھیل کے کچھ نشانات باقی ہیں۔ ابھی رومن طرز معاشرت کچھ کچھ سانس لے رہی ہے۔ ہاں ابھی پرانا خون رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

پانی دریا میں بہتا ہے فصلیں کھیت میں پکتی ہیں اور حیات، جوانی اور محبت کی روشنیاں انسانی آنکھوں میں چمکتی ہیں۔

اب میں اس چند فٹ کے انسانی جسم کو جو میری عارضی قیام گاہ تھی۔ جہاں سے میں زندگی کے خوشنما چمن زار کا نظارہ کر رہی تھی۔ اب میں اس کو چھوڑتی ہوں۔ ان بے جا خواہشات سے جو ہر وقت مجھے گھیرے رہتی ہیں اور ان برائیوں سے جو ہمیشہ زندگی کے بہتے ہوئے پانی کو گندلا کر دیتی ہیں۔ روح آزاد ہوتی ہے۔ ہاں اب میں ان انسانی خواہشوں کی مضبوط زنجیروں کو توڑ کر آسمان کی رفعتوں پر پرواز کرتی ہوں۔ آہ! وہ چھوٹا سا انسانی قفس بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ میں

زاد ہوں۔ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہو کر تمام کائنات کی وسعتوں میں پرواز کرتی ہوں اوپر اور اوپر نیلگوں فضاؤں میں پھر آہستہ آہستہ نیچے اور نیچے زمین پر۔ ایک بار پھر انگور کے سرسبز باغوں میں میرا مسکن ہے۔ میں غلاموں اور مزدوروں کے ساتھ کام تی ہوں۔ پھر انسانی ہستیوں کی شریک کار ہوں کبھی یہاں کبھی وہاں کبھی معماروں کو گارا ملا کر دیتی ہوں تو کبھی آرا کش ے ساتھ آرا کھینچتی ہوں۔ نوجوان محبوب و محب پھر اسی طرح چاند کی ضیاؤں میں میرے سینہ پر سر رکھ کر سو رہتے ہیں ایک ماں کی ظریں آج بھی مجھے اسی طرح جانتی اور پہچانتی ہیں جس طرح صدیوں پہلے جانتی تھیں۔ میں وحشی آنکھوں والی گائے بھی ہوں اور یلی آنکھوں والے بیل کی جوڑی بھی۔ اور گاڑی بان بھی جو کبھی تو انھیں چابک مار مار کر بھگاتا ہے اور کبھی اپنی خوش کن تانوں ے انھیں مست بنا کر منزل کیطرف لے جاتا ہے۔

میں عاشق بھی ہوں اور محبوب بھی۔ دشمن بھی ہوں دوست بھی۔ ہاں میں ایک ہی وقت میں یہ بھی ہوں اور وہ بھی میں نے بارہا اپنی یکسانیت کو کھویا بھی ہے اور پایا بھی ہے۔

(۳)

پڈرمانٹیز (اٹلی کے شمال مغرب میں ایک قصبہ) کا ایک غریب باشندہ مجھے انگور کے کنج میں کچی اینٹوں کے چھوٹے سے مکان میں لے جاتا ہے اور شراب انگوری کا ایک جام پیش کرتا ہے۔ میں اس چھوٹے سے گھر کو اور اس کے مختصر سے اثاثہ کو دیکھتی ہوں ایک میز چند کرسیاں، ۵، ۶ برتن ایک ہلتی ہوئی شکستہ لکڑی کی سیڑھی بالائی منزل پر چڑھنے کا ذریعہ۔ اور ایک بید سے بنا ہوا کٹھرا جہاں وہ اپنے ریشم کے کیڑے پالتا ہے۔ سب یہی اسباب آرائش ہے ایک سادہ زندگی کا کل اثاثہ۔ لیکن یہ مختصر سی جگہ بھی غم سے ناآشنا نہیں۔ بچارا غریب لڑکا اپنی ماں کا عزیز ترین فرزند بیمار ہے۔ اس کی زندگی کا پھول مرجھا رہا ہے۔ تمام دن وہ اپنے کمزور جسم کے گرد ایک شال لپیٹے ہوئے دروازہ پر دھوپ میں بیٹھا رہتا ہے۔ وہ کھیت پر اپنے باپ کی مدد نہیں کر سکتا اور یہ احساس اسے ہر وقت بے چین رکھتا ہے۔ رات کو وہ خاموش بستر پر پڑا ہوا ریشم کے کیڑوں کی سرسراہٹ سنتا رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہیں ہوتیں بچاری دلگیر اور غمزدہ ماں ہر وقت اچھے خدا سے اپنے بچہ کی صحت کی دعا کرتی رہتی ہے۔ مگر نہیں جانتی کہ اس کا اچھا خدا اس کی دعا کو سنتا بھی ہے یا نہیں۔ پاک مریم کا مجسمہ چھوٹے طاق پر اسی طرح اور ویسا ہی رکھا ہوا ہے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں۔ اس کی نظروں کے سامنے نہ جانے کتنے دل پامال ہو چکے ہیں اور کتنے ہو رہے ہیں۔ کتنی آرزوئیں خاک

یں ہل رہی ہیں مگر پاک چہرہ پر کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی تاثر نمایاں نہیں ہوتا۔

(۴)

انسانی چاہت کی خوشبو اڑ گئی۔ بادل فانی اور ناپائدار شکلوں سے خوفزدہ ہوکر زمانہ کی محض خیالی راہ میں اڑے چلے جارہے ہیں۔ شباب کی مستیاں۔ جوانی کی شوخیاں۔ دو محبوب ہاتھوں کا لمس۔ دو چاہنے والے دلوں کی دھڑکنیں۔ دو متصل لبوں کا ارتعاش سب کچھ ختم ہوگیا۔ آزادی کے شیدا جسم کے قیدی کو پردار موت نے رہا کردیا۔ محلوں، گھاٹیوں، وادیوں، صحراؤں، جھونپڑیوں اور صحراؤں میں رینگنے والا چندروزہ کیڑا اب چند گز زمین میں مقید ہے۔ پانی اور بجلی سے بھری ہوئی گھٹائیں نہیں تھیں۔ کمزور مخلوق اور ہر طاقتور ہستی پر یکساں طور پر سایہ ڈالتی ہیں۔ سوتی عمیق گہرائیوں سے بلند ہوتا ہے اور انھیں اپنی آتشین انگلیوں سے چھوتا ہوا گزر جاتا ہے۔ ہر چیز میں ایک زندگی رونما ہوتی ہے ہاں ایک ایسی زندگی جسے موت کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونا ہے۔

حساب و کتاب ہوگیا تحقیقات ختم ہوگئی۔ فیصلہ سنا دیا گیا۔ اب میں ایک قیدی ہوں ایک مجرم جسے حکم سزا سنایا جاچکا ہے۔ انصاف پسند جج قاقم و دیبا کے قرمزی لباس میں سرخ وردی پوش پیامبروں کے ساتھ نقاروں اور باجوں کے شور و غل میں برآمدے کی سیڑھیوں سے اترتا ہے اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وسیع مجمع کے درمیان سے گزر کر اپنی سنہری قبضہ والی گاڑی میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ سپاہی مجھے ملزموں کے کٹہرے سے نکال کر ایک بند قیدیوں کی گاڑی میں پہونچا دیتے ہیں۔ گاڑی زمین دوز تاریک راستوں سے گذرتی ہوئی مقتل میں پہونچتی ہے۔ اور اب مجھے یہاں جلّاد کا انتظار کرنا ہے۔

ایک بار پھر میرے پر ہوا میں کھلتے اور بند ہوتے ہیں اب میں اور آگے پرواز کرتی ہوں چمکتی ہوئی آگ کا دھواں فضا میں اڑ رہا ہے۔ ہر طرف ایک کاروباری ملک کا شور و غل سنائی دیتا ہے عجیب و غریب آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور خلا میں ناپید ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے پروں کو سمیٹ کر نیچے اتر آتی ہوں۔ اور تمباکو کی کمپنی میں کمسن لڑکیوں کی صف میں اپنا آئینہ کا ٹکڑا اور کنگھی، ٹوٹی ہوئی بنچ کے سوراخ میں چھپا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ یا نہیں تو کسی روزنامہ اخبار کے مطبع میں "کرکٹ میچ" اور "ایوان شاہی" کی خبریں چھاپنے میں مصروف ہو جاتی ہوں۔

یہاں سے بھی آگے ——— دور ——— پھر میں اپنے بازو کھول دیتی ہوں۔ اور پرواز کرتی ہوں اب میں کیا دیکھتی ہوں

آہن گر کی دوکان پر زرد رو پژمردہ صورت، کمزور لڑکے اور لڑکیاں آہنی بھٹیوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھ مسلسل حرکت کر رہے ہیں اور مالک مطمئن انداز سے کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا ہے۔ موسم سرما کے آفتاب کی اڑتی کرنیں خاک آلود کھڑکیوں سے ہوکر اس گندگی اور غلاظت پر چمکتی ہیں جو ان کے گرد پھیلی ہوئی ہے۔ !

ارزاں اور کم قیمت مال جو استعمال سے قبل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ روزانہ پیک ہوتا ہے اور افریقہ اور جزائر ہند کے تاجروں کے پاس روانہ کر دیا جاتا ہے۔

تہذیب و تمدن ہر قوم اور ہر ملک کی تاریخ میں اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں۔

اکتشافات کا زمانہ آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ عروج و زوال آگے پیچھے اپنے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہیں۔ اور باری باری فتح و شکست سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

ذرا ادھر نظر اٹھا کر دیکھنا:- کلوں اور انجنوں کے کارخانوں میں توانا، طاقتور، دیو ہیکل شکلیں، آدھی دھوئیں میں چھپی ہوئی اور آدھی آگ کی روشنی میں چمکتی ہوئی، مسلسل حرکت میں ہیں۔

کلوں اور منجنیقوں کی کھڑکھڑاہٹ آگ کی چنگاریوں اور انسانی چیخوں کے ساتھ بلند ہوتی ہے۔ مہتمم کارخانہ ایک پروقار انداز سے کھڑا ہوا ہاتھ نچا نچا کر احکامات دے رہا ہے۔ شہر آفتاب کے پھینکے ہوئے ہزاروں لاکھوں سنہرے تیر مسلسل کھڑکیوں، دروازوں اور روشندانوں سے داخل ہو ہو کر دھوئیں کی چادر کو چھلنی کر رہے ہیں۔ اور بھٹیوں میں یاقوت کی طرح سرخ لوہے کے ٹکڑے چمک رہے ہیں۔ کچھ لوگ بالکونی پر کھڑے ہوئے بڑی بڑی پانی کھینچنے کی کلوں کو حرکت دے رہے ہیں اور کچھ دہکتے ہوئے آہن کو پیٹ رہے ہیں۔ اور ایک موٹا طاقتور آدمی سب سے علیحدہ پانی کی بالٹی میں اپنا گرد آلود سر دھو رہا ہے ——— ! میری نظریں یہ سب کچھ دیکھتی ہیں ——— ! اب میں اور آگے بڑھتی ہوں ——— : یہ بھٹیوں میں کیا چیز دہک رہی ہے ——— ؟ لوہا آگ کی ہمسری کر رہا ہے اور چند دیو قامت ہستیاں بڑے بڑے چمٹے ہاتھوں میں لئے ہاتھوں اور پیروں پر چیتھڑے لپیٹے ہوئے اور پسینہ سے بھیگی سیاہ دستیاں اپنے دانتوں میں پکڑے لوہے کے دہکتے ہوئے ٹکڑوں کو آگ سے نکال رہے ہیں۔

ہر قسم کے اوزار، زرہ بکتر، ڈھال، تلواریں، کلیں، طرح طرح کی مشینیں ہر روز سیکڑوں کروڑوں کی تعداد میں تیار ہوتی ہیں اور سمندر کے سینہ پر بار کر کے تمام دنیا میں منتشر ہونے کے لئے بھیجدی جاتی ہیں۔

قومیں برسرپیکار ہوتی ہیں۔ عظمت و شوکت کا مظاہرہ ہوتا ہے فتحمندی کی خوشیاں منائی جاتی ہیں، جلسے ہوتے ہیں، رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں۔ قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ فخر و غرور کے گیت گائے جاتے ہیں۔ انسانی خون کے سمندر میں کامیابی کی کشتیاں تیرتی ہیں۔ اور بیجا غرور و تکبر کا پرچم فضا میں لہراتا ہے ــــــ!
لیکن وہ غریب آہن گر اسوقت بھی بھٹی کے قریب ہی پسینہ میں شرابور کھڑا رہتا ہے اور تمام دن اسی محبت کے خواب میں کھویا رہتا ہے جو ایکدن اس زمین پر اُترے گی اور اس دنیا کو بہشت بنا دے گی۔ مگر اس کا شریک کار، ساتھی ہمیشہ اس کے اس خواب بیداری پر ہنستا ہے۔ اور اس کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

موسم بہار کی سخاوت ہر درخت اور ہر پتہ پر یکساں ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بلوط کے پودوں میں زرد کلیاں پھوٹتی ہیں ــــــ بھورا چوہا خشک گھانس کے اندر حرکت کرتا ہے اور غلہ کھانے والا پرند اپنی لانبی گردن اُٹھائے ہوئے گنجان کھیتوں میں گھس جاتا ہے مگر آہن گر اسی طرح بھٹی کے کنارے کھڑا رہتا ہے۔

(۷)

ہر صبح پہاڑوں پر کہرا ایک نئے انداز سے گرتا ہے اور سورج خاکی بادلوں کو چھیڑنے کے لئے ایک شوخ حسینہ کی طرح مسکراتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ اور اس کی پہلی کرن کوئلہ کی کان میں کام کرنے والے مزدور کی ڈھیلی ڈھالی نیلی قمیص پر پڑتی ہے۔

لکڑہارا دن بھر جنگل میں لکڑیاں کاٹتا رہا۔ اب اس کے سامنے اک انبار لگ گیا ہے۔ اب وہ انھیں گاڑی پر لاد رہا ہے۔ درخت کی ایک بلند ٹہنی پر ایک چڑیا کا دلنواز نغمہ بلند ہو رہا ہے وہ اپنے کام میں منہمک ہے اور وہ اپنی آواز کی سیٹیوں میں گم۔

اس وقت مضطرب زرگر اپنے مقید عزیز بھائی کے لئے بیقرار اسٹیشن پر پہونچا ہے اور ٹرین پر بیٹھ کر سرل میں داروغۂ جیل کی قیامگاہ پر جاتا ہے۔ میلے کوٹ کی جیب سے ایک سونے کا سکہ نکال کر اسے پیش کرتا ہے تاکہ ازکم بے گناہ بھائی کچھ اچھی غذا ہی حاصل کر سکے۔ اور زندگی کے آخری لمحات فاقہ کی مصیبت میں نہ بسر کرے۔

داروغۂ جیل بہت نرم دل بوڑھا شخص ہے۔ وہ کبھی کسی کو نقصان پہونچانا نہیں چاہتا وہ رشوت قبول کرلیتا ہے، اور پریشان بھائی کو تسلی دیتا ہے کہ وہ قیدی کے ہر ممکنہ آرام کا خیال رکھے گا۔ اور جب اس کے کمرے میں داخل

ہوتا ہے تو چپکے سے ایک روٹی اس کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ قیدی کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر وہ بغیر کچھ کہے یا سنے کمرہ مقفل کرکے واپس چلا جاتا ہے۔

آگے اور آگے اب میں پرواز کرتی ہوں۔ لنکا شائر میری نظروں کے سامنے ہے: ناچ رنگ، بانسری، پیانو، سگرٹ اور شراب ——! زندگی ہی زندگی۔ آہ یہ ہنگامہ زار اور یہ صرف اپنی مسرتوں میں گم رہنے والوں کی سرور آوازیں ——! اے آقائے جمہوریت تو کہاں ہے؟ کیا یہ مسرور قہقہے تیرے کانوں تک نہیں پہنچتے ——؟

شفق کی روشنیاں آہستہ آہستہ ماند پڑتی جاتی ہیں۔

ڈچ وضع کے پرانے مکانات ایک ایک کرکے روشن ہو رہے ہیں۔ کسانوں کے لڑکے اور لڑکیاں کچھ قلابازیاں کھا رہے ہیں اور کچھ ایک دوسرے کے زانوؤں پر بیٹھے ہوئے منہ منہ کر باتیں کر رہے ہیں۔

موٹی اور بھدی عورتیں آپس میں گپ شپ کر رہی ہیں۔ مرد اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں اور کچھ کسی کھلیان کے پیچھے یا کسی گھنے جھاڑ کی آڑ میں محبت کی سرگوشیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

"اوہ کس قدر لطف انگیز" رقاصہ کے گھنگروؤں کی طرح کانپتی لرزتی ہوئی صدائیں فضا میں بلند ہوتی ہیں۔ "پھر ایک بار وہی کہنا، کس قدر شیریں"

میں اپنے بازو پھیلائے پھڑاتی ہوئی دور بہت دور ان ذلیل بستیوں اور اس میں بسنے والوں کی پہونچ سے بہت دور پرواز کر جاتی ہوں۔

رضیہ

وصل کی رات

کسے امید تھی یوں کارگر جذبِ نہاں ہوگا
دل اس پہلو میں اُس پہلو میں وہ آرام جاں ہوگا

تلافی رنجِ فرقت کی وصال دوست سے ہوگی
پھریں گے دن خداوندِ دو عالم مہرباں ہوگا

بلائے گردشِ دوراں سے بے خوف و خطر ہونگے
زمیں آرام دہ ہوگی فلک راحت رساں ہوگا

اِدھر وہ مہر وش رونق فروزِ پہلوے عاشق
اُدھر ماہ مبیں زینت فزائے آسماں ہوگا

اُدھر چھٹکے ہوئے تاروں کے جھرمٹ میں مہ تاباں
اِدھر پھولوں کی نازک سیج پر جانِ جہاں ہوگا

ضیا بار ایک ہی ساعت میں ہونگے دو مہ تاباں
وہ شب ہوگی کہ جس پر روز روشن کا گماں ہوگا

رہے گا رات بھر پیشِ نظر وہ خوشنما منظر
کہ ہوگی روح کو بالیدگی دل شادماں ہوگا

یہاں عجز و نیازِ عاشقانہ پیار کی باتیں
غرور دلبری و نازِ دلداری وہاں ہوگا

اِدھر ہر لحظہ عشقِ ناشکیبا داد کا خواہاں
اُدھر آمادۂ بیداد حسنِ بے اماں ہوگا

وہاں ہونگے ادائے حسن پر وہ جس قدر نازاں
کہیں اُس سے سوا ناز اپنی قسمت پہ یہاں ہوگا

زبانوں کا کریں گی کام دونوں سمت سے نظریں
کسی پر خوبی قسمت سے کوئی مہرباں ہوگا

کبھی ہنس ہنس کے ذکرِ آغازِ ایام محبت کا
کبھی رو رو کے اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہوگا

کبھی ہوگی شکایت شکر کے پردے میں غفلت کی
کبھی بے کھٹکے اظہارِ ستمہائے نہاں ہوگا

کبھی خوئے جفا پر دل ہی دل میں منفعل ہونگے
کبھی ذکرِ وفا بھی طبع نازک پر گراں ہوگا

کشیدہ عشق سے ہوگا کبھی حسنِ حیا پرور
کبھی دونوں میں باہم ارتباطِ جسم و جاں ہوگا

کبھی دونوں طرف اک آگ سی بھڑکی ہوئی ہوگی
کبھی اک شرم کا ہلکا سا پردہ درمیاں ہوگا

سرور آنکھوں میں ساغر ہاتھ میں محبوب پہلو میں
زبانِ صدق پر شکرِ خدائے دو جہاں ہوگا

صدق جائسی

مذہب کے متعلق یوروپی نظریے

جرمنی کا ایک حکیم "گسلر" کہتا ہے کہ "مذہب ابدی چیز ہے کیونکہ یہ جس حاسہ کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانہ میں بھی معدوم نہیں ہو سکتا۔" فرانس کا مشہور عالم رینان اپنی کتاب "تاریخ مذہب" میں لکھتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیا جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محسوب ہیں مٹ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے یا اس کی قوت میں زوال آ جائے ذہن انسانی ہمیشہ علانیہ ثبوت دیگا کہ مادی مذہب بالکل غلط ہے جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے۔" پروفیسر سبیٹر "فلسفۂ دینیہ" میں لکھتا ہے "میں کیوں پابند مذہب ہوں؟ اس لئے کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے میں نے خود اپنی رائے پر بھی اعتراض کیا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہے اس سے زیادہ عام سوسائٹی کو ہے۔ مذہب کی شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالے گئے لیکن جڑ ہمیشہ قائم رہی اور اس میں نئے برگ دبار پیدا ہو گئے ہیں اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کرتے جاتے ہیں انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوئی ہے اور اسی سے قوت پائے گی۔"

مذہب بالکل فطری چیز ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قوم و نسل ہر طبقہ کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے اور اس کے جو مقدم اصول ہیں وہ سب مذہبوں میں یکساں پائے جاتے ہیں مثلاً خدا کا وجود اور اس کی پرستش کا خیال حیات بعد الممات اور اعمال کی جزا و سزا کا یقین سچائی اور دیانت داری کو اچھا سمجھنا وغیرہ ارسطو و منتھم بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ سچائی اور دیانت داری و علم اچھی چیزیں ہیں لیکن افریقہ کا وحشی بغیر تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے ان چیزوں کو اچھا جانتا اور اچھا سمجھتا ہے ہٹلرسٹ کے سوا تمام محققین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انسان نے سب سے پہلے خدا کی پرستش اختیار کی تھی مشہور محقق میکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکا دیا تھا جبکہ وہ اس کا نام بھی نہ رکھ سکتے تھے۔ جس زمانہ سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے دنیا کے ہر حصہ میں خدا کا اعتقاد تھا آتوری۔ بصری۔ کلدانی۔ یہود وغیرہ سب کے سب خدا کے قائل تھے۔ پلوٹارک کہتا ہے اگر تم دنیا پر نظر ڈالو گے تو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جہاں نہ قلعے ہیں نہ سیاست نہ علم نہ صنعت نہ حرفہ نہ دولت لیکن ایسا کوئی مقام نہیں مل سکتا جہاں خدا نہ ہو۔" فولٹیر جو فرانس کا مشہور فاضل تھا کہتا ہے کہ زرد واسٹر۔ منو۔ سولن سقراط۔ سسرو۔ سب کے سب ایک سردار ایک منصف ایک باپ کی پرستش کرتے تھے۔

لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر منکرین مذہب کا بھی ایک گروہ موجود رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مختلف خارجی اسباب کی وجہ سے انسان میں جو حاسۂ مذہبی موجود ہے وہ دب جاتا ہے ایسی صورت میں خدا اور روح وغیرہ خارج از محسوسات چیزوں کے لئے استدلالات پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے پھر اگر عقل نے جذبات کی ہم آہنگی اختیار کی تو مقصود حاصل ہو جاتا ہے ورنہ انسان ہٹ دھرمی پر تل جاتا ہے اور ایک عظیم الشان گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ دنیا نئے قسم کے خیالات اور اعتقادات کی رو میں بہتی چلی جا رہی ہے ہر طرف دل و دماغ پر الحاد اور بے دینی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اس عالمگیر گمراہی کا بہت کچھ وبال یورپ کے مذہبی گروہ کی گردنوں پر ہے کیونکہ پندرھویں صدی عیسوی میں جبکہ یورپ میں علوم جدیدہ کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی مذہب کو بہت وسیع کر دیا گیا تھا۔ پرانے راستے اور پرانے اعتقادات سے جو کوئی ذرا بھی ہٹتا اس کو سخت سے سخت سزا دی جاتی کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب کی دست اندازی سے نہیں بچ سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اسپین میں مجلس انکویزیشن قائم ہوئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جو لوگ مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہوں ان کی تحقیقات کرے اور ان پر کفر کا الزام لگا کر سزائیں تجویز کرے چنانچہ ۱۴۸۱ء سے لے کر ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس آدمی ارتداد کے الزام میں زندہ جلا دئے گئے۔ اس مجلس نے ابتدائے قیام سے

لے کر آخر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر اور ملحد قرار دیا اور سزائیں دیں کوپرنکس نے نظام بطلیموسی سے انکار کرکے یہ ثابت کیا کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں تو اس پر کفر کا الزام لگایا گیا اور سزا ملی۔ گیلیلو نے جو دوربین کا موجد تھا کوپرنکس کی تائید کی تو دس سال قید کی سزا پائی کولمبس نے نئے جزیرے کی تلاش کا ارادہ کیا تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب کے خلاف ہے۔ زمین کے کروی ہونے کا خیال جب اول اول ظاہر کیا گیا تو پادریوں نے سخت مخالفت کی کہ یہ بات کتاب مقدس کے خلاف ہے غرض ہر قسم کی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے تاہم چونکہ علمی ترقی کا اٹھان تھا ان کی کوششیں رائگاں گئیں اور علوم و فنون تکفیر ہی کے سایہ میں پھلتے پھولتے رہے۔ پادریوں کی وہم پرستی اور تعصبات اگرچہ علم کو نہ دبا سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں کے خیالات اور اوہام ہی کو مذہب سمجھا اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے ان کی یہ رائے قائم ہو گئی کہ مذہب جس چیز کا نام ہے وہ علم کی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہی ابتدائی خیال ہے جس کی آواز بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے۔

یورپ کی نت نئی اور حیرت انگیز ایجادات و اکتشافات ساری دنیا میں شائع ہوئیں تو عوام الناس بڑے مرعوب ہوئے اور انھوں نے یورپ والوں کے جملہ خیالات و اعتقادات کو مسلم الثبوت سمجھ لیا۔ جو بات ان کے منھ سے نکلی آمنا صدقنا کہہ کر تسلیم کرلی گئی لیکن بعد ازاں یورپ میں جہاں ساری دنیا کے علوم و فنون کی تحقیقات ہوئی وہاں مذاہب کی بھی چھان بین شروع ہوئی اور بالآخر بہت سے ارباب دانش اس بات پر متفق ہو گئے کہ کوئی مذہب ہو بنیادی اور اصلی اصول و اعتقادات کے لحاظ سے کبھی اوہام پرستی کا مجموعہ نہیں ہو سکتا اور چند غیر مادی اور مافوق الفطرت چیزوں کے تخیلات جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں ضرور حقیقت پر مبنی ہیں چنانچہ یورپ کے کئی بڑے بڑے علماء کو خدا اور روح کا وجود تسلیم کرنا پڑا اور انھوں نے صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ یہ چیزیں ہم پر اس طرح منکشف ہوئیں جیسے دن کی روشنی۔

آئزک نیوٹن کہتا ہے کہ کائنات کے اجزاء میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان و مکان کے جو ترتیب و تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایسی ذات کے پایا جا سکے جو سب سے اول اور صاحب علم ہے ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ ان تمام اسرار سے جن کی یہ کیفیت ہے کہ جس قدر ہم زیادہ غور و فکر کرتے ہیں اس قدر وہ غامض ہوتے جاتے ہیں اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیاء صادر ہوتی ہیں۔ نیشنل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ علم طبیعیات کا مقصد صرف یہ نہیں کہ عقل کی پیاس بجھائی جائے بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ اپنی عقل

کی نظر خالق کائنات کی طرف اٹھائیں اور اس کے جلال پر فریفتہ ہوجائیں۔ ملٹن کہتا ہے" اے آسمانو مجھ کو خبر دو اے بادلو مجھ کو بتلاؤ اے زمین مجھے جواب دے اے بے انتہا ستارو تم بولو کون سا ہاتھ ہے جس نے تم کو افق میں تمام رکھا ہے اے شب چہاردہ کس نے تیری تاریکی کو خوبصورت بنادیا ہے تو کس قدر پرشان کس قدر عظمت مآب ہے تو جو دبتا رہی کہ تیرا کوئی صانع ہے جس نے تجھ کو بغیر کسی زحمت کے بنایا ہے اس نے تیری چھت کو قبہ ہائے نور سے مرصع کیا ہے جس طرح اس نے زمین پر خاک کا فرش بچھایا ہے۔ اے ہیبت ناک سمندر۔ اے وہ کہ غضبناک ہوکر زمین کو نگل جانا چاہتا ہے کس نے تجھ کو محبوس کر رکھا ہے جس طرح شیر کٹہرے میں قید کر دیا جاتا ہے تو اس قید خانہ سے بے فائدہ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تیری موجوں کا زور ایک حد معین سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

ملٹن اڈورڈ کہتا ہے انسان اسوقت سخت حیرت زدہ ہوجاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت و اتفاق کے نتائج ہیں۔ یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں جن کو لوگوں نے علم المحسوسات کا لقب دیا ہے علم حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے فزیکل سائنس جاننے والا کبھی اس پر اعتقاد نہیں لاسکتا۔

ہمارے ملک میں یہ عام خیال پھیلا ہوا ہے کہ یورپ عام طور پر خرق عادات اور روح کا منکر ہے اور اسی بنا پر جدید تعلیم کا ایک ایک بچہ ہر قسم کے ایسے واقعات پر جو محسوسات عام کے خلاف ہوں استہزا اور انکار کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ خرق عادات اور روح کے متعلق یورپ کے مشہور مستند حکماء و فضلاء کی تحقیقات کا حال لکھیں ۱۸۶۹ء میں بمقام لندن ایک بہت بڑی مجلس ان امور کی تحقیقات کے لئے منعقد ہوئی اس مجلس کے ارکان حسب ذیل اصحاب تھے۔

سینٹر جان لببک:- ممبر آف پارلیمنٹ۔ صدر انجمن

پروفیسر ہکسلی جو طبیعیات کا سب سے بڑا عالم تھا

لوئس۔ فزیکل سائنس کا بہت بڑا عالم

الفرڈ ویلز جو ڈارون کا ہمعصر اور مسئلہ ارتقا میں برابر کا شریک تھا۔

مارگن۔ مجلس علوم ریاضیہ کا صدر انجمن

جان کوکس ۔ امپیریل سائنٹفک سوسائٹی کا صدر انجمن

ان کے سوا اور بہت سے فضلاء شریک مجلس تھے اٹھارہ مہینے تک یہ مجلس برابر تحقیقات کرتی رہی آخر میں مجلس نے جو رپورٹ مرتب کی اس کے بعض فقرے یہ ہیں۔

" مجلس نے اپنی رائے کا مدار صرف ان تجربوں پر رکھا جو مجلس نے خود مشاہدہ کئے اور جن میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہیں ہو سکتا مجلس میں چار خمس ایسے ممبر تھے جو شروع میں اس قسم کے واقعات کے سخت منکر تھے اور سمجھتے تھے کہ یا تو ان واقعات میں فریب و شعبدہ سے کام لیا جاتا ہے یا خود انسان کے عصبی نظام کا اثر ہے لیکن نہایت دقیق اور مکرر تجربوں کے بعد ان کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ یہ خرق عادات حقیقی اور واقعی ہیں "

اس کے بعد انگلستان اور امریکہ میں ان تحقیقات کے لئے ایک ایک مجلس قائم ہوئی جس کے صدر انجمن ہیسلوب اور ہوڈسن تھے یہ مجلس تقریباً بارہ برس تک تحقیقات میں مصروف رہی اور بالآخر ۱۸۹۹ء میں اس نے اپنی تحقیقات ختم کی اور ان واقعات کی صحت کا اعتراف کیا ہیسلوب نے جو رائے لکھی اس کے بعض فقرے یہ ہیں :-

" مجھ کو امید ہے کہ میں ایک برس کے بعد دنیا کے سامنے دلائل قطعیہ سے یہ ثابت کروں گا کہ اس عالم فانی کے بعد ایک اور عالم ہے ۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ خرق عادات دیکھے ہیں جن کی نسبت کسی طرح شعبدہ اور فریب کا احتمال نہیں ہو سکتا "

ہوڈسن کی رپورٹ کے بعض جملے یہ ہیں ۔

" دنیا کو بہت جلد عظیم الشان جدید اطلاعیں حاصل ہونے والی ہیں مجھ کو امید ہے کہ دو ایک ہی برس میں دنیا کے لئے انسانی زندگی کے قوانین فطرت کی نئی تفسیر پیش کروں گا ۔ اگر پروفیسر ہیسلوب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے مردوں کی روحوں سے باتیں کیں تو ان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے "

ایک اخبار کے نامہ نگار نے ہوڈسن کے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کی تو اس نے یہ الفاظ کہے " میں نے اور پروفیسر ہیسلوب نے ایک ساتھ تحقیقات شروع کی ہم دونوں دہریے تھے اور کسی شئے پر یقین نہیں رکھتے تھے تحقیقات سے ہماری غرض یہ تھی کہ عیان روحانیت جو شعبدہ بازیاں کرتے ہیں ان کی پردہ دری کردی جائے لیکن آج میں اس بات کا قائل ہوں کہ مُردوں سے بات چیت ہو سکتی ہے اور اس کے متعلق ایسے دلائل ظاہر ہو چکے ہیں کہ اب مطلق شبہہ کی گنجائش نہیں رہی "

پروفیسر کوکس جو امپیریل سائنٹفک سوسائٹی کا صدر انجمن تھا ۔ اس نے مجمع عام میں کہا کہ میں صرف یہی نہیں کہتا کہ یہ ممکن ہے

میں کہتا ہوں کہ وہ بالکل حقیقت واقعی ہے۔ پروفیسر کوکس نے خاص اسپریچولیزم پر ایک کتاب لکھی جو نہایت کثرت سے بار بار چھپ چکی ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ چونکہ مجھے ان واقعات کا قطعی یقین ہو چکا ہے اس لئے یہ اخلاقی کمزوری اور نامردی ہے کہ میں ان کے ظاہر کرنے میں اس بنا پر جھجکوں کہ نکتہ چیں میری ہنسی اڑائیں گے۔

مادئین میں بہت بڑا فاضل جارج سکسٹون ہے وہ روح وغیرہ کا نہایت مخالف تھا اور ان امور پر سخت حملے کیا کرتا تھا اس لئے صرف اس غرض سے کہ مدعیان روح کی شعبدہ بازیوں کا پتہ لگائے اس طرف توجہ کی اور پندرہ برس تک اس کدو کاوش میں رہا بالآخر اس نے یہ الفاظ کہے۔

"میں نے خاص اپنے گھر میں جہاں میرے احباب کے سوا کوئی موجود نہ تھا بغیر کسی درمیانی شخص کے قطعی طور پر اس کا تجربہ کیا۔ جن لوگوں سے بات چیت ہوئی وہ مرے ہوئے میرے عزیز و اقارب تھے۔"

مارکس نے جو مشہور رجیالوجسٹ فاضل ہے ایک علمی پرچہ میں لکھا کہ میں نے تمام وہ کتابیں جو روح کی رد میں لکھی گئیں تھیں پڑھیں اور ان تمام لوگوں سے مناظرے کئے لیکن میں نے یہ مشاہدات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور دس برس تک تجربے کرتا رہا یہاں تک کہ اب میں ان مشاہدات پر بہ علم و رویت گفتگو کر سکتا ہوں۔

مارگن جو علوم ریاضیہ کا پریسیڈنٹ تھا۔ اس نے یہ شہادت دی کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے جو دیکھا اور اپنے کانوں سے جو سنا اس نے مجھ کو ایسا مطمئن کر دیا ہے کہ شک کا احتمال بھی نہیں رہا۔

غرض اس قسم کی تحقیقات کی اگر تفصیل لکھی جائے تو ایک کتاب طیار ہو سکتی ہے۔ یہاں صرف مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے وہ اصحاب جن کی آنکھیں بعض کم درجہ کے مادئین کی ملمع کاریوں سے خیرہ ہو گئی ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں پھر غور و فکر کریں

محمد خلیل الرحمن (سال دوم شعبہ دینیات)

مغل اور گولکنڈہ

عہد شاہجہاں تک

یہ مضمون عبدالوہاب صاحب مسلم کے امتحان ایم۔ اے کے مقالہ کا ابتدائی جز ہے۔ مسلم صاحب یوں تو تاریخ کے طالب علم ہیں لیکن ساتھ ہی زبان و ادب کا نہایت صحیح اور اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں جس کی چاشنی اس مقالہ میں بھی جا بجا موجود ہے۔ یہ مضمون جس محنت اور کاوش سے لکھا گیا ہے۔ اس کی داد ہر وہ شخص دینے کے لئے مجبور ہوگا جو اس کو غور و خوض کے ساتھ پڑھنے کی زحمت گوارا کرے گا۔

مدیر

پندرھویں صدی کے آخر میں بہمنی سلطنت کے حصے بخرے شروع ہوئے اور عماد شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں قطب شاہی سلطنت نے سب سے آخر یعنی ۱۵۱۲ء میں اعلان خود مختاری کرکے اپنا دارالسلطنت گولکنڈہ مقرر کیا۔

ان سلطنتوں کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۵۲۶ء میں بابر کے ہاتھوں، شمالی ہند میں عظیم الشان مغل سلطنت

کی بنیاد پڑی۔ بابر اور ہمایوں کی زندگی نے وفا نہ کی، لیکن اکبر کو موقعہ ملا اور اتنا اقتدار بھی کہ اپنی سلطنت کے حدود کو
وندھیاچل کے جنوب میں پیشرو ہندو راجاؤں کی طرح وسعت دے۔ جہانگیر اور شاہجہاں نے بھی اس مسلک کی پیروی کی
لیکن مغلوں کی یہ آرزو کہ پورے ہندوستان پر اپنا پرچم لہرائیں اس خاندان کے چھٹے عظیم الشان اور عظیم المرتبت بادشاہ
اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں پوری ہوئی، جس نے ۱۶۸۷ء میں دکن کی آخری سلطنت قطب شاہیہ کو فتح کر کے مغل
سلطنت میں اس کا الحاق کیا۔

اکبر کے دکن کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ہی ۱۵۷۴ء میں نظام شاہی سلطنت نے برار پر قبضہ کر کے عماد شاہی سلطنت
کا خاتمہ کر دیا تھا اور بیدر کے بریدی خاندان کے قبضہ میں صرف خاندیش کا مختصر سا علاقہ باقی تھا۔ ۱۵۹۱ء میں اکبر
نے اپنے سفیر دکنی درباروں میں بھیجکر مطالبہ کیا کہ وہ شہنشاہ دہلی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر لیں۔ خاندیش نے اطاعت کی
لیکن احمد نگر بیجاپور اور گولکنڈہ نے انکار کر دیا، جس پر ۱۵۹۳ء میں عبدالرحیم خانخاناں کے تحت دکن کے خلاف ایک
زبردست فوج بھیجی گئی، جس سے چاند بی بی نے احمد نگر میں بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن آخر کار مجبور ہو کر ۱۵۹۶ء
میں نظام شاہیوں نے صلح کر کے برار مغلوں کے سپرد کر دیا۔ یہ صلح زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ نظام شاہیوں نے
برار واپس لینے کی کوششیں کیں تو مغلوں نے احمد نگر فتح کر لیا، لیکن آپس کے اختلافات کی وجہ سے مغل فوجیں اس
کامیابی سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، اور اکبر نے دکنی فتوحات میں مشکلات، انتظامی دقتوں اور دکنیوں کے زبردست
مقابلہ کو دیکھ کر بیجاپور اور گولکنڈہ کی تسخیر کا ارادہ ترک کر دیا۔

۱۶۰۹ء میں بیجاپور نے بریدشاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت نظام شاہیوں کو خوش قسمتی سے ملک عنبر
ایسا لائق مدبر اور سپہ سالار مل گیا تھا جس نے نہ صرف نظام شاہی سلطنت کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل
کر لیا بلکہ اسے ایک زبردست قوت بھی بنا کر گولکنڈہ کو چار لاکھ ہون سالانہ خراج دینے پر مجبور کیا[1]۔ احمد نگر پر مغل
قبضہ کر چکے تھے۔ لہذا اس نے موجودہ اورنگ آباد کے قریب کھڑکی نامی قصبہ کو نظام شاہیوں کا دارالحکومت قرار
دیا، بیجاپور کے علاقہ میں لوٹ مار شروع کی اور کچھ علاقہ پر قبضہ بھی کر لیا۔ اس نے برگیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا اور
وہ طریقہ جنگ شروع کیا جسے خافی خاں اور دیگر مورخ "برگی گری" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طریقہ جنگ کو آخر کار

[1] خافی خاں جلد اول صفحہ ۲۷۴ و بادشاہ نامہ عبدالحمید جلد اول حصہ ۲ صفحہ ۱۷۱

سیواجی اور اس کے جانشین کام میں لائے یا دکنی سلطنتوں کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کے بعد مغل سلطنت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور دکن کے شاداب خطہ کو تباہ و برباد کر دیا۔

دہلی دورہتی؛ ملک عنبر نے بیجاپور اور گولکنڈہ سے اتحاد کیا اور ۱۶۱۵ء کے قریب نظام شاہی اور عادل شاہی حکومتوں نے مغلوں کے چند دکنی علاقے دبا لئے۔ ان میں احمد نگر بھی شامل تھا جسے بڑی مشکلوں اور خون فشانیوں کے بعد مغلوں نے حاصل کیا تھا؛ لہذا ۱۶۱۷ء میں جہانگیر نے شہزادہ خرم کو دکن کی طرف بھیجا۔ مغلوں کی جارحانہ کارروائیوں کے سامنے مجبور ہو کر دکنی سلطنتوں کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ عادل شاہ نے اطاعت کی، شہر سے پانچ کوس آگے آکر شاہی فرمان کا استقبال کیا، اور شاہی سفیروں افضل خاں اور رائے رایاں کے سامنے وعدہ کیا کہ تمام شاہی محالات مع احمد نگر واپس کر دئے جائیں گے اور میں ہمیشہ شہنشاہ کی اطاعت کروں گا۔ اس نے رائے رایاں کو دو لاکھ روپیہ دیا اور شہنشاہ کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ کی نقد جنس بطور پیشکش بھیجی۔ اس زمانہ میں میر مکی اور رائے جادو داس گولکنڈہ بھیجے گئے تھے قطب شاہ نے پانچ کوس آگے آکر فرمان کا استقبال کیا اور پندرہ لاکھ روپیہ کی پیش کش روانہ کی جس کے بعد شاہجہاں واپس ہوا؛ لیکن اس کی واپسی پر دکنی سلطنتوں نے پھر سر اٹھایا، اور متحد ہو کر قطب شاہ، عادل شاہ اور نظام شاہ نے بالاگھاٹ کے مغل علاقہ پر قبضہ کر لیا؛ شاہی لشکر کو شکست دے کر بھگا دیا؛ مغل علاقہ میں خوب لوٹ مار کی، اور برہانپور کا محاصرہ کر لیا؛ جس سے مغل حکام نے سخت پریشان ہو کر شہنشاہ کی خدمت میں مدد کے لئے عرضداشتیں بھیجیں۔ جہانگیر نے اطلاع پا کر بہت جلد ۲۶ ڈسمبر ۱۶۲۰ء کو حکم دیا کہ شاہجہاں فوراً دکن روانہ ہو، جو حسب الحکم یلغار کرتا ہوا ملک عنبر کے سر پر پہنچا اور پے درپے شکستیں دیں جس سے مجبور ہو کر ملک عنبر نے اطاعت کی اور وعدہ کیا کہ اگر مجھے معاف کیا جائے تو تمام شاہی علاقہ واپس کر کے چودہ لاکھ روپیہ کے نئے محالات نذر کروں گا۔ اس کے علاوہ اس نے دیگر سلاطین دکن کی جانب سے پیشکش وصول کر کے ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ شاہجہاں نے اس کی عرضداشت کو قبول کیا اور تصفیہ یہ ہوا کہ اکبر کے وقت سے جن پرگنات اور محالات پر مغلوں کا قبضہ ہو چکا ہے ان کو واپس لیں۔ ان محالات کی آمدنی چودہ کرور دام یعنی پچیس لاکھ روپیہ تھی۔ واپسی محالات اور پیشکش کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ دکنی حکومتیں پچاس لاکھ روپیہ نقد بھی ادا کریں۔ ملک عنبر نے جملہ شرطیں قبول کر لیں اور اس کی درخواست پر شہنشاہ نے فیصلہ کیا کہ اس پچاس لاکھ روپیہ میں سے

لہ مزا کی وجادو داس دیوان بیوتات؛ مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۵۱۷

عادل خاں بیس لاکھ، قطب الملک اٹھارہ لاکھ، اور نظام الملک بارہ لاکھ روپیہ ادا کرے۔ یہ معاہدہ جلد پورا کیا گیا اور تینوں سلطنتوں سے خراج پہنچنے پر شاہزادہ شاہ خرم واپس ہوا[۵۰]

اس طرح سنہ ۱۶۲۰ء میں یہ سلطنتیں مغلوں کی باجگذار بن گئیں۔ ان کے دار الحکومتوں میں مغل حاجب رہ کر اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے لگے ان کو شاہی فرمان کا استقبال کرنا پڑتا اور ہر وقت شہنشاہ کی خفگی کا اندیشہ لگا رہتا۔ وہ شکست خوردہ تھے اور حالات کے تحت مطیع ہو گئے لیکن ان حکمرانوں کے دلوں میں اب بھی آزادی اور خودمختاری کا جذبہ باقی تھا[۵۱] چنانچہ اکثر موقعوں پر مختلف قسم کے بہانے کرکے فرامین کا استقبال کرنے سے گریز اور پیشکش ادا کرنے میں پس و پیش کرتے؛ حاجبوں کی خاطر و مدارات کرکے اور رشوتیں دیکر راضی کر لیتے؛ تاکہ ان کا بھرم باقی رہے اور یہ حاجب شہنشاہ کے پاس ان کی شکایت نہ لکھیں۔ مغلوں کا برتاؤ بھی ابتداً زیادہ سخت نہ تھا بلکہ بعض اوقات یہ مراسم خوشگوار کہلائے جاسکتے تھے چنانچہ جس وقت شاہجہاں سنہ ۱۶۲۲ء میں جہانگیر کے خلاف بغاوت کرکے دکن آیا اور ملک عنبر عادلشاہ اور قطب شاہ سے مدد مانگی تو ملک عنبر نے صاف انکار کیا اور بیجاپور نے اس کے سفیر کی توہین کی مگر گولکنڈہ کی طرف سے اس کی خاطر و مدارات ہوئی جس سے شاہجہاں بہت خوش ہوا۔ سنہ ۱۶۲۶ء میں باپ اور بیٹے میں صلح ہو گئی[۵۲] لیکن شاہجہاں کو گولکنڈہ کا خاص خیال رہا اور قطب شاہ بھی شاہجہانی سفیر کا دیگر سلاطین کے مقابلہ میں زیادہ خیال رکھتا اور اس کی خاطر و مدارات کرتا۔ چنانچہ اسی سال سنہ ۱۶۲۶ء میں جب عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا تو شاہزادہ خرم کی طرف سے اخلاص خاں قزوینی تہنیت و مبارکباد کے علاوہ "تبرکات مرغوب و مکتوبات محبت اسلوب" لے کر آیا "مقربان اورنگ خورشید بادشاہ سکندر جاہ تعظیم و تکریم او کما ینبغی شمردند و بہ نسبت حجاب دیگر او را منزلے وسیع مرحمت فرمودند و باحسان و اکرام بادشاہی مفتخر و مباہی گردید۔۔۔ حاجب شاہزادہ عالمیان را کہ بہت ادائے وظائف مبارکباد و تہنیت آمدہ بود و مدعیات نیز عرضداشتہ مستدعیات الیشان بعز اجابت اقتران یافت"[۵۳]

---

[۵۰] خافی خان جلد اول صفحہ ۳۰۴ تا ۳۲۲

[۵۱] یہ جذبہ آخر تک باقی رہا چنانچہ بقول خان سعادت خاں حاجب سلطان ابوالحسن قطب شاہ نے کہا تھا کہ "ما ہم بادشاہ بیا لکہ مگر گرفتہ شوم" جلد دوم صفحہ ۲۹۵

[۵۲] میرے پاس ایک مخطوطہ میں جہانگیر کا خط خرم کی بغاوت کے متعلق نثر اور اس کا جواب نظم میں موجود ہے جو مجھے بمبئی میں دستیاب ہوا

[۵۳] حدیقۃ السلاطین۔ قلمی دفتر دیوانی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ۶ فروری ۱۶۲۸ء کو شاہجہاں تخت نشین ہوا تو بیجاپور اور گولکنڈہ کے پیام تہنیت و مبارکباد آئے[1] لیکن یہ تعلقات دیرپا نہ تھے۔ خانجہاں صوبہ دار دکن تھا اس نے بالا گھاٹ کا مغل علاقہ عادل شاہ کے سپرد کردیا اور خود آگرہ پہنچا لیکن شہنشاہ کے خوف اور قتل کئے جانے کے وہم سے پریشان ہوکر دکن میں نظام شاہ کے پاس پناہ لی۔ شاہ جہاں نے مطالبہ کیا کہ اسے واپس کردیا جائے لیکن احمد نگر نے جواب دیا کہ اسے ہم نے بلایا نہیں خود آیا ہے۔ شاہجہاں بہت غضبناک ہوا لیکن موقعہ کی نزاکت دیکھ کر خود دکن روانہ ہوا۔ اور برہان پور پہنچکر عادل شاہ اور قطب شاہ کے پاس حاجب روانہ کئے گولکنڈہ میں اس کے حاجب شیخ محی الدین کی بڑی خاطر و مدارات ہوئی اور قطب شاہ نے اس کے قیام گولکنڈہ ۱۶۲۷ تا ۱۶۲۱ء کے زمانے میں اسے اور اس کے اقربا کو ایک لاکھ پچاس ہزار ہون نقد، دس ہاتھی پچاس عراقی گھوڑے اور خلعت مرحمت کئے۔[2]

معلوم ہوتا ہے کہ جب عبداللہ قطب شاہ کی نوعمری سے دکنی حکومتیں اور مغل سلطنت گولکنڈہ سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اس زمانے میں انھوں نے بعض بیجا مطالبات پیش کئے، خصوصاً شیخ محی الدین نے جس کے پاس ہر ماہ شاہی ہرکارہ آکر مطالبات پورے کئے جانے اور اس کی واپسی پر زور دیتا تھا۔[3] یہ حالت دیکھ کر سلطان عبداللہ نے شاہ محمد کو برطرف کرکے اس کی جگہ شیخ محمد کو پیشوا مقرر کیا شاہ محمد پر نا اہلی کا الزام لگایا گیا اور شاہی معاملات میں خیانت کرنے کی بنا پر اسی کے مکان میں نظر بند کردیا گیا نئے پیشوا نے آصف خاں اور دیگر امرا کے پاس خطوط بھیجکر شاہ جہاں سے یہ حکم لے لیا کہ "من بعد شیخ محی الدین تخلف از رضائے خاطر آن قطب فلک جاہ و جلال نہ نمودہ در جمیع امور متابعت نماید"[4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محی الدین بیزادہ اپنے کو شہنشاہ کا حاجب تصور کرکے قطب شاہ کو دھمکیاں دیتا اور بیجا مطالبات پیش کرکے مجبور کرتا تھا کہ رشوت دے کر اسے رام کرے۔ شاہجہاں نے بقول نظام الدین صاعدی اپنے حاجب کو قطب شاہ سے اس کے برتاؤ کی بنا پر صرف سرزنش ہی نہیں کی بلکہ جس وقت وہ ۳ اپریل ۱۶۳۱ء کو یوسفانا المخاطب بہ وفا خاں حاجب گولکنڈہ کے ساتھ برہان پور پہنچا اور گولکنڈہ کی جانب سے "موازی چہاردہ لک روپیہ جواہر و مرصع آلات بہا از نقد و فیلان کوہ پیکر و دیگر امتعہ نفائیس گولکنڈہ" پیش کرنے کے بعد خود اپنی جانب سے

---

۱ عبدالحمید جلد اول حصہ صفحہ ۲۷۴
۲ حدیقۃ السلاطین قلمی و حدیقۃ العالم صفحہ ۳۲۲
۳ حدیقۃ السلاطین قلمی و حدیقۃ العالم صفحہ ۲۲۲
۴ حدیقۃ السلاطین

ایک لاکھ روپیہ کے جواہر پیش کئے،[۵] تو شاہجہاں نے قطب شاہی حاجب پر عنایت کی اور "شیخ محی الدین مغضوب و مردود گردید" " " "خوار و بے اعتبار شد و اقربائے او را نیز تادیب بلیغ نمودند"[۱۰] اس کے بعد اُسے جو کچھ گولکنڈا سے ملا تھا سب ضبط کر لیا[۱۱] دفا خاں کو ۲۲ مئی ۱۶۳۱ء کو خلعت و دس ہزار روپیہ انعام ملا؛ جس نے شاہجہاں کے سلوک کی تمام کیفیت لکھ کر گولکنڈہ بھیجی لیکن تعجب ہے کہ شاہ جہاں کے درباری مورخین نے پیشکش کا ذکر تو کیا ہے لیکن شیخ محی الدین کو سزا دینے اور اس کا مال ضبط ہونے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ شاہ جہاں کے مطالبات جن کی بنا پر ہر ماہ شیخ محی الدین کے پاس ہرکارہ آتا تھا کیا تھے معاصر تاریخیں خاموش ہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ غالباً عادل شاہ کو مدد نہ دینے اور پیشکش بھیجنے کے متعلق تھے جس کا تصفیہ ایام شاہزادگی میں ہو چکا تھا۔ گولکنڈہ کا بادشاہ اس کو اپنی توہین اور آزادی کے خلاف تصور کر کے لیت و لعل کر رہا تھا لیکن اتفاقاً شاہجہاں کو، خان جہاں کی بغاوت کچلنے اور نظام الملک کی تنبیہہ کے لئے دکن آنا پڑا۔ اس نے عادل شاہ سے ایک معاہدہ کر کے صابر بیگ المخاطب بہ نصیری خاں کو قطب شاہی سرحد پر بھیجدیا تا کہ ادھر سے مدد نہ آسکے۔ قطب شاہی پالیسی کے متعلق حدیقۃ العالم کا بیان ہے کہ "خاقان زمان کہ باطناً با عادل شاہ متفق بود، ظاہرا رعایت جانب بادشاہ عالمیان شاہجہان می نمود بنا بر صلاح وقت سپاہ عادل شاہ را مدد خروج مرحمت فرمود تا بر سر مغل رفتہ محاربہ نماید"[۱۲] نصیری خاں کے آنے کی خبر سنکر گولکنڈہ نے احتیاطاً آدم خاں حبشی اور اللہ قلی بیگ وغیرہ سرحد کی حفاظت کے لئے کولاس بھیجے گئے۔ اس زمانہ میں سید میر جو کنکوٹہ اور کلنگ میں سپہ سالار تھا، عریضہ بھیجا کہ باقر خان نجم ثانی صوبہ دار بنگالہ اس طرف آیا ہے اور اس نواح میں اس کا لشکر بے اعتدالیاں کر رہا ہے لہذا کمک کی ضرورت ہے۔ عبداللہ قطب شاہ نے سید عبداللہ شاہ قلی ولد سبحان قلی، اور یاقوت خاں حبشی وغیرہ کو کنکوٹہ روانہ کیا اور سید عبداللہ کو سپہ سالار بنا کر تاکید کی کہ سرحد کی اچھی طرح حفاظت کی جائے۔ سید عبداللہ یلغار کرتا ہوا کنکوٹہ کے قریب پہنچا؛ اپنے چند سواروں کو باقر خاں کے مقابلہ میں روانہ کیا اور خود کوہ سیاہ کے قریب قیام کیا۔ قطب شاہ اور مغل لشکروں میں ایک خون ریز جنگ ہوئی اتفاق سے وہاں دلدل تھی شاہ قلی دلدل میں پھنس کر مارا گیا۔ قطب شاہی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے

---

[۹] حدیقۃ السلاطین (قلمی)، وعبدالحمید جلد اول حصہ ۲ صفحہ ۳۶۶ [۱۰] حدیقۃ السلاطین

[۱۱] حدیقۃ العالم صفحہ ۳۲۳۔ [۱۲] حدیقۃ العالم صفحہ ۳۲۵۔

اور مغلوں کو فتح ہوئی۔ سید عبداللہ نے مدد طلب کی تو خواجہ افضل ترک، حاکم مرتضیٰ نگر روانہ کیا گیا اور اس نواح کے جملہ نایک واڑیوں کو حکم ہوا کہ سرحد کی حفاظت کریں اس کے ساتھ ہی شیر خاں کو حکم ہوا کہ وہ راج مندری جاکر قلعہ کو مستحکم کر کے حفاظت کرے۔ چنانچہ وہ دھاوے مارتا ہوا باقر خاں سے پہلے وہاں پہنچ گیا[۱] لیکن اس اثنا میں باقر خاں نے مئی ۱۶۲۹ء میں کھیرا باڑا اور ۲۴ دسمبر ۱۶۲۹ء کو قلعہ منصور گڈھ فتح کر لیا قطب شاہیوں کو ہر جگہ زک ہوئی اور شیر خاں کو بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ نایک واڑیوں کے گڈھ اور قلعے فتح ہوگئے اور انھوں نے ہتھیار ڈالدئے، جس کے بعد نصیری خاں قلعہ قندھار کی تسخیر کو بھیجا گیا، ایک زبردست اور خونخوار مقابلہ کے بعد یہ قلعہ بھی مغلوں کے ہاتھ آگیا عادل شاہی و نظام الملکی فوجیں جو مدد کو آئی تھیں شکست کھا کر بھاگ گئیں اور مغل فوجوں نے نظام الملکی علاقہ کو خوب تباہ و برباد کیا۔ یہ حالت دیکھ کر عبداللہ قطب شاہ نے اظہار ندامت کیا اور پیشکش بھیجی۔ شاہجہاں نے بھی "نظر بر ایں کہ طریقہ الطاف با خدیو جہاں (عبداللہ قطب شاہ) مرعی میداشت وظاہرا در مقام تلافی و تدارک حقوق سابق بود، فرامین بہ باقر خاں ارسال فرمود کہ "ترک جرأت نمودہ و ولایات مفتوحہ را و وکلائے قطب شاہ سپردہ بہ بنگالہ مراجعت نماید[۲]"

شیخ محی الدین کے مال و اسباب کی ضبطی، اور معتوب ہونے کی غالباً ایک بڑی وجہ یہ بھی کہ شاہجہاں کے بار بار بلانے پر بھی شیخ محی الدین واپس نہ ہوتا تھا۔ شہنشاہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اس کا حاجب گولکنڈہ کے دئے ہوئے مال سے دولتمند ہو۔ مغل دربار میں کسی کو ہاتھی دیا جانا بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا اور قطب شاہ نے شیخ محی الدین کو کثیر روپیہ ہاتھی، گھوڑے اور دیگر مال و اسباب عطا کئے تھے جس کی وجہ سے اس نے شہنشاہی احکام پر عمل کرنے میں بے پروائی برتی تھی اگر اسے سزا نہ دی جاتی تو دوسرے حاجب بھی شاہی اغراض و مقاصد کے خلاف گولکنڈہ کی رعایت اور اعانت کر کے دولت حاصل کرتے بہر حال چونکہ اس وقت شہنشاہ گولکنڈہ کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینا چاہتا تھا اس لئے صرف پیشکش پر اکتفا کر کے قطب شاہ کے مفتوحہ علاقے واپس کر دئے اور خود نظام الملک اور خان جہاں کے استیصال میں مصروف رہا۔ خان جہاں نے زبردست مقابلہ

---

[۱] حدیقۃ العالم صفحہ ۳۲۵

[۲] شاہجہاں کے برہان پور جانے کے بعد باقر خاں بنگالہ واپس ہوا۔ حدیقۃ العالم صفحہ ۳۲۲

کیا لیکن آخر کار اس کے بازو ٹوٹ گئے اور بے یار و مددگار چند ہم قوم ہمراہیوں کے ساتھ آگرہ کی طرف بھاگا مگر شاہی لشکر نے تعاقب کر کے جھانسی کے قریب اس کا خاتمہ کر دیا۔

شاہجہاں کا دکن پر حملہ اور ۱۶۳۶ء کا عہدنامہ

مغلوں نے نظام شاہی علاقہ تباہ و برباد کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ اس پر قبضہ کر رہے تھے؛ تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے قلعہ دھارور بھی فتح کر لیا جو بہت مستحکم اور اہم تھا۔ عادل شاہ سے اس سے قبل معاہدہ ہو چکا تھا کہ مغلوں کی مدد کرنے پر اُسے نظام شاہی علاقہ کے پانچ قلعے (جن میں دھارور بھی شامل تھا) کوکن کے کچھ علاقوں کے ساتھ دئے جائیں گے؛ لیکن عادل شاہ یہ نہ چاہتا تھا کہ نظام شاہی سلطنت کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ دکنی سیاسیات کا اقتضا بھی یہی تھا۔ اب تک وہ مغلوں کی مدد کرنے سے پہلوتہی کرتا رہا لیکن دھارور فتح ہونے کے بعد اس نے اپنے سردار رندولہ خاں کو بھیجا اور یہ علاقہ طلب کئے۔ اگر اعظم خاں نے یہ کہلا کر کہ "عادل شاہ نے اب تک کوئی مدد نہیں دی ہے؛ اس کو چاہیے کہ مدد دے کر اپنی وفاداری اور ایفائے عہد کا ثبوت دے۔ اس وقت حسب معاہدہ یہ قلعے اسے ضرور دے جائینگے" قلعہ پرینڈہ کا محاصرہ کر لیا۔ نظام الملکی سرداروں نے پریشان ہو کر عادل شاہ کو لکھا کہ نظام شاہی علاقہ تو ختم ہو رہا ہے پرینڈہ کی فتح عادل شاہی سلطنت کے خاتمے کی تمہید ہوگی۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم اور آپ ملکر مغلوں کا مقابلہ کریں۔ پرینڈہ عادل شاہی سرحد کا اہم ترین قلعہ تھا اس لئے عادل شاہ بھی گھبرا رہا تھا۔ چونکہ وہ خفیہ طور پر نظام شاہی سرداروں کی مدد کر رہا تھا اور حسب معاہدہ مغلوں کو مدد بھی نہیں پہنچائی تھی اس لئے اس کا خوف اور زیادہ بڑھ گیا اور اب اس نے اپنی فوجیں علانیہ نظام شاہی سرداروں کی مدد کو بھیجیں۔ چنانچہ انکی متفقہ فوج کی کوششوں اور آذوقہ کی کمی کے باعث مجبوراً اعظم خاں کو پرینڈا کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔

اسی زمانہ میں پے درپے شکستوں کے باعث برہان نظام شاہ کے دماغ میں فتور آ گیا اور اس نے فتح خاں ابن ملک عنبر کو جسے ناراض ہو کر اس نے قید کر دیا تھا، رہا کر دیا لیکن یہ رہائی خود نظام شاہ کی قید اور موت کا باعث ہوئی کیونکہ لوگوں کے بھڑکانے سے فتح خاں نے برہان نظام شاہ کو قید کر کے آخر میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اس کے

دس سالہ لڑکے حسین نظام شاہ کو تخت نشین کرکے خود ۱۶۳۳ء میں شہنشاہ کی اطاعت کرلی

اب چونکہ خان جہاں کا خاتمہ اور نظام الملک کا استیصال ہوچکا تھا، اور انھیں ایام میں ممتاز محل بیگم کا انتقال بھی ہوگیا تھا، جس سے شہنشاہ نہایت غمگین تھا اس لئے دکن میں زیادہ قیام کو غیر ضروری تصور کرکے ۱۶۳۱ء کے وسط میں برہان پور ہوتا ہوا آگرہ واپس ہوا لیکن اُس کے واپس ہوتے ہی دکنی حکومتوں نے پھر سر اُٹھایا اس کا سبب یہ تھا کہ شاہ جہاں نے فتح خاں کی اطاعت سے خوش ہوکر نظام الملک کے چند محالات جو اس سے قبل ساہو کو دئے گئے تھے، اسے عنایت کئے۔ ساہو نے ناراض ہوکر بیجاپور میں پناہ لی اور دولت آباد پر حملہ کیا۔ فتح خاں کے مدد مانگنے پر مغل سپہ سالار مہابت خاں ادھر روانہ ہوا۔

مغلوں کے کامیاب حملے غارتگری اور اپنی بے بسی دیکھ کر دکھنی حکومتوں کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور ان کو اپنی تباہی بلکہ خاتمے کے آثار نظر آرہے تھے چنانچہ انھوں نے ایک دوسرے کی مدد کو اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھ کر پیام وسلام کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ مغل فوج نے ساہو اور نرہری پنڈت سپہ سالار بیجاپور کو شکست دی جنھوں نے فتح خاں کو وقتی مصالح سمجھا کر ملالیا۔[1] مغلوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس پر حملہ کردیا اور اس نے خود میں مقابلہ کی سکت نہ پاکر قلعۂ دولت آباد میں پناہ لی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بیجاپوری فوجیں مدد کو پہنچ گئیں، جس کے بعد مغلوں اور دکھنیوں میں کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں اور گھمسان کے رن پڑے۔ محصورین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخر کار غلہ کی کمی اور محاصرہ کی سختی سے تنگ آکر فتح خاں نے ۲ جون ۱۶۳۳ء کو قلعہ خان خاناں کے سپرد کردیا مگر مہابت خاں نے خلاف وعدہ فتح خاں اور نظام الملک کو قید کرکے شاہ جہاں کے پاس بھیجا۔[2] جس نے فتح خاں کا وظیفہ مقرر کرکے نظام شاہ کو قلعہ گوالیار یعنی مغلوں کے شاہی قیدخانہ میں قید کردیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عادل شاہ نے فتح خاں کو مدد بھیجتے وقت اپنے سفیر شیخ دبیر نامی کو عبداللہ قطب شاہ کے پاس حیدرآباد روانہ کیا تھا جس نے قطب شاہی دربار میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ مغلوں کے حملے ہورہے ہیں اور ان سے دونوں سلطنتوں کی تباہی کا اندیشہ ہے لہذا بیجاپور اور گولکنڈہ کو متحد ہوجانا چاہئے۔ اس سفیر کا استقبال گولکنڈہ میں بڑے تپاک سے ہوا بجائے سابق سرد مہری کے گرمجوشی کا اظہار ہونے لگا اور تعلقات معاندانہ کے بجائے دوستانہ ہوگئے۔ اگرچہ یہ خاندان عرصہ سے ازدواجی رشتوں سے وابستہ تھے اور

[1] خافی خاں جلد اول صفحہ ۴۷۶ تا ۴۸۰

[2] حدیقۃ العالم ۳۵۲

سلطان محمد قلی کی ہمشیر جہاں آرا بیگم کی شادی ابراہیم عادل شاہ سے ہوئی اور اس کے بعد سلطان محمد قطب شاہ نے عادل شاہ کی بیٹی سے شادی کی تھی لیکن تعلقات کو زیادہ مستحکم اور استوار بنانے کے لئے سلطان محمد عادل شاہ نے خاقان جنت مکان سلطان محمد قطب شاہ کی بیٹی سے شادی کا پیام دیا۔ جسے عبداللہ قطب شاہ نے بخوشی منظور کیا چنانچہ بڑی دھوم دھام سے شادی ہونے کے بعد ۱۶۳۳ء میں رخصتی عمل میں آئی۔[1]

یہ شادی درحقیقت اس سیاسی خلفشار کا نتیجہ تھی جو شاہجہاں کے دکن میں آنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا چنانچہ فتح خاں پر حملہ ہونے پر نہ صرف عادل شاہ نے مدد بھیجی بلکہ قطب شاہ سے بھی مدد مانگی جہاں سے خفیہ طور پر روپیہ روانہ کیا گیا۔ مہابت خاں نے اپنی مشکلات دیکھ کر شہنشاہ کو لکھا کہ کسی شہزادہ کو امداد کے لئے روانہ کیا جائے شاہجہاں نے شجاع کو مع اس کے اتالیق سید مظفر کے، روانہ کیا لیکن اس کی کاہلی اور عیش پرستی نے ناکامی کا منہ دکھایا۔ مہابت خاں نے شاہزادہ کو ساتھ لے کر قلعہ پرینڈہ کا دوبارہ محاصرہ کیا، جو اس وقت عادل شاہ کے قبضہ میں تھا لیکن چار ماہ تک محاصرہ کرنے کے بعد بے نیل و مرام واپس ہوا شاہجہاں کو قلعہ دولت آباد دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اسی زمانہ جھجھار سنگھ شکست کھا کر دکن کی طرف بھاگ آیا تھا۔ مہابت خاں اور شجاع کو محاصرہ پرینڈہ میں ناکامی ہوئی تھی، دکنی سلطنتوں نے عرصہ سے پیشکش نہیں بھیجی تھی ان میں آپس میں مغلوں کے مقابلہ میں اتحاد اور معاہدے ہو رہے تھے جو مغل سلطنت کے مفاد کے خلاف تھے۔ اسی زمانہ میں ساہو نے نظام الملک کے خاندان سے ایک بچے کو لے کر برائے نام تخت نشین کر کے لوٹ مار بھی شروع کر دی تھی اس لئے شاہجہاں نے دکن جانا ضروری سمجھا۔ عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے " عادل خاں از مستی بادہ نا خوردی جمع از فتنہ ... نظام الملکیہ را، خصوصاً ساہو فساد خو کہ بعضی محال ملک بے نظام بہ تصرف آوردہ بود ہر لحظہ دود سودا از کانون سر بے مغز ش سر بر میزد اعانت نمودہ در ارسال پیشکش تعلل می ورزید و قطب الملک نیز عروہ و ثقائے بندگی و حبل متین عبودیت از دست دادہ با عادل خاں راہ موافقت می پیمود "[2]

شاہجہاں گولکنڈہ سے زیادہ ناراض تھا کیونکہ یہاں کے سلاطین نہ صرف پیشکش نہ بھیجتے اور عادل شاہ کی مدد کرتے تھے بلکہ مساجد میں شاہ ایران کے نام پر خطبہ پڑھا جاتا اور خلفائے ثلاثہ کو علانیہ برا بھلا کہا جاتا۔ ان

---

[1] حدیقۃ العالم صفحہ ۳۳۷ تا ۳۴۵
[2] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۲۵

حالات کو سن کر شاہجہاں نے مکرمت خاں دیوان بیوتات کو بیجاپور بھیجا اور عبداللطیف گجراتی کو ایک فرمان دیکر گولکنڈہ روانہ کیا جس کا خلاصہ یہ ہے:-

" بہ مسامع جاہ وجلال رسیدہ کہ در ملک آن قطب فلک شوکت علی رُوس الاشہاد سب اصحاب کبار کہ آیات قرآن مجید و فرقان حمید دلالت میکند بر فضل ایشاں " " " " می نماید و آن ایالت پناہ منع نمیکند و بہ سزائے اعمال شنیع ساند بنا بر ایں از روے ارشاد حکم می فرمائیم کہ (۱) از ملک خویش ایں امر قبیح و فعل شنیع برطرف گرداند و اگر بدبختے از بے سعادتی مرتکب شود او را سیاست نماید و اگر چنیں نخواہد کرد " " " در ین صورت بر ما لازم است کہ در مقام تسخیر آں ملک شویم " " " و دیگر بعرض رسید کہ (۲) کہ خطبہ را در آن ملک بنام فرمانروائے ایران می خوانند۔ ہر گاہ آں ایالت پناہ دعوئ مریدی ما می نمودہ باشد با فرمانروائے ایران چہ رجوع دارد۔ باید کہ بعد ازیں نام فرمانروائے ایران در خطبہ مذکور نہ سازد و دراں ملک خطبہ بنام نامی و القاب سامئی ما مزید باشد و دیگر مبلغ کلی از بابت پیشکش آں ایالت و شوکت پناہ را باید داد چنانچہ تفصیل آن ادا و راقمے کہ بدستخط دیوانیان کرام رسیدہ و ہمراہ ایں فرمان عالی شان فرستادہ شدہ معلوم خواہد شد آن را ادا نماید " " " " خدمتے کہ ازاں مرحوم (سلطان محمد قطب شاہ) بہ وقوع آمدہ ایں ہمہ عنایت پادشاہ نسبت بآن قطب فلک ایالت می فرمائیم و آں ملک را با و مرحمت نمائیم و در عوض مبلغ مذکور جواہر نفیسہ و مرصع آلات ثمینہ و فیلان بے عیب کلاں نامی مثل ڈاک سمندر و بشیر کہ پدر او بہ عنوان پیشکش فرستادہ بود " " " روانہ بدرگاہ والا گرداند "[1]

ان مطالبات کے بعد مطالبہ کیا گیا تھا کہ یہ پیشکش ایام نوروز میں دولت آباد پہونچ جائے عدم تعمیل کی شکل میں حملہ کی دھمکی دی گئی تھی۔ ۲۱ فروری ۱۶۳۶ء کو شاہجہاں دولت آباد پہونچا اور اپنی فوج کو جو پچاس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی تین حصوں میں تقسیم کر کے قطب شاہی، عادل شاہی، اور نظام شاہی علاقوں پر خان دوراں خان زماں، اور مہابت خاں کے تحت بھیجدیا اور حکم دیا کہ اگر عادل شاہ اور قطب شاہ اطاعت نہ کریں تو قرار واقعی تنبیہ کی جائے۔ خان دوراں مع چند بڑے سرداروں کے قطب شاہی علاقوں پر حملہ کے لئے

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۲

قندھار اور ناندیڑ کی طرف روانہ ہوا۔ اسے حکم ہوا تھا کہ اس علاقے میں، جو عادل شاہی اور قطب شاہی سرحد ہے قیام کرے۔ اور تاخت و تاراج کر کے اوسہ اور اودگیر کے قلعوں کو فتح کرے چنانچہ اس نے اس علاقہ میں پہونچ کر لوٹ مار شروع کی۔ عبداللہ قطب شاہ کو حالات معلوم ہوئے تو اس نے مدد کے لئے ایک جرار فوج بھیجی اور جنگ کے لئے تیار ہونے کا حکم دے دیا۔ اس اثناء میں شاہجہاں کو اطلاع ملی کہ عادل شاہ نے فرمان کی خلاف ورزی کی اور اوسہ و اودگیر کے قلعہ داروں کو روپیہ اور فوج سے مدد دے رہا ہے! اس کے علاوہ ساہو نے اس کی پناہ لی اور عادل شاہ نے اس کی مدد پر رندولہ خاں کو مامور کیا۔ شاہجہان نے حکم دے دیا کہ تمام سردار متفق ہو کر عادل شاہی سلطنت کو تاخت و تاراج کریں لیکن اطاعت کرنے کی صورت میں لوٹ مار اور قتل و غارت سے ہاتھ اٹھالیں۔

واقعہ یہ ہے عادل شاہ کو سفارت کا علم ہوا تو اس نے حسب سابق پانچ کوس آگے بڑھ کر فرمان کا استقبال کیا لیکن دیگر مطالبات کے تصفیہ میں لیت و لعل کر رہا تھا۔ مغل حاجب، مکرمت خاں نے شہنشاہ کو اطلاع دی جس پر اس نے تاخت و تاراج کرنے کے احکامات دئے اور مغل لشکر نے بہت جلد کئی قصبوں اور گاؤں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ یہ حالت دیکھ کر عادل شاہ سخت پریشان ہوا اور اس نے میر ابوالحسن اور قاضی ابوسعید کو شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا جنھوں نے آصف خاں کے ذریعہ حاضر ہو کر عادل شاہ کا عجز و انکسار ظاہر کیا اور اس کی طرف سے شہنشاہ کی خدمت میں پیشکشی حاضر کی۔

قطب شاہ نے مقابلہ کرنا بے سود جانا اور بغیر لڑے بھڑے شہنشاہ کے جملہ مطالبات قبول کر لئے چنانچہ خلفاء ثلاثہ پر تبرہ بند کر کے ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ شہنشاہ ہند کا نام بھی شامل کرایا اور اسی پر اکتفا نہ کر کے سکہ پر بھی شہنشاہ کا نام ثبت کرایا اور پابندی سے پیشکش ادا کرنے کا وعدہ کیا چنانچہ عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ "عبداللہ پذیرائی او امرے کہ در منشور ثبت بود گشتہ خطبہ را باسمائے سامیہ خلفائے راشدین و القاب نامیہ بادشاہ عادل آئین بلند آوازہ گردانید و کر رہنگام خطبہ خواندان حاضر شدہ با نشاندن زر و دادن خلعت بہ خطیب سرمایہ سعادت اندوخت و سکہ را باسم سامی خدیو ہفت اقلیم مزین ساختہ از زر مسکوک بدرگاہ والا ارسال داشت۔ و بہ تنبیہہ پیشکش مقرر گردید"[1]

---

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۴۵

صاحب حدیقۃ السلاطین، نظام الدین صاعدی لکھتا ہے کہ شاہجہاں کے دکن نہ آنے کی خبر سُن کر قطب شاہ نے ملّا تقیائی شیرازی کو مع تحفوں اور ہدیوں کے روانہ کیا تھا جو برہانپور میں آستان بوس ہوا! لیکن شاہجہاں نے دولت آباد پہونچکر عبداللطیف دیوان تن کو بطور حاجب گولکنڈہ روانہ کیا اور خاندوران کو قطب شاہی علاقہ کی سرحد پر بھیجدیا جو ناندیڑ پہنچا۔ یہ مقام قطب شاہی سرحد سے آٹھ فرسخ کے فاصلہ پر تھا۔ قطب شاہ نے حالات سُن کر اپنے بھی چند سردار بھیجدیئے کہ "درآں سمت شوکت قرار گیرید" اور جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ عبداللطیف نے گولکنڈہ کی تیاریاں دیکھ کر لکھا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ گولکنڈہ پر سختی نہ کی جائے اور صرف پیشکش پر اکتفا کریں ورنہ ایسا نہ ہو کہ پیشکش بھی ہاتھ سے جاے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ "از جانب عالی حضرت شاہجہان این تکلیف نیز واقع شدہ بود۔ چنانچہ قبل ازیں در اعیاد و جمعات بہ روش منابر فاتحہ سلاطین عجمی نژاد را در مقدم فاتحہ ایشاں می خواندند بعد ازیں بجائے آں فاتحہ حضرت شاہجہاں بخوانند" اس کے لئے قطب شاہ کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا لیکن مُلّا عبداللطیف نے اپنی چرب زبانی سے شہنشاہ کا یہ مطالبہ بھی منوالیا[۱]

نظام الدین کا یہ بیان کہ شاہجہاں نے اس خوف سے کہ کہیں پیشکش بھی ہاتھ سے نہ جائے قطب شاہ سے صلح کر لی، حالات اور واقعات دیکھتے ہوئے غلط معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ قطب شاہ نے اطاعت کر لی تھی اور ججھار سنگھ کے بھائی اور بیٹے کو گرفتار کر کے بھیجدیا تھا۔ شاہجہاں خونریزی پسند نہ کرتا تھا۔ اپنے جملہ مطالبات بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے پورے ہوتے دیکھ کر اس نے حملہ نہیں کیا۔ چنانچہ عادلشاہ کے خلاف لشکر روانہ کرتے وقت بھی اس نے اپنے سرداروں کو یہی حکم دیا تھا کہ اگر عادل شاہ اطاعت کرے تو اس کے علاقہ پر حملہ نہ کیا جائے۔ خافی خاں کا بیان ہے کہ "ملّا تقی فرستادہ حیدرآباد مطابق حکم روز جشن نوروز با قدرے جواہر و پنج فیل کوہ شکوہ و دیگر تحف کہ قیمت جملہ یک لک و شصت ہزار روپیہ مع عرضداشت تہنیت سال نو رسیدہ ملازمت نمود[۲]" ۵ اگسٹ ۱۶۳۶ء کو شیخ عبداللطیف قطب شاہی حاجب شیخ محمد طاہر کے ساتھ واپس آیا۔ اور مطالبہ کے مطابق چالیس لاکھ روپیہ نقد و جنس از جواہر گراں بہا و مرصع آلات اور سو ہاتھی نر و مادہ پیش کئے جن میں سے دو ہاتھیوں کا ساز و سامان سونے اور دو کا چاندی کا تھا۔ ان کے علاوہ

---

[۱] حدیقۃ السلاطین قلمی دفتر دیوانی [۲] خافی خاں جلد اول صفحہ ۵۲۲ و عمل صالح جلد ۲ صفحہ ۱۴۱

پچاس عربی گھوڑے مع طلائی و نقرئی ساز و سامان و دیگر اشیائے نفیسہ پیش کئے۔

قطب شاہ نے لکھا تھا کہ "ایں مرید موروثی از صدق اعتقاد و وفور اخلاص تعہدی نماید کہ ہموارہ دریں ملک خطبہ چار یار باصفا را " " مزین بنام نامی و لقب گرامی بندگان اعلیٰ حضرت " " درجمع و اعیار لاینقطع میخواند باشد و ہرگز پیرامون روش کہ سابقا خواندہ اند نگردند و پیوستہ بزر سرخ و سفید سکہ مبارک از درگاہ عالم پناہ کندہ فرستادہ اند می زدہ باشند و نیز قبول نمودم کہ از ابتدائے سن نہ جلوس مقدس مبلغ دو لک و ہشت لک روپیہ می شود از جملہ چار لک ہون بابت نظام الملک سال بسال بے عذر و اہمال سرکار خاصہ شریفہ واصل سازم بہ ہیچگونہ اگر بادشاہ زادہ والا گہر بلند اختر نظام بخش صوبہ دکن باشند بخدمت ایشاں بفرستم یا بہر یک از عہد ہائے آں دولت ابد اتصال کہ پرداخت صوبہ مذکور بوائے زرین او مفوض باشد ہشت لک روپیہ از جملہ سی و دو لک روپیہ پیشکش تا آخر سنہ بالقطع بریں نیاز مند درگاہ مقرر شدہ بود باقی ماندہ با دو لک ہون سال متصل کہ سنہ جلوس مبارک باشد بدرگاہ معلیٰ بفرستم و آنچہ تفاوت قیمت اسپاں وغیرہ با موافق قیمت حضور اشرف نسبت بقیمت گولکنڈہ از پیشکش حال مشخص شود ایں مرید موروثی تعہدی می نماید کہ بلا عذر واصل خزانہ عامرہ سازد و در سنوات آئندہ ہم اگر جنسے در جملہ زر پیشکش فرستادہ شود ہمیں طریق سلوک باشد و بعد ازیں ہمیشہ با اولائے دولت عظمیٰ از صمیم قلب یکرنگ و موالف با مخالفاں از تہ دل دشمن باشم"[1]

چونکہ قطب شاہی اطاعت کر رہے تھے جو دکنی سیاسیات اور عادل شاہ کے مصالح کے خلاف تھا اسے خوف ہوا کہ شہنشاہ کے جانے کے بعد عادل شاہ اس کو نقصان نہ پہونچائے لہذا اس نے درخواست میں لکھا کہ "طریقۂ عہد ہائے دولت کہ صوبہ دار دکن باشند آنکہ چوں ہمچنیاں بسبب پیش قدمی ایں نیاز مند در قبول اطاعت و بندگی درگاہ جہاں پناہ کمر بغاوت من جہت بستہ اند اگر احیاناً عادل خانیہ بعد ازیں معاودت را باعث عالیات از کوتہ اندیشی و ناعاقبت بینی دست تطاول بملک ایں نیاز مند دراز کنند ایشاں در دفع شر آنہا ازیں در ملک من ممد و معاون باشند و اگر با وجود آنکہ ایں نیاز مند طلب امداد و اعانت نماید و شود اگر

[1] عبد الحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۷۹

دکن بتغافل بگذارند و عادل خانیہ بعنف و تعدی ازیں نیازمند مبلغ بگیرند آن مبلغ دریں ہشت لک روپیہ پیشکش ہر سالہ مجرا باشند"[1]

عبداللطیف کے ہمراہ نہال چند جوہری جواہرات کے انتخاب اور تعین قیمت کے لئے گیا تھا اس نے قطب شاہ کے ہاتھ میں یاقوت جڑی ہوئی ایک قیمتی انگوٹھی دیکھی اور واپس آکر شہنشاہ سے تعریف کی شہنشاہ نے حکم دیا کہ قطب شاہ کو وہ انگوٹھی بھیجنے کے لئے لکھا جائے۔ قطب شاہ نے نوشتہ پاتے ہی وہ انگوٹھی جس کے یاقوت کا وزن بارہ رتی تھا اور بہت خوبصورت تھی شہنشاہ کی خدمت میں بھیجدی اس کی قیمت پچاس ہزار روپیہ آنکی گئی اور پیشکش کی کمی میں محسوب کی گئی۔ چونکہ قطب شاہ نے شہنشاہ کی تصویر طلب کی تھی اس لئے شہنشاہ نے ایک تصویر اور اس کے ساتھ چند تحفے مع عہدنامہ نوشتہ ۷ ربیع الثانی سنہ ۱۰۴۶ھ محمد زاہد کے ذریعہ شیخ محمد طاہر صاحب گولکنڈہ کے ساتھ روانہ کئے۔ اس عہدنامہ میں قطب شاہ کے سکہ و خطبہ جاری کرنے اور مطیع ہونے پر اظہار خوشنودی کیا گیا تھا اور قطب شاہ سے وعدہ تھا کہ اگر تم اطاعت پر ثابت قدم رہے تو مجھ سے یا میری اولاد سے تم کو کبھی ضرر نہ پہونچے گا۔[2]

قطب شاہ نے شہنشاہ کے تمام مطالبات پورے کئے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ جن جن چیزوں کی فرمائش ہوئی تھی سب شہنشاہ کو وصول ہوچکی تھیں اور اب قطب شاہ کا خزانہ جواہرات اور نفائس سے خالی ہوچکا تھا چنانچہ خواجہ محمد زاہد کے پہونچنے پر جو یادداشت قطب شاہ نے بھیجی اس میں لکھا ہے کہ "فیل گجراتی جس کے لئے اعلیحضرت نے تحریر فرمایا تھا فرمان آنے سے قبل ہی روانہ کیا جاچکا ہے، امید کہ اب تک پہونچ گیا ہوگا۔ میرے پاس اس سے بہتر ہاتھی نہیں ورنہ حاضر خدمت کرتا۔ عرضداشت خالی بھیجنی مناسب نہ تھی اور میرے پاس کوئی تحفہ قابل فرستادنی باقی نہیں رہا اسلئے پریشان تھا اتفاقاً اسی اثنا میں ایک جوہری ایک لعل اسی وزن کا لایا جس وزن کا پہلے بھیجا جاچکا ہے میں نے اسے خرید لیا اگرچہ اکیلا بھیجنا اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن بحالت مجبوری وہی ارسال خدمت ہے۔"[3]

عہدنامہ، عرضداشت و حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہ نے اطاعت قبول کرلی تھی اور حدیقۃ السلاطین کا یہ بیان کہ شاہجہاں نے قطب شاہی عساکر کے خوف اور عبداللطیف کے لکھنے سے صرف پیشکش پر اکتفا کیا تھا، قابل غور ہے۔ عادل خاں کی عرض پر کہ اس کے پاس اب کوئی ہاتھی نہیں رہا شہنشاہ کے حکم سے عہدنامہ کے ساتھ ایک اچھا ہاتھی بھیجا گیا۔

---

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۹۷ تا ۱۰۰ [2] ایضاً صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۱ [3] ایضاً صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۵

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ جس نے بلا جنگ جدال کے اطاعت کی وہی بلکہ اس سے سخت برتاؤ کیا گیا جیسا کہ اس کے ساتھ جس نے شاہی لشکر کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ بلکہ عہدنامہ کے شرائط اور نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کو یہ صلح اگر اسے صلح کہا جا سکتا ہے، بمقابل عادل شاہ بہت مہنگے داموں میں خریدنی پڑی کیونکہ عادل شاہ کو بہت سے سابق اور نئے مفتوحہ نظام شاہی قلعہ دیدیے گئے جن کی آمدنی اسی لاکھ روپیہ تھی۔ ہٹلر کا قول ہے کہ کمزوری سب سے بڑا گناہ ہے۔ اسی گناہ کا خمیازہ قطب شاہ کو اچھی طرح بھگتنا پڑا شہنشاہ نے اس کی اطاعت سے خوش ہو کر اتنا ضرور کیا کہ اسکی درخواست پر چار لاکھ ہون میں سے جو گولکنڈہ نظام الملک کو دیتا تھا دو لاکھ معاف کر دیئے اور عادل شاہ کو اپنے طویل فرمان نوشتہ ۱۶ مئی ۱۶۳۶ء میں علاوہ دیگر سیاسی مطالبات کے قطب شاہ کے متعلق لکھا کہ چونکہ قطب شاہ نے ہمارے جملہ احکام کی تعمیل کی ہے لہذا "می باید کہ آن عدالت پناہ کہ کلاں ترین دنیا داران دکن است بیکس آنہا و بجائے برادر کلاں آن قطب فلک ایالت است اصلاً و مطلقاً در مقام رسانیدن ضرری بملک آن قطب فلک شوکت نشود و متعرض محال متعلقہ او نگردد و تکلیف اداء چیزی از نقد و جنس بآن قطب فلک ایالت نکند و بہانہ او و سند و دیگر کہ از قدیم الایام میان آبای آن عدالت پناہ و قطب اہبت متعارف بودہ کتفا نماید و این مقدمہ را جزو شرائط قرارداد اند"

ظاہر ہے کہ نظام شاہی حکومت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور اب اس میں بھی جان باقی نہ تھی ایسی شکل میں قطب شاہ قطعاً اسے مقررہ چار لاکھ ہون خراج نہ دیتا۔ شاہجہاں نے خود اپنی طرف سے خراج مقرر کیا اور مقررہ نظام شاہی خراج سے بھی دو لاکھ ہون ادا کرنے کا حکم دیا۔ انصافاً یہ خراج وصول کرنا قطعاً مناسب نہ تھا اس کے علاوہ عادل شاہ کو یہ حکم دینے سے بھی کہ وہ گولکنڈہ سے مقررہ نقد و جنس کے سوا کچھ وصول نہ کرے قطب شاہ کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔

عادل شاہ کو جو فرمان بھیجا گیا تھا اسکے جواب میں اس نے جو درخواست بھیجی اس میں جملہ شرائط متعلق علاقہ نظام الملک سابق و ریکاں اور قطب شاہ کو بصد دبیر قبول کر کے اظہار اطاعت و وفاداری کیا اور اس طرح دکن کا سب سے بڑا رئیس بھی شہنشاہ دہلی کا مطیع و فرمانبردار ہو کر باجگزار حاکم بن گیا۔

درحقیقت یہ ۱۶۳۶ء کا معاہدہ ہی تھا جس کی بنا پر مغلوں کو گولکنڈہ کے معاملات میں بار بار دخل دینے کا موقع ملا۔ قطب شاہیوں کے تعلقات اس معاہدہ کے بعد بھی ایران سے عرصہ تک باقی رہے۔ ان کے دلوں میں مغلوں کے خلاف نفرت و عداوت پرورش پاتی رہی اور مغل حاجب اندرونی معاملات میں بری طرح مداخلت کرتے رہے۔

محمد عبدالوہاب مسلم۔ ایم اے

لہ عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۱ و خافی خاں جلد اول صفحہ ۵۳۴۔

سقراط اور اُس کی موت

"اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر؟"

یونان کے دارالسلطنت اثینیہ میں سفرونیقس نام ایک بُت تراش تھا۔ اُسی کو سقراط کے باپ ہونے کی عزت حاصل ہے۔ ہوش وحواس سنبھالتے ہی سقراط نے بھی یہی خاندانی صنعت سیکھنی شروع کی جس کی ان دنوں یونان میں بہت ہی قدر تھی۔ لیکن اسی اثنا میں قریطو نامی ایک دولتمند فلسفی نے اس کی طباعی وذہانت کا اندازہ کرکے اسے تحصیل فلسفہ کی طرف متوجہ کیا اس طرح سقراط اپنا آبائی کام چھوڑ کر مسایل الٰہی اور رموز حکمت دریافت کرنے میں منہمک ہوگیا ان دنوں اس نے بندقیلس نام ایک حکیم کے اصولوں کی پیروی کی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس نے ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے فوجی خدمات بھی انجام دیں عربی محققین کا قول ہے کہ اس زمانہ میں یونانی فلسفیوں اور حکیموں کی قدر بطور مذہبی پیشواؤں کے کرتے تھے اور لڑائی کے موقع پر بھی تبرکاً فوج کے ساتھ لیجایا کرتے تھے۔ اسی رسم کے مطابق یونان کا فرمانروا ایک مرتبہ سقراط کو اپنی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں لے گیا مگر سقراط بجائے سپاہیوں میں رہنے اور ان سے ملنے جلنے کے ایک خلوت کے مقام میں بیٹھا رہتا۔ اور جب آفتاب نکلتا تو دھوپ کھانے کے لئے باہر آبیٹھتا۔ ایک دن اتفاقاً بادشاہ اس طرف سے گزرا۔ اس کی طرف دیکھتے ہی بادشاہ نے کہا کہ "آپ مرے پاس کیوں نہیں

"جواب دیا "فرصت نہیں ہوتی"، پوچھا "آخر آپ کیا کام کرتے ہیں؟". کہا "صرف وہی کام جس سے زندگی رہ سکے"، بادشاہ
ت سے کہا "یہ کون بڑی چیز ہے یہ تو آپ کے لئے میرے پاس ہر وقت موجود ہے جب اور جس وقت آپ نے حاضر کروں گا"
نے کہا کہ "اگر یہی امید ہوتی تو میں کبھی آپ کا دروازہ نہ چھوڑتا"، اب بادشاہ نے یہ بات چھوڑ کر پوچھا میں نے سنا ہے کہ
کہتے ہیں "بت پرستی سے نقصان پہنچتا ہے". سقراط بولا "نہیں یہ تو میں نے نہیں کہا"، پوچھا "پھر کیا کہا تھا؟" بولا "میرا
ں ہے کہ بت پرستی بادشاہ کے لئے مفید ہے اور سقراط کے لئے مضر. اسی لئے کہ بادشاہ اس مذہب کے ذریعہ رعایا کا
م کرتا ہے اور خراج حاصل کرتا ہے بخلاف اس کے سقراط کو یقین ہے کہ بت پرستی سے نہ کوئی نفع ہو سکتا ہے اور نہ
نہ پہونچ سکتا ہے اسے تو ایک خالق مطلق پر اعتقاد ہے جو اسے روئی دیتا ہے اور ہر برے اور بھلے کام کا اسے بدلہ
گا"۔ یہ سن کر بادشاہ نے کہا "اچھا فرمائیے آپ کو کسی چیز کی حاجت تو نہیں ہے؟". کہا "جی ہاں ہے اس قدر
ے کی باگ موڑ کر چلے جائیے اور میری دھوپ چھوڑ دیجئے"، بادشاہ نے اس کی اس بے نفسی سے متاثر ہو کر اس کو
فاخرہ اور بہت کچھ مال و زر دینا چاہا مگر سقراط نے انکار کیا. اور کہا کہ بادشاہ تو نے تو اس چیز کے دینے کا وعدہ کیا
ے زندگی کو قیام ہو حالانکہ دے وہ چیز رہا ہے جس سے موت کو قیام ہو. سقراط کو زمین کے پتھروں (جواہرات)
ں کے ریشوں (کپڑوں) اور کیڑوں کے لعاب دہن (ریشمی کپڑوں) کی ضرورت نہیں ہے اور جس چیز کی اسے واقعی
رت ہے وہ چاہے جہاں اور جس جگہ ہو ہمیشہ اس کے پاس رہتی ہے"، اس جواب نے بادشاہ کو ایسا لاجواب کیا کہ بجز
کے کہ چپکے واپس چلا جائے اور کچھ بن نہ پڑی۔

اس کے بعد سقراط نے بہت دنوں تک طیماطاؤس ایک زبردست فلسفی کی شاگردی کی اور اپنے فلسفیانہ مذاق میں زیادہ
ی کے نقش قدم پر چلتا تھا. تعلیم دینے کے زمانہ میں طیماطاؤس اسے کچھ لکھنے کی اجازت نہ دیتا تھا بلکہ مجبور کرتا تھا کہ ہر چیز کو زبانی
یاد کرے. ایک دن سقراط نے اس سے کہا کہ آپ مجھے لکھنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ طیماطاؤس بولا "علم الہی اور
حکمت کا مدار جانوروں کی کھال پر رہنا اچھا یا انسان کے دل پر، اگر راستہ میں کوئی شخص تم سے مسئلہ پوچھ بیٹھے تو کتاب
نے کے لئے گھر دوڑے جاؤگے؟ یہ بات اس کے دل میں جم گئی اور اسی وجہ سے وہ اپنے تمام شاگردوں کو لکھنے اور تالیف
تصنیف سے منع کرتا تھا

وہ اپنے علمی ذوق میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا اور علم و حکمت کی شرافت کا اس پایہ کا ماننا تھا کہ ان مسائل کا چمڑے یا حریر پر ان کو

کاغذ نہ تھا) پر لکھنا اس کے خیال میں بے ادبی اور گستاخی میں شامل تھا۔ وہ لکھتا اور دعویٰ کرتا ہے کہ حکمت پاک اور مقدس چیز ہو نہ اس میں کوئی خرابی ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی نجاست لہذا اس کی شان اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ اس کے رموز لوح دل کے سوائے کسی اور چیز پر ثبت کئے جاویں اور اسی وجہ سے اکثر لوگوں کا خیال ہو کہ اس نے بجائے فائدہ پہونچانے کے علم و فضل کو ضرر پہونچایا ہے کیونکہ سوائے پڑھا دینے اور شاگردوں کو سکھا دینے کے نہ کبھی کوئی مضمون اُس نے لکھا اور نہ اپنے باغ علم کے خوشہ چینوں میں سے کسی کو لکھنے دیا تاہم دنیا میں حکمت و فلسفہ کا جہانتک اور جس قدر رواج ہوا ہے سب اسی کی برکت ہے اس لئے کہ افلاطون اور ارسطو طالیس جو فلسفہ کے زبردست ارکان اور پہلے مروج تسلیم کئے جاتے ہیں دونوں نے اپنے چراغ علم اسی کے چراغ سے روشن کئے تھے

افلاطون سے بھی زیادہ زہد خدا پرستی اور علوم روحانیہ میں منہمک رہنا سقراط کی زندگی کا طرز عمل تھا دولت و حشمت کو وہ ذلیل اور ہیچ خیال کرتا تھا اور فخر و تمکنت کو انسان کا سب سے بڑا عیب۔ آخر اسی تصوف کے دریا میں غوطے لگاتے لگاتے الہیات کے آسمان پر پرواز کرتے کرتے اس درجہ کو پہونچ گیا۔ کہ بے اختیار ہو کر صدائے توحید بلند کی۔ ملک و قوم میں ہر طرف بت پرستی کا رواج تھا اور صنم پرستی یونانیوں کا عام مذہب بنی ہوئی تھی۔

سقراط ایک پیغمبر کی شان سے بے خوف و خطر کہنے لگا کہ ان بتوں کی پرستش کو چھوڑ دو جو پتھر سے کاٹ کر بنائے گئے ہیں نہ بول سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں نہ ان میں کسی قسم کی حس و حرکت ہے۔ عبادت صرف اس ایک خدائے واحد بزرگ کے لئے ہے جو پاک و صاف ہے سب کا پیدا کرنے والا ہے حکیم و دانا ہے جسے ہر بات کی قدرت ہے اور ہر چیز اس کے اختیار میں ہے لہذا اسی کی پرستش کرو نیکی کرو برے کاموں سے بچو اور اپنی فحش حرکات سے باز آؤ۔

یہ خبر جیسے ہی مشہور ہوئی یونانیوں کا مذہبی مقتدا۔ بڑے بڑے بت خانوں کے پجاری اور سلطنت کی کونسل کے تمام ارکان بگڑ گئے ہر طرف سخت برہمی پھیل گئی اور آخر اثینیہ کے قاضیوں اور مجسٹریٹوں نے بالاتفاق اس کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیدیا۔ فرمانروائے اثینیہ کو اگرچہ یہ فتویٰ ناگوار تھا مگر مجبور تھا اور اس کے اختیار سے باہر تھا کہ کونسل کے فتوے کو مسترد کردے تاہم اس نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ سقراط سے پوچھا کہ " آپ جس طرح قتل ہونے کو پسند کریں وہی طریقہ عمل میں لایا جائے "۔ سقراط نے زہر پیکر جان دینے کو پسند کیا اور یہی طریقہ منظور کرلیا گیا۔ ان دنوں معمول تھا کہ ہر سال ایک جہاز یونانیوں کی نذریں اور چڑھاوے کی چیزیں لیکر اپالو کے مندر کو جایا کرتا تھا۔ اپالو یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ جو دنیا میں سورج کا

خیال کیا جاتا تھا یہ جہاز جب تک واپس نہ آجاتا اور جبتک نذر و نیاز کی چیزوں کے قبول ہو جانے کا یقین نہ ہو لیتا اس وقت کسی مجرم کو موت کی سزا نہ دیجاتی۔ موسم خراب ہونے اور سمندر میں تلاطم ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں جہاز کی روانگی میں دیر ہوگئی جس کی وجہ سے بیچارہ سقراط واجب القتل ٹھیرائے جانے کے بعد بھی کئی مہینے تک قید خانے میں پڑا رہا قید وہ نہایت ہی استقلال اور پامردی سے موت کا انتظار کرتا تھا یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کے شاگردوں اور عزیزوں کو اجازت کہ جس وقت اور جب چاہیں اس سے آکر مل جائیں۔

اب جہاز کے آنے میں دو ہی چار روز باقی رہ گئے اس کے شاگرد اور قدردان سہمے ہوئے تھے کہ قیامت کی گھڑی سر پر آیا چاہتی ہے انھیں دنوں اس کا شاگرد رشید اقریطون قید خانہ میں آکر اس سے ملا اور کہا "جہاز آج ہی کل میں آنے والا ہے پھر اس کے آجانے کے بعد کوئی تدبیر بن نہ پڑے گی میں نے داروغہ جیل کو راضی کر لیا ہے کہ چار سو روپیہ لے کر آپ کو نکل جانے کا موقع دیدے آپ بس اتنا کیجئے کہ رات کو چپکے سے نکل کر روم میں چلے جائیے جہاں آپ آزادی سے رہیں گے اور کوئی آپ کا بال بیکا نہ کرسکے گا" سقراط نے کہا "اقریطون تم جانتے ہو کہ میں چار سو روپیہ کا بندوبست نہیں کرسکتا نہ اتنا روپیہ نقد میرے پاس موجود ہے اور نہ اتنا اسباب رکھتا ہوں کہ اسے بیچ کھوچ کر اتنا روپیہ فراہم کرسکوں" اقریطون بولا "میرا یہ مطلب نہ تھا کہ آپ روپیہ کی فکر کیجئے اس کا بندوبست میں کرلوں گا آپ صرف اقرار کیجئے کہ قید خانہ سے نکل کر چلے جائیے گا" اس کا جواب سقراط نے یہ دیا کہ "یہ سزا جو مجھے دی گئی ہے خود اپنے وطن اور قوم کی طرف سے دی گئی ہے تم دیکھ رہے ہو کہ ان لوگوں نے مجھے قید کیا ہے اور قتل کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ بھی جانتے ہو کہ میں اس سخت سزا کا مستحق نہیں ہوں نہ میں نے کوئی جرم کیا ہے نہ کسی کا کچھ بگاڑا ہے بلکہ میرا جرم صرف یہ ہے کہ ظلم کی مخالفت کرتا ہوں اور لوگوں کو کفر و الحاد و خدا کی ناشکری سے روکتا ہوں بت پرستی کو برا کہتا ہوں اور شرک کی برائیاں ظاہر کرتا ہوں میری یہ حالت کسی طرح بدل نہیں سکتی جہاں جاؤں گا اور جب تک زندہ رہوں گا اسی اصول پر قایم رہوں گا اور یونہی لوگوں کو ہدایت کرنے کی کوشش کروں گا پھر روم میں کیا ہے جہاں جاؤں گا یہی حال ہوگا اور جس سرزمین پر رہوں گا یہی فساد کھڑا ہوگا اور اس کی سزا جب اہل وطن اور دوستوں سے یہ ملی ہے تو غیر قوم والے تو اس سے بھی سخت برتاؤ کریں گے انھیں تو ہم وطنی کا تھوڑا بہت پاس اور لحاظ بھی ہوگا مگر غیروں سے اتنی بھی امید نہیں کی جاسکتی۔

یہ سن کر اقریطون بولا اگر آپ کو اپنے اوپر رحم نہیں آتا تو اپنے اہل و عیال پر تو ترس کھائیے۔ سقراط نے کہا کہ اس

حیثیت سے بھی میرا روم جانا مناسب نہیں ہے وہاں میرے بعد نہ ان کا کوئی حامی ہوگا نہ پرسان حال اور یہاں تم لوگ موجود ہو جن سے ہر طرح لطف اور شفقت کی اُمید ہے آخر اقریطون لاجواب ہو کر چُپ ہو رہا اور نہایت حسرت واندوہ کے ساتھ قیدخانہ سے چلا آیا اس کے تیسرے دن قیامت کی گھڑی آگئی جبکہ سقراط دنیا سے رخصت ہونے والا تھا صبح ہوتے ہی قید خانہ کے باہر تمام شاگردوں کا ہجوم ہو گیا وہ لوگ ہجوم کئے ہوئے تھے کہ قید خانہ کا داروغہ دروازہ کھول کر اندر سقراط کے پاس گیا پھر وہاں کونسل کے گیارہ ارکان آئے اور چند لمحہ اُس کے پاس ٹھیر کر چلے گئے اب سقراط کے پیروں سے زنجیریں کھول دی گئیں جن میں ایام اسیری میں وہ غریب جکڑا رہا تھا اور شاگردوں وعزیزوں کو اجازت دی گئی کہ اپنے استاد اور عزیز کا آخری دیدار کرلیں اجازت پاتے ہی سب لوگ اندر گئے اور سقراط کے آس پاس بیٹھ گئے ان لوگوں کو دیکھ کر یہ بے نفس حکیم یونان تخت سے اُتر کر زمین پر آبیٹھا اپنی رانیں کھول دیں۔ اُن پر ہاتھ پھیرا بعض بعض جگہ انھیں ملا اور دبایا اور حاضرین کی طرف دیکھ کر کہا خدا کی بھی کیا حکمت ہے کہ ایسی ایسی چیزوں کو جمع کر دیا ہے جو باہم ایک دوسرے کی ضد ہیں کوئی راحت نہیں ہوتی جس کے بعد الم نہ ہو اور کوئی الم نہیں ہوتا جس کے بعد راحت نہ ہو اس وقت تک سب لوگ خاموش بیٹھے نہایت حسرت سے اس کی صورت کو دیکھ رہے تھے یہ جملہ اس کی زبان سے نکلتے ہی بحث ومباحثہ ہونے لگا اور جو جس کے دل میں آیا پوچھنے لگے چنانچہ میاس اور قیدیوں نے نفس کے افعال کے متعلق سوال کیا اور سقراط نے اس کا اطمینان کشادہ خاطری اور خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا گویا اسے موت کی خبر ہونا تو درکنار یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ قیدخانے میں ہے سقراط [illegible] یہ ایک نہایت دقیق معنی خیز اور محققانہ لکچر دے رہا تھا اور لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ دل [illegible] مضبوط ہے [illegible] کس قدر بے خوف ہے کہ موت کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا اور ایسی نازک گھڑی میں بھی ایسا ثابت قدم ہے کہ معمولی اخلاق وعادات میں بھی کسی قسم کا فرق نہیں آیا آخر میاس سے ضبط نہ ہو سکا اور بولا افسوس آپ سے کچھ پوچھتے ہی بنتا ہے اور نہ خاموش رہتے کچھ پوچھتے ہیں تو آپ سے علیحدگی کے خیال سے دل بھر آتا ہے اور نہیں پوچھتے تو حسرت رہ جاتی ہے کہ ان رموز الٰہی کو آپ کے بعد پھر کس سے پوچھیں گے۔ سقراط نے کہا میاس جو کچھ پوچھنا ہے شوق سے پوچھو تمہارے ان سوالات سے میں خوش ہوتا ہوں اور میرے نزدیک تو اس حال اور اس زندگی میں اور اس دوسرے حال اور دوسری زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے یہ تغیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کا خیال میرے ذوق علم پر غالب آجائے اگرچہ اس انقلاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم بہت سے نیک فاضل اور لایق دوستوں اور رفیقوں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کو چھوڑ کر ہم ان سے بھی اچھے

اُن سے زیادہ فاضل و لائق دوستوں اور بھائیوں سے ملتے ہیں میں اب یہاں سے جاکر اسلاؤس۔ ایآرس اور ہراقیاس سے ملوں گا نفس پر بحث ہونے کے بعد شاگردوں نے عالم کی حیات اور آسمانوں کی حرکت کے متعلق سوالات کئے اور پوچھا کہ عناصر اربعہ کی ترکیب کیونکر ہے ان مسایل پر بحث کرکے سقراط نے سب کا اطمینان کردیا پھر دیر تک علوم الہی اور اسرار ربانی کے بہت سے نکات بیان کرتا رہا اور جب اچھی طرح سب کی تسلی وتشفی ہوگئی تو بولا۔ اب میں جانتا ہوں کہ وقت آگیا کہ غسل کرکے جہاں تک ممکن ہو عبادت کروں اور کسی کو اپنی میت کے غسل کی تکلیف نہ دوں۔ مجھے ارآمانی نے بلایا ہے اور زاؤس کے پاس جانے والا ہوں (یہ بھی قدیم مشہور یونانیوں کے نام ہیں) اور تم بھی اپنے اہل وعیال کے پاس جاؤگے یہ کہتے ہی اُٹھا ایک کمرہ میں جاکر غسل کیا اس کے بعد دیر تک وہیں مصروف عبادت رہا اس وقت وہ عبادت کررہا تھا اور دوسرے کمرہ میں اس کے شاگرد اور پیرو بیٹھے باہم افسوس کررہے تھے اور بار بار ان کی زبان سے نکلتا تھا کہ افسوس کتنا بڑا حکیم اور پدر شفیق چھوٹا جاتا ہے اس کے بعد ہم سب یتیم ہوجائیں گے۔

سقراط عبادت کے کمرہ سے نکل آیا اور اپنے بچوں اور بیوی کو بلایا۔ ایک بڑا بیٹا تھا اور دو ننھے ننھے بچے تھے جنھیں سامنے بلاکر رخصت کیا کچھ سمجھایا بجھایا اور کہا بس اب جاؤ اس وقت موقع پاکر اقریطون نے کہا آپ ان بچوں اور اپنی بیوی کے متعلق ہمیں کیا حکم دیتے ہیں اور خود ہمارے لئے کیا فرماتے ہیں جواب دیا کچھ نہیں جو ہمیشہ کہتا رہا کہ اپنے نفسوں کی اصلاح کرو۔ وہی اب بھی کہتا ہوں اگر تم نے اس نصیحت پر عمل کیا تو مجھے بھی خوش کروگے اور اُن تمام لوگوں کو بھی جو میرے ہم خیال ہیں یہ کہہ کر خاموش ہوگیا اور سب شاگرد بھی خموشی سے اس کی صورت دیکھتے رہے اتنے میں ممبران کونسل کا ایک خادم یا یوں کہئے کہ عدالت کا سپاہی آیا اور حکیم اجل کی طرف دیکھ کر بولا اے سقراط! آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی موت کا باعث نہیں ہوں آپ کے لئے یہ حکم ان گیارہ ممبروں کا نافذ کیا ہوا ہے جو عدالت فوجداری کے رکن ہیں اور مجھے اس کی تعمیل کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کے بجالانے پر میں مجبور ہوں حالانکہ اقرار کرتا ہوں کہ آپ تمام لوگوں سے افضل اور اعلیٰ ہیں لہذا اس جام زہر کو لے لیجئے اور نوش کیجئے۔ اس کے پیتے وقت جو اضطرابی اور بیقراری کی حالت طاری ہو اس کو صبر اور ضبط کے ساتھ گوارا کیجئے سپاہی کہنے کو تو اتنا کہہ گیا مگر ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بے اختیار روتا ہوا پلٹ پڑا سقراط نے اسی استقلال کے ساتھ نہایت شگفتگی اور بے نفسی سے کہا میں تمہارا کہنا مانونگا اور تم کو الزام نہیں دیتا یہ کہہ کر چند لمحہ سقراط خاموش رہا پھر اقریطون کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا یہ شخص تو چلا گیا میرے لئے شربت مرگ کب لائے گا اور

ایک نوجوان سے کہا ..."اسے بلاؤ تو" نوجوان نے پکارا اس کے آواز کے ساتھ ہی سرکاری سپاہی آیا اور اس کے ہاتھ میں زہر کا جام تھا سقراط نے جام ہاتھ میں لے کر بے تامل بغیر کسی بیتابی کے اور نہایت بے پروائی کے ساتھ منہ سے لگا لیا۔ بلند مرتبت استاد کو جام زہر پیتے دیکھ کر شاگردوں میں ضبط کی تاب نہ رہی زار و قطار رونے لگے اور ہر طرف سے آہ و بکا کی آواز بلند ہوئی آپ سقراط نے پورا جام پی کر ان لوگوں کی طرف توجہ کی اُن کو اس آہ و زاری سے روکا اور سمجھانے لگا کہ اس طرح بے صبر ہونا چاہئے میں نے عورتوں کو اس وقت اس وجہ سے ہٹا دیا تھا کہ ان سے ضبط نہ ہو سکے گا۔ الغرض ایسی باتیں کہیں اور ایسا حوصلہ بڑھایا کہ سب لوگوں کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور خاموش ہو رہے سقراط اٹھ کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا گویا کسی تکلیف کو دبا او ٹال رہا ہے تھوڑی ہی دیر ٹہلا ہوگا کہ پیروں کی طاقت سلب ہوگئی اور اسی سرکاری آدمی سے مخاطب ہو کر بولا اب میرے پاؤں بوجھل ہوگئے اور مجھ میں چلنے کی قوت نہیں ہے اس نے کہا لیٹ جایئے سقراط بے تامل لیٹ گیا اور ایک نوجوان شخص پیر دبانے لگا۔ دباتا تھا اور بار بار پوچھتا کہ میرا دبانا آپ کو محسوس ہوتا ہے جواب دیا "نہیں" سرکاری آدمی بولا بس یونہی یہ حالت جب قلب تک پہونچے گی تو آپ ختم ہو جائیں گے۔

اب اقریطون بیتابی کے ساتھ پکارا اور اے امام حکمت یہ کیا بات ہے کہ آپ کے حواس اور آپ کی عقل بھی ویسی ہے جیسی کہ ہماری ہے اس بارے میں کچھ ارشاد ہو اب سقراط میں بات کرنے کی طاقت نہ تھی مگر زور کرکے بولا میں تم سے وہی کہتا ہوں جو کچھ کہہ چکا ہوں یہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا اور اقریطون کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر رکھ لیا۔ اقریطون نے کہا جو فرماتے ہیں فرمایئے اس کا جواب سقراط نہ دے سکا بلکہ اب آنکھیں پتھرا گئیں مگر پھر بھی اتنا جملہ اور اس کی زبان سے نکلا "میں اپنی جان اُس خدا کے سپرد کرتا ہوں جو سب کا سچا معبود ہے" اسی جملہ کے ساتھ اُس گراں پایہ حکیم فلسفی خداشناس، غواص دریائے معرفت کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

افسوس زمانے! تو نے کیسے کیسے لوگوں پر کیا کیا ظلم کئے ہیں لیکن مبارک ہے ایسی موت کہ دشمن اور قاتل تک روتے ہیں یونان نے یہ ایسا فعل کیا ہے جس سے زیادہ شرمناک فعل اس سے کبھی سرزد نہ ہوا ہوگا۔ اور کیا عجب کہ اس کے انتقام میں اسی گھڑی سے اس قدیم متمدن اور زبردست قوم کا تنزل شروع ہوا ہو ۔ کیونکہ چند ہی روز کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یونان کی سلطنت خاک میں مل گئی اس کی آزادی ہمیشہ کے لئے چھن گئی اور وہ رومیوں کی ماتحتی میں ذلت و غلامی کی تکالیف برداشت کرنے لگا۔

شنکر موہن لعل (متعلم بی ۔ اے آخری)

غزل

داستاں اپنی تھی گویا بھول جانے کے لئے — داغِ حسرت رہ گئے دل میں چھپانے کے لئے
کون سمجھے یہ کرشمہ سازیاں قدرت کی ہیں — شمعِ ہستی کو جلایا ہے بجھانے کے لئے
کچھ تجھے معلوم بھی ہے جذبۂ شوقِ وفا — وہ خفا ہم سے ہوئے ہیں آزمانے کے لئے
جذبۂ الفت کی یہ ناقدردانی دیکھئے — شمع سوزاں رہ گئی آنسو بہانے کے لئے
سطح بیں! کاشانۂ ہستی کے یہ نقش و نگار — دستِ قدرت نے بنائے ہیں مٹانے کے لئے

پھر بنایا آشیاں گلشن میں بلبل نے تراب
پھر فلک تیار ہے بجلی گرانے کے لئے

سید تراب حیدر زیدی بی ایس سی ابدالی

اقبال کی شاعری

میں

حسن و عشق کا عنصر

جستجو کُل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے دردِ لا دوا رکھتا ہوں میں

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ وہ کامل تجلّی مدعا رکھتا ہوں میں

فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

محفل ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں

(اقبال)

(۱)

نفسیاتی رجحانات

حسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہر انسان میں کم و بیش موجود ہے اور اسی طرح حسن میں محو ہو جانے اور حسن کی

...ت کھنچ جانے یا حسن کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت بھی انسانی فطرت کا ایک عنصر ہے۔

شاعر میں یہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ جذبات اس قدر عمیق اور اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ جب ان میں ...ش آتا ہے تو وہ اُس کی ذات میں سما نہیں سکتے، اور الفاظ اور نغمے بن کر اُبل پڑتے ہیں۔

حُسن شاعر کے جذبوں پر چھا جاتا ہے، اور جذبوں میں ایک تپش، ایک جوش، ایک بیتابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بیتابی عشق ہے اور جب یہ بیتابی اُس کے قلب کی لطافتوں، اور اُس کے دماغ اور ادراک کی مدد سے الفاظ و معانی کی شکل اختیار ...لیتی ہے تو شعر بن جاتی ہے۔ اسی لئے اگر عشقیہ شاعری کی صحیح تعریف کی کوشش کی جائے تو صرف انہی الفاظ میں اس کی ...ریف کی جاسکے گی کہ وہ ایک انسان کے لطیف احساسات، اور بے چین جذبات کا عکس ہے اگر یہ عکس بے ساختہ پڑے تو ...ا ہری حقیقی اور سچی ہے۔ اور اگر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جائے۔ یا کوئی اور مصنوعی دلکشی پیدا کی جائے تو عکس ...کا خوبصورت ہو اُس میں وہ فطری حقیقت باقی نہیں رہے گی۔ جس طرح عشق ایک اضطراری جذبہ ہے اُسی طرح عشقیہ شاعری ...ں بھی اضطرار کی جھلک ہونا ضروری ہے اور یہی اضطرار شعر میں وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ شعر "متحرک" ہو جاتا ہے۔

عشقیہ شاعری دل کی شاعری ہے، اور اقبال دل سے زیادہ دماغ کے شاعر ہیں۔ عشق ان کے نزدیک ایک اضطراری ...ما جانے والا، محو کر دینے والا جذبہ نہیں، جس کا جادو انھیں، اور اُن کی پوری ہستی کو مسحور کر دے۔ عشق اُن کے نزدیک ...ک حقیقت ہے اور وہ اس حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں ان کے پورے کلام میں ایک نظم بھی ایسی نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ ...و جذبات کے افسوں سے اس قدر مسحور ہیں کہ فطرت اُن سے خود بخود لکھوا رہی ہے۔ عشق اُن کی شاعری کا "باعث" نہیں ...مقصد" ہے۔

"عشق" کا جو تصور اقبال کے ذہن میں ہے وہ ایک مستقل اور عظیم الشان حقیقت کا تصور ہے۔ اور اس حقیقت کی جستجو، اس کو سمجھنے اور اس تک پہنچنے کی کوشش اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کی ہستی اس حقیقت سے بالکل الگ ہے۔ کلیم دور ...سے طُور کے شعلوں کو دیکھ رہا ہے اور اُن تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس تصور نے اقبال کے عشقیہ کلام میں دو خصوصیتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو یہ کہ عشق ہمیشہ ایک فلسفیانہ مبحث بنتا گیا۔ دوسرے یہ کہ فطری لطافت، "سادگی اور پرکاری"، اور نازک اور لطیف شعریت جو دل پر اثر کرنے والی شاعری کی جان ہے اُن کے عشقیہ کلام میں تقریباً مفقود ہے۔

اقبال شاعری کے لئے ہمیشہ ایک "مقصد" کو اپنا منتہائے نظر بنائے رہے۔ خود "شعر" کی اہمیت اُن کے مقصد میں زیادہ نہیں تھی۔ اُن کا پیغام الفاظ کی طرح جذبات سے بھی "ماوراء" رہا۔ اور ہر وہ شاعر جو پیغام لے کر آتا ہے محض جذبات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک قوم، ایک جماعت کے جذبات کا رہبر ہوتا ہے محض اس پیغام کے اثر سے اقبال کی عشقیہ شاعری میں ذاتی اور شخصی رنگ ہمیشہ پھیکا رہا جہاں اُنھوں نے عشق کے جذبے سے اپنی ذاتی تاثر کا اظہار کیا ہے اُن کی شاعری پھیکی اور بے مزہ ہوگئی ہے۔ لیکن جہاں اُنھوں نے عشق کا بلند اور پاکیزہ تر تصور ایک قوم کے لئے لائحہ عمل بنا کر پیش کیا ہے وہاں اس میں رفعت اور بلندی پیدا ہوگئی ہے۔

اسی شان رہبری نے عشق کو ان کے نزدیک ایک تصور بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسا تصور جو ایک شخص نہیں بلکہ ایک قوم کی جذباتی اور روحانی زندگی کو گرما سکے۔

عشق اقبال پر چھا نہیں جاتا۔ وہ حسن کو دیکھنے اور عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اُن کا زاویۂ نظر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اُسے ایک پوری قوم کا زاویۂ نظر بنا سکیں۔

(۲)

اقبال کے کلام میں حُسن و عشق کے عنصر کی نشوونما

اقبال کے مشقِ سخن کے زمانہ میں داغ و امیر کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا۔ زبان کی خوبیوں کی طرف شعر فہموں اور شاعروں کی توجہ تھی۔ اور گو یہ شاعری برائے نام عشقیہ شاعری تھی۔ مگر اسی کی وجہ سے عشقیہ شاعری کا صحیح مفہوم مٹ چکا تھا۔

"غزل" جب اردو میں آئی تو تصنّع بھی اُس کے ساتھ آیا۔ اور جہاں تصنّع کا زور ہوا۔ جذبات کی صحت ختم ہو جاتی ہے لفظی خوبیاں، جب شاعری کا اصول بن جاتی ہیں تو جذبات کے فطری اظہار کی شاعری میں صلاحیت نہیں رہتی۔ اُردو شاعری سے شعر کی رُوح پرواز کر چکی تھی، مُردہ جسم کی آرائش کی جارہی تھی، اور مصری ممی کی طرح، طرح طرح کے مسالے لگا کر اس جسم کو باقی رکھنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔

اس ماحول میں اقبال نے شاعری شروع کی۔ لیکن اِسی ماحول کے ساتھ ساتھ ایک نیا ماحول بھی پیدا ہوگیا تھا۔

اور وہ سرسید اور حالی کا پیدا کیا ہوا ماحول تھا۔ مغربی شاعری کے اثرات بھی پڑنے لگے تھے۔

اقبال کی ابتدائی غزل گوئی میں داغ کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ داغ سے اُنھوں نے اصلاح بھی لی تھی اور داغ کے بہت معترف تھے۔ داغ کے مرنے پر اُنھوں نے ایک نوحہ بھی لکھا۔ امیر کی شاعری کا بھی اُن پر کافی اثر تھا۔ خود لکھتے ہیں۔

میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے عجیب شئے ہے صنم خانۂ امیر اقبال

اقبال کا تغزّل بے روح اور بے رنگ تھا۔ ابتدا سے لے کر آخر تک کبھی ان کی غزلیں حقیقت کا خفیف سا اثر بھی پیدا نہ کر سکیں ہیں اُن میں لطف اور سوز و گداز نہیں۔

بعد کی غزلوں میں فلسفیانہ خیالات نے اور غلوِ تخیّل نے جا بجا جذبات کے فقدان کی تلافی کی ہے مگر عشقیہ رنگ کہیں نہ بھ سکا۔

لیکن وہ دوسرا ماحول جو اقبال کی شاعری پر اپنا اثر ڈال رہا تھا یعنی حالی اور سرسید کا ماحول بہت کامیابی سے اقبال کو اپنے آپ میں جذب کر سکا۔ وہ مغربی شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتے رہے۔ اور اُن کا اثر بھی ان پر پڑتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اس بے روح تغزل اور اس حقیقت سے عاری شاعری کا ایک شدید ردّ عمل اقبال کی قومی، اخلاقی اور اُن نظموں میں ظاہر ہونے لگا جو اُنھوں نے مناظرِ قدرت یا قدرت کے اہم اجرام کو دیکھ کر یا اُن سے مخاطب ہو کر لکھیں۔

اس زمانہ میں اقبال کے ذہنی ارتقار کے مطالعہ کے سلسلے میں ایک بہت اہم چیز معلوم ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے جذبے کو ان کی فطرت سے جذباتی مناسبت سے زیادہ ذہنی مناسبت تھی۔ سب سے زیادہ جن مغربی شاعروں کا اُن پر اثر ہوا وہ گوئٹے۔ ورڈسورتھ، شکسپیر اور گرے تھے۔ ان میں سے کوئی خالص جذباتی شاعر نہ تھا۔ ہر ایک دل سے زیادہ دماغ کا شاعر تھا۔ اس اثر سے اقبال کی اس نفسیاتی کیفیت کا پتہ چلتا ہے کہ ان پر عشق جذبہ بن کر نہیں چھا سکتا تھا۔

فلسفے کے مطالعہ نے جہاں اقبال کے تمام تر زاویہ ہائے نگاہ کو ایک مستقل اور مکمل حیثیت دیدی۔ وہاں حسن و عشق کے متعلق بھی ایک خاص نقطۂ نظر کی تعمیر کی۔ فطرت ہی نے اُنھیں جذبات پرست طبیعت عطا نہیں کی تھی۔ فلسفے کے مطالعہ سے جو ذہنی ارتقا ہوا اُس نے عشق اور حسن کے مطالعے کو اُن کی شاعری میں بجائے جذبے کے ایک "فکر" بنا دیا اور جس طرح نیم فلسفیانہ اور نیم شاعرانہ فکر سے وہ زندگی کی اہم خصوصیتوں کو دیکھنے اور پرکھنے لگے، اُنھوں نے عشق کو بھی دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کی شاعری کا اہم ترین مقصد قومی شاعری تھی۔ عشق کے متعلق اُن کا تصور تشکیل پا رہا تھا لیکن ابھی یہ تصور "پیغام" نہیں بنا تھا وطنیت اور قومیت اُن کے اہم ترین پیغام تھے۔

یورپ جانے کے بعد اُن کے نقطۂ نظر میں بہت اہم تبدیلی ہونے لگی۔ وطنیت جو اُن کی شاعری کے پہلے دور کا پیغام تھا ان کو باطل نظر آنے لگا۔ اسلامیات کے مطالعے اور گوناگوں مختلف اور متضاد اثرات سے ایک نئے اہم پیغام نے اُن کی ہستی کو گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ پان اسلامی تحریک ان کو اس قدر متاثر کر گئی کہ وہ وطنیت کے جوش کو بھول گئے۔ اور یہ پان اسلامی تحریک جو مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر مشتمل تھی، اُن کی ہستی میں ایک اہم انقلاب پیدا کرنے لگی۔

یہ اُن کے قیام یورپ کا زمانہ تھا۔ وطنیت کے تخیل کو وہ باطل قرار دے چکے تھے۔ اور پان اسلامزم کا اثر مستقل اور مکمل طور پر چھانے نہیں پایا تھا اور اس زمانے میں جب کہ اُن کی ذات اُن کی ہستی میں نئی تعمیر ہو رہی تھی۔ ایک نئے تخیل اور نئے تفکر کی دنیا بن رہی تھی، ان کی شاعری نسبتاً کم اہم اور ذاتی اور شخصی احساسات کے اظہار کا ذریعہ بن سکی۔ اُن کی شاعری کا اصل مقصد یعنی اُن کا "پیغام"، ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے اُن کی شاعری اس زمانے میں بڑی حد تک شخصی اور ذاتی شاعری بنی رہی۔ جا بجا انھوں نے جذبات نگاری کی کوشش کی۔ چند عشقیہ نظمیں لکھیں عشق کے متعلق اشعار کہے۔ ان میں کسی کی نظم میں درد و اثر یا حسن و لطافت کی گرمی پیدا نہ ہو سکی۔

عشق کا مغربی اثر اُن کی شاعری پر پڑا۔ یہ اثر جو شخصی اور مجازی تھا کبھی تو مجازی جذبے کے شخصی اظہار کی صورت میں (مثلاً .... کی گود میں بلی کو دیکھ کر) کبھی مغربی نظموں سے متاثر خیالات کی شکل میں (مثلاً "حسن اور زوال") نمودار ہوا یہ اثر محض ایک شاعر کی وقتی "مشقوں" سے بڑھ کر نہیں لیکن عشق کے متعلق جو نظمیں انھوں نے اس زمانہ میں لکھیں یعنی جن میں ذاتی تاثر زیادہ نمایاں نہیں۔ اور جن کی تحریر "مقصد" رکھتی ہے اُن میں سے اکثر نظمیں باعتبار تخیل بہت بلند ہیں۔

پان اسلامزم کے اثرات جو اقبال کے ذہن پر چھا رہے تھے اور اُن کی شاعری کا مذہب بن رہے تھے، اسی زمانے میں دو مختلف طریقوں سے اُن کے کلام کے عشقیہ عنصر پر اثر انداز ہوئے ایک تو یہ کہ اُن کے کلام میں مولانا روم کے اثر اور تصوف کے رنگ کی ابتدائی چاشنیاں جا بجا پیدا ہونے لگیں۔ دوسرے یہ کہ عشق مجازی میں بھی مشرقی اور اسلامی حسن کا تخیل اور تصور ایک روحانی معیار بننے لگا۔ یہ تصور سب سے پہلے ایک مکمل اور دلکش اثر کی شکل میں "سلیمٰی"، کی تحریر کا باعث ہوا

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے　　خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے خلوت کدے میں پایا　　شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر　　ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اُس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اُس کا

سلیمیٰ عرب کی پرانی محبوبہ ہے۔ اور شاعر حقیقت کے کیف کو مجاز میں تخیّل کرکے مشرقی شاعری کی روایت کو جس میں مجاز وحقیقت ہمیشہ ایک دوسرے میں عیاں اور نہاں ہوتے ہیں، ایک نئے اور جدید رنگ سے زندہ کرتا ہے۔

عشق حقیقی کے عناصر کی نشو و نما پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

اس زمانہ کی عشقیہ شاعری کی چند اور خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔ ہر عشقیہ نظم میں اس کا احساس ہوتا ہے کہ جذبہ دل سے نہیں نکلا۔ تخیل ہمیشہ نظم کی تشکیل کا باعث نظر آتا ہے۔ جذبے میں جوش نہیں، اثر نہیں، حقیقت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی دماغ رنگین کھلونے بنا رہا ہے اور اُن سے تفریحاً کھیل رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اکثر نظموں کی تہ میں کوئی واقعہ یا مشاہدہ یا حقیقی قلبی کیفیت کام کر رہی ہو۔ لیکن کسی طرح یہ واقعہ یا مشاہدہ یا قلبی کیفیت ایسی نہیں ہوتی جو اقبال کو بالکل مست کر گئی ہو۔ یا گرما گئی ہو۔ اگر اُن پر کوئی اثر پڑا ہے تو وہ اُس سے ضرورت سے زیادہ شعری کام لینا چاہتے ہیں۔ جذبے کے فقدان کے باعث باوجود تخیل کی رفعت کے زبان اور تناسب کا جامہ جا بجا چاک ہو جاتا ہے۔

زبان کی فطری سادگی، فطری جوش، اور فطری اصلیت کی سب سے زیادہ ضرورت عشقیہ شاعری میں ہوتی ہے۔ اور اقبال کو زبان پر بالکل اختیار نہیں۔ ایک مصرع میں اگر جوش اور اثر ہے تو دوسرا بالکل پھس پھسا ہے۔ ضرورت شعری کے لئے ٹکڑے کے ٹکڑے زبردستی بھرے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب بالکل غلط ہے اور وہ تناسب جو شاعری کے جسم کے لئے کسی حسینہ یا کسی حسین مجسمہ کے جسم سے زیادہ ضروری ہے اور تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔

اقبال نے "بانگ درا" کی اشاعت کے سلسلہ میں اکثر نظموں پر نظر ثانی کی۔ اور یو۔ پی کے نقادوں کے بے پناہ اعتراضات سے کم سے کم اس حد تک متاثر ہوئے کہ زبان کی چند اہم لغزشیں دور کر دیں۔ پھر بھی عشقیہ نظموں کی حد تک یہ تبدیلیاں کافی نہیں ہوئیں۔ جوش اور اصلیت کے لئے زبان کی اس قدر صفائی کافی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر اُن کی مشہور اور ایک حد تک دلفریب نظم "حسن و عشق" کا پہلا بند یہ ہے۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمین قمر ۔۔۔ نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل ۔۔۔ چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول

جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم　　　موجۂ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیل محبت میں یوں ہی دل میرا

پہلے مصرعے میں وہ سلاست اور روانی اور بے ساختگی نہیں جو ایک لطیف جذباتی نظم میں ہونا چاہئے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ "آنچل" اس وجہ سے بہت بے محل ہوگیا ہے کہ پوری نظم کے لہجہ میں رفعت اور شوکت پائی جاتی ہے اور یہ لفظ جو کسی زیادہ مادی نظم میں بہا دے جاتا۔ اس نظم میں باوجود اس کے کہ خیالی "آنچل" نہیں "نور کا آنچل" ہے نظم کی فضا میں اجنبی سا معلوم ہوتا ہے اور اس ٹکڑے کی وجہ سے تخیل کے رنگ میں ایک ناہموار شوخی سی پیدا ہوگئی ہے۔

لیکن بعض جگہ یہی نظم اُن بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے۔

تو جو محفل ہے تو ہنگامۂ محفل ہوں میں　　　حسن کا برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں
میرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے　　　تیری تصویر سے پیدا میری حیرانی ہے
حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا

(۳)

مطالعۂ فطرت اور حُسن و عشق کے عناصر

فطرت کا مطالعہ اقبال کی شاعری کے اولین اور بنیادی عناصر میں سے ہے۔ ان کا مطالعۂ فطرت بھی جذباتی نہیں، ذہنی ہے۔ فطرت سے اُن کی قوت ادراک مستفید ہوتی ہے۔

اقبال کی شاعری کے حسن پرست اور عشقیہ عنصر پر اُن کے مطالعۂ فطرت کا اثر ہونا ضروری تھا سب سے زیادہ جس حُسن نے اقبال کے قلب و ادراک پر اثر ڈالا ہے۔ وہ فطرت کا حُسن ہے۔ فطرت کے مختلف عناصر سے مخاطب ہوکر یا ان کے متعلق اقبال نے نظمیں لکھی ہیں۔

مطالعۂ فطرت کی حد تک ورڈسورتھ کا اثر اقبال پر بہت گہرا پڑا۔ فطرت میں وہ دو چیزیں دیکھتے ہیں۔ ایک تو فطرت کے ایک منظر کا تعلق اور ربط دوسرے منظر سے۔ یہ فطرت کی ایک عاشقانہ کیفیت ہے۔ دوسرے انسان اور فطرت کا موازنہ

یہاں وہ ورڈسورتھ کو چھوڑ کر مولینا روم اور متصوفین کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان فطرت کا مظہر کامل ہو۔
چنانچہ ان کی وہ نظمیں جن میں حُسن وعشق کے احساسات مطالعۂ فطرت کا نتیجہ ہیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ کہ جنہیں وہ فطری عناصر کی باہم محبت، یا کسی مظہر فطرت کے حُسن یا کسی کے عشق سے نتائج کا استخراج کرتے ہیں اور اُن سے حُسن او رعشق کے معیار انسانوں کے لئے تعبیر کرتے ہیں ان نظموں میں فطرت،، انسان کے معیار حُسن وعشق اور ترغیب عشق کے لئے نمونے اور مثال کا کام دیتی ہے۔ مثلاً "جگنو" کی چمک سے وہ حُسن کے اس تصور تک پُہنچتے ہیں۔

حُسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دہوکے دیئے ہیں، ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شئے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہو

یا مثلاً "غنچۂ ناشگفتہ اور آفتاب" میں سحر کے "عارض رنگیں" کی جلوہ فرمائی پر کلی کا "سینۂ زرّین" کھول دینا۔ انسانی عشق کی اس دعوت کا بہانہ بن سکتا ہے کہ

مرے خورشید، کبھی تو بھی اُٹھا اپنی نقاب
بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بے تاب
تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینہ میں
عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں

اور اس کے بعد انشراح کی یہ کیفیت منقلب ہوجاتی ہے۔

اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں
صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کردوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کردوں

دوسری قسم کی وہ نظمیں جن میں مطالعۂ فطرت حُسن وعشق کے عناصر کی تحریک کا باعث ہوا ہے وہ ہیں جن میں اقبال یہ محسوس کرتے ہیں کہ فطرت کا حُسن بے سوز ہے۔ فطرت میں محبت کا شرر نہیں۔ فطرت میں اور انسان میں بھی چیز یا بہ الامتیاز ہو۔

انسان کو عشق نے "حرارتِ سوزِ دروں" عطا کی ہے۔ انسان میں جلنے اور جلانے کی صلاحیت موجود ہے اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کو تمام مظاہرِ فطرت سے بالاتر قرار دیتی ہے۔ مظاہرِ فطرت کی زندگی فانی ہے۔ انسان عشق کی وجہ سے باقی ہے۔ انسان کو محبت کے باعث زندگیِ دوام حاصل ہے "ستارۂ صبح" جب اپنی بے ثباتی کی شکایت کرتا ہے تو اقبال اُسے اپنے "ریاضِ سخن کی جانِ پرور" فضا میں بُلاتے ہیں کہ

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اُس کی، بِنا مثالِ ابد پائیدار ہے اس کی

یا مثلاً "انسان اور بزمِ قدرت" میں بزمِ قدرت انسان سے کہتی ہے۔

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود / باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود
انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں / عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

(۴)

حُسن و عشق کے متعلق فلسفیانہ نظمیں

اقبال کی دو نظمیں ایسی ہیں جن میں سے ایک میں محبت کی تعمیر کا نیم شاعرانہ، اور نیم مفکرانہ مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور دوسری میں (جس کا خیال جرمن شعر سے لیا گیا ہے) زوالِ حُسن اور کائنات پر اس زوال کے حزنیہ اثر کا ہلکا سا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں نظموں یعنی "محبت" اور "حُسن و زوال" میں خیال گہرا ہے، تہ میں ایک مقصد کام کر رہا ہے۔ اِن نظموں کی بنیاد واقعات کے تجربے پر رکھی گئی ہے۔ اِسی لئے بہت وسیع معنوں میں اِنہیں فلسفیانہ نظمیں کہا جا سکتا ہے۔

اِن میں سے "محبت" میں عشق کی آفرینش کا ایک مخصوص تصور پیش کیا گیا ہے۔ عشق ایک سربستہ راز تھا۔ جو انسان کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ مگر اس مخلوق نے جس میں عبودیت کے ساتھ بغاوت کی صلاحیت ہمیشہ سے موجود تھی۔ اس راز کو معلوم کر لیا۔ فطرت کی کیفیتوں، اور روحِ خالص کی مختلف خاصیتوں سے یہ نسخہ تیار ہوا۔ تارے سے چمک، چاند سے داغِ جگر، رات سے سیاہی، بجلی سے تڑپ، شبنم سے افتادگی لی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی نفسہائے مسیح اور شانِ ربوبیت سے ادائے بے نیازی کے اثرات لئے گئے۔ اس طرح محبت کی تعمیر ہوئی۔ اور صرف اِنسان ہی نہیں، پوری فطرت اس نور سے جگمگا اُٹھی!

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے / چمک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

دوسری نظم یعنی "حسن اور زوال" کا بنیادی تخیل باہر سے لیا گیا ہے۔ مگر پوری نظم یہ ظاہر کر رہی ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو خود محسوس کر کے لکھا ہے۔ اس نظم سے دو جداگانہ حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حسن اور زوال، لازم و ملزوم ہیں۔

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

دوسری حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے ہر حسین مظہر کا زوال، زوالِ حسن کا ماتم بھی ہے۔

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

(۵)

اقبال کی اردو شاعری میں تصوف کی جھلک

حسن اور عشق کے تصور اور تخیل میں اقبال کے پختہ تر زاویۂ نظر کا پتہ اُن نظموں میں چلتا ہے جن میں ایک عالمگیر حسن، یا ایک عالمگیر حقیقی عشق کا تصور ان کا محرک ہوتا ہے۔ حسن و عشق کی نظموں میں یہ نظمیں سب سے زیادہ بلند ہیں اور ان نظموں سے اُس اقبال کا اندازہ ہوتا ہے جو آگے چلکر اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عجم اور جاوید نامہ لکھنے والا تھا۔

مولینا روم کا اثر اقبال پر اسی قدر ہے، جس قدر اثر پلوٹارک کا شکسپیر پر تھا۔ دُنیا کا ہر شاعر اُن کے لئے صرف دیکھ لینے کی چیز ہے، مگر مولینا روم کا اثر ان پر اسقدر چھایا ہوا ہے۔ کہ بڑی حد تک وہ مولینا کی روشنی میں دُنیا کے اہم تر مسائل کو دیکھتے ہیں۔

"شمع" میں یہ اثر پہلی مرتبہ کھُلّم کھُلّا ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال نے زندگی کو سمجھنے کے لئے مشرق اور مغرب دونوں کے فلسفے کا مطالعہ کیا۔ بہت مُدّت تک اُن کو حقیقت اور سکون کی جستجو رہی۔ بہت دنوں تک ذوقِ استفہام اُن کو پریشان کرتا رہا۔ پھر جب اُن کو سکون ملا تو تصوف میں ملا۔ غزالی میں نہیں مولینا روم میں۔

اِس جستجو اور کاوش کا مکمل ترین اظہار "بچہ اور شمع" کے آخری حصّے میں ہوا ہے۔ صرف ظاہری حسن کی نمود شاعر کو تسکین نہیں دے سکی۔ روح کسی اور سکون کے لئے بیتاب ہے۔

محفلِ قدرت ہے ایک دریائے بے پایانِ حسن آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
حسن کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے مہر کی ضوگستری شب کی سیہ پوشی میں ہے

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

اس جستجو کے بعد تسکین نصیب ہوئی تو اس تخیل میں جو مولینا روم نے پیش کیا ہے "شمع" میں وہ کیفیتیں جو مثنوی معنوی میں معراجِ کمال کو پہنچ گئی ہیں جا بجا منعکس نظر آتی ہے۔

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق آوازِ کن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

یادِ وطن فسردگیِ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع حالِ قیدیِ دامِ خیال دیکھ مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ
باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے
چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے
یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں اے شمع میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اس نظم میں فطرت کا کوئی منظر اقبال کی نظر کے سامنے نہیں ۔ شمع جو مشرقی شاعری کے لوازمات سے ہے، ایک نئے نور کے ساتھ اُن کے تخیل میں جل رہی ہے ۔ ایک طرف تو وہ اُس سے خیرہ کن نور حاصل کر رہے ہیں ۔ دوسری طرف اُسے ایک نئی روشنی عطا کر رہے ہیں ۔

اور یہ منزل، اقبال کے کلام میں حسن و عشق کے عنصر کی آخری منزل ہے ۔

یہ منزل اُن کی شاعری کے پختہ تر مذہب یعنی پان اسلامزم میں جا کر ضم ہو جاتی ہے ۔ اور مشرق کے لئے روحانی پیغام بن کر اُن کی فارسی شاعری میں ایک نئی روشنی اختیار کرتی ہے اور اس روحانی پیغام میں عشق کا تصور وہی ہے ۔ جو متصوفین اور سالکین کا تھا ۔ مگر بالکل نئے رنگ میں، مغرب سے کامل اکتساب نور کر کے، مغرب کی مادّیت کے خلاف اس پیغام کو پیش کیا گیا ہے ۔

اس کے بعد اقبال کی شاعرانہ نفسیاتی نشو ونما کی جو منزل آتی ہے اُس میں عشق اور عمل باہم مل جاتے ہیں "پیام مشرق" "زبورِ عجم" کے بعض حصوں اور "جاوید نامے" میں عشق اور عمل کے مشترک اور کامل مشرقی تصور سے مشرق کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔

عزیز احمد ۔ بی ۔ اے (عثمانیہ)

۹

زندگی کس قدر دشوار ہو جاتی اگر ہمیں گزری ہوئی باتیں یاد نہ آجایا کرتیں یا اگر ہمارے پاس انھیں یاد رکھنے کے ذرائع نہ ہوتے

جمشید اور عزیزہ کی شادی کو پورے دو سال گزر چکے تھے لیکن خانگی ناموافقتیں اُن کی زندگی میں داخل نہ ہوئی تھیں۔ شوہر کے دوستوں اور بیوی کی سہیلیوں نے یہی دیکھا کہ وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا ہے اور یہ عموماً ہنستی رہتی ہے۔ اور انھیں اس پر تعجب بھی نہ تھا۔ "اعلیٰ تعلیم اور ہم مذاقی" وہ لوگ کہا کرتے "شادی شدہ خاندانوں کی مسرت کا راز ہے۔" وہ اس حقیقت سے بےخبر تھے کہ یہ دونوں چیزیں زندگی کو کامیاب ضرور بناتی ہیں لیکن صرف اس صورت میں جبکہ طرفین آپس میں محبت نہ کرتے ہوں اور اُن کی شخصیتیں ایک دوسرے کے لئے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوں۔ کسی سے دلچسپی لینا، اس کے لئے اپنے اندر احساس اُنسیت کو محسوس کرنا، اُس شخص سے محبت کرنے سے بالکل مختلف ہے۔ محبت اپنے ساتھ رشک، حسد، خود فروشی اور خود غرضی کو لاتی ہے۔ محبت صرف ایک وجود کے سوا ساری دنیا کو فراموش کر دینے کا سبق دیتی ہے۔ محبت فرائض سے بے پروا کر دینے والی پہلی شے ہے جس سے انسان متعارف ہوا۔ محبت تعلیم دیتی ہے بعض اشیا کو صرف اپنا سمجھنے کی حالانکہ احساس ملکیت ایک لعنت ہے۔

دو سال کے بعد جمشید اور عزیزہ کی زندگی میں بھی ایک ایسا دن آیا جبکہ انھوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے سے برہم پایا۔ بات معمولی سی تھی لیکن طرفین کی بڑھی ہوئی محبتیں ایسے تلخ نتیجے کی ذمہ دار تھیں۔ جمشید کو ملال تھا کہ عزیزہ نے اس کی محبت پر اعتماد نہ کیا اور ذراسی بات پر یوں خفا ہوگئی۔ عزیزہ کو رنج تھا کہ جمشید نے اس کی محبت کی قدر نہ کی اور ذراسی بات کے لئے اسے یوں خفا کردیا۔ اگر سوال محبت درمیان میں نہ ہوتا تو شاید وہ بہت جلد پھر اچھے دوست بن جاتے لیکن معاملہ بالکل جداگانہ تھا۔ احساسِ محبت نے انھیں مغرور بنا دیا تھا اور وہ اپنی ہستیوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ وہ باوجود مل جانے کی خواہش کے ایک دوسرے سے نہ مل سکتے تھے صرف اس لئے کہ ان کی متکبر محبتیں منتظر تھیں ایک دوسرے سے لفظ معذرت و معافی سننے کے لئے۔ خود غرضی و خود پرستی جو محبت کے زیر سایہ پرورش پاتی ہے پل کر بڑی ہوگئی تھیں

ڈرائنگ روم میں کرسیاں خاموشی سے میزوں کو تک رہی تھیں۔ ادھر کچھ روز سے بہت کم لوگ ان پر بیٹھنے کے لئے آتے تھے۔ دوست احباب اسی وقت تک ملاقات کے لئے آتے ہیں جب تک قہقہوں اور مسکراہٹوں سے ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے — محبت کے غم میں اداس چہرے انھیں پسند نہیں آتے۔ تکلف سے بنائے ہوئے پان اور مجبوری سے پیدا کئے ہوئے تبسم ان کے لئے دلکش نہیں ہوتے۔

سارے گھر میں ایک پُراسرار خاموشی کا دور دورہ تھا۔ ملازم خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ان کی خوش مزاجیاں مفقود ہوچکی تھیں۔ برآمدے میں ٹنگے ہوئے پنجرے کے اندر سُرخ گردن والا طوطا بھی اپنی شرارتیں بھول گیا تھا۔ اب وہ اپنے کھانے اور پانی کے کٹوروں کو پیروں سے پکڑ کر پھینک نہ دیا کرتا تھا کیونکہ اسے جلد جلد کھانا ملنے کی امید باقی نہ رہی تھی — دوپہر میں بجائے اپنی مالکہ کی سیٹی کی نقل کرنے کے وہ پروں میں سر کو چھپا کر سو جایا کرتا تھا — علی (بوڑھے خانساماں کا لڑکا) اور محبوب گھر کی نوجوان ملازمہ روزانہ کھانے کا میز ترتیب دیتے وقت آپس میں مذاق کیا کرتے تھے لیکن اب وہ بھی سنجیدہ تھے وہ اپنے آقا اور مالکہ کی مخالفت کی نوعیت سے ناواقف تھے لیکن انھیں رائے زنی کرکے کسی ایک فیصلے پر پہونچ جانے سے کون روک سکتا تھا؟

دوپہر ہوچکی تھی لیکن عزیزہ ابھی تک اپنے کمرے ہی میں تھی۔ خاموشی سے گھبرا کر وہ اٹھی اور چاہا کہ کچھ پڑھے۔ جو کتاب اس نے اٹھائی وہ اسکر وائلڈ کی تھی اور جو فقرہ سب سے پہلے کتاب کھولنے پر اس کی نظروں کے سامنے آیا وہ یہ تھا:—

"Women are not to judge, they are to forgive"

اُس نے برہمی کے انداز میں کتاب کو بند کر دیا آج وہ اس نقاد کی رائے سے متفق نہ ہو سکتی تھی۔ بیکاری اُس کے دماغ کو پریشان کر رہی تھی، مشغولیت کی خاطر اُس نے اپنی پرانی چیزوں کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ اُس نے سُنا تھا اور پڑھا بھی تھا کہ جب خیالات افسردہ ہوں اور طبیعت مضمحل ہو رہی ہو تو انسان کو صرف مشغول رہنا چاہیئے —— اُس نے اپنی میز کے ان خانوں کو کھولا جو ایک مدت سے مقفل تھے۔ خطوط کے انبار اور اخبارات کے ڈھیر میں اُسے ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ نظر پڑا اُس نے اُسے کھینچ کر نکال لیا۔ پرانی گرد اور پرانے کاغذات کی ملی جلی خوشبو آ رہی تھی اور اس قسم کی خوشبوئیں ہمیشہ انسان کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر کر دیتی ہیں۔ عزیزہ نے صندوقچہ کھولا یہ صندوقچہ گزشتہ سال اس کی سالگرہ کے موقع پر جمشید ہی نے اُسے دیا تھا۔ صندوقچہ کے اندر مختلف سائز کے کاغذات کاپیاں نوٹ بکس وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ اُس نے ایک خانہ کھولا —— خانہ کا ہینڈل ٹوٹ چکا تھا اور اُسے کھولنے کے لئے اُسے کروشیا کی سوئی استعمال کرنی پڑی۔ ایک چھوٹی سی کاپی جس کی جلد پر تیل اور گرد کے دھبے تھے اُس خانہ میں رکھی ہوئی تھی پہلے تو عزیزہ اس کی اہمیت اور نوعیت کو نہ سمجھ سکی لیکن پھر اُسے یاد آ گیا —— اور ایک مضمحل سا تبسم اُس کے ہونٹوں پر ظاہر ہوا جو دوسرے ہی لمحہ غائب ہو گیا —— اُس نے بڑی محبت اور نزاکت سے کاپی کو کھولا اور پڑھنا شروع کیا —— یہ اُس کی ڈائریاں تھیں۔ اس وقت کی ڈائریاں جبکہ وہ ابھی ایک بچہ ہی تھی —— یوں بھی اُسے ڈائریاں لکھنے کا شروع ہی سے شوق تھا اور اُس کے علاوہ اس کے مولوی صاحب کی تاکید بھی تھی وہ کہا کرتے تھے —— "بیٹی روزانہ جو کچھ تم کرتی ہو اُسے رات میں لکھ لیا کرو تاکہ تمھیں وہ باتیں یاد آ جائیں جو تمھیں روزانہ کرنے چاہئیں اور تم نہیں کرتیں" ہر پرانی چیز دلکش اور نظر فریب ہوتی ہے عزیزہ کے لئے اُس کی یہ ڈائریاں بھی دلچسپی رکھتی تھیں —— اور اس نے پڑھنا شروع کیا۔

۱۲ اپریل

امّی آج خالہ جان سے ملنے گئی تھیں۔ میں ناشتہ کے بعد کمرے میں آئی تو دیکھا کہ جمشید (چچا ابا کا لڑکا) میری ڈرائنگ بک میں بھوتوں اور چڑیلوں کی تصویریں بنا رہا ہے۔ میں نے کاپی اس کے ہاتھ سے چھین لی —— جانتی ہوں کہ وہ ہو بہو چڑیلوں کی سی تصویریں اتار سکتا ہے لیکن پھر بھی مس میری، میری کاپی میں ایسی تصویریں دیکھ کر میرے مذاق کے متعلق کیا خیال کریں گی —— میرے کاپی چھین لینے پر جمشید نے کہا "اوہ۔ تو شاید تمھیں اپنی تصویر دیکھنا مطلق پسند نہیں ؟" —— میں اس کے فقرے کا مطلب سمجھ گئی —— وہ ہر وقت مذاق کر سکتا ہے — ہمیشہ بامعنی فقرے استعمال کر سکتا ہے — مگر میں نے

برداشت نہیں کرسکتی کسی دن موقع ملے گا تو چچا آبا سے کہہ کر اس کی وہ گت بنواؤں گی کہ یاد ہی کرے گا۔ خالہ جان کا تو خیال ہے کہ میرے بال پریوں کے بالوں کی طرح خوبصورت ہیں۔ خیر تو اس کے بعد ماسٹر صاحب آگئے۔ انگلش کا سبق پڑھنے کے بعد میں بھی خالہ جان کے پاس چلی گئی۔ کیونکہ انھوں نے بلا بھیجا تھا ـــــ شام کو واپس آئی۔ رات کے کھانے پر جمشید بھی موجود تھا۔ کھانے کے بعد میں نے جمشید کو کبوتر بند کرنے میں مدد دی وہ اپنے پلے ہوئے جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بند کرتا ہے اور کبوتروں سے تو اسے عشق ہے۔"

عزیزہ جب اس فقرے پر پہونچی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں پر بڑی دیر سے مسکراہٹ موجود ہے وہ ایکدم سے قصداً سنجیدہ ہوگئی۔ وہ آج کل اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مسکراہٹ کو ایک خطرناک چیز سمجھے۔ مسکراہٹیں انسان کی فطرت کو نرم اور گداز بنا دیتی ہیں۔ اور وہ ایک پتھر کی طرح سخت و منجمد رہنا چاہتی تھی اس نے کتاب کے دو تین ورق ایک ساتھ الٹ دیئے۔

۲۴ / اپریل۔

آج جمعہ تھا۔ امی نے صبح ہی صبح مجھے مچھلیاں پکانے کی اجازت دے دی تھی ناشتہ کے بعد میں نے ایک سفید ایپرن پہن لیا اور باورچی خانہ میں چلی گئی ــــ بوڑھی ملازمہ نے مصالحہ تیار کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی بھدی آواز میں مجھے مچھلی پکانے کی ترکیب بھی بتادی اور خود ترکاری لینے باہر چلی گئی۔

ایک اونچی تپائی پر انگریزی چولھا رکھا ہوا تھا اور اس میں سے ہلکی سبز سبز آنچ نکل رہی تھی میں نے کڑھائی میں گھی گرم کرلیا۔ ایسا کرنے میں میرا ہاتھ تو ایک مرتبہ ضرور جلا مگر خیر۔ مچھلی پکانے کی خوشی میں اسے جلد بھول ہوگئی۔ اتنے میں جمشید اپنے بلی کے بچوں کو غذا دینے کے بعد مجھے ڈھونڈھتا ہوا باورچی خانہ میں آگیا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ واپس چلا جائے کیونکہ اگر بوڑھی ملازمہ دیکھ پائے گی تو بہت برہم ہوگی لیکن اس نے ایک نہ مانی وہ چاہتا تھا کہ میں کرسی پر بیٹھ جاؤں اور وہ خود ساری مچھلیاں تل ڈالے۔ اور یہ میں کسی طرح پسند نہ کرسکتی تھی "تم کو شرم نہیں آتی" میں نے کہا "مرد ہوکر ہنڈ کلھیا کھیلتے ہو" یہ بات اسے بہت بری لگی۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا "تو پھر مرد کیا کیا کرتے ہیں؟" میں نے وہی فقرے دہرائے جو نانی اماں کو ایک دفعہ کہتے سنے تھے "مردوں کو تلوار چلانا سیکھنا چاہئے" میں نے کہا "جنگلوں میں جاکر بہادری کے جوہر دکھانا چاہئیں۔ اور شیروں کی طرح لڑ کر مرنا چاہئے" "مگر مجھے تو بلیوں کی طرح خاموشی سے مرنا بہت پسند ہے" جمشید نے

زور سے ہنستے ہوئے کہا، "شرم شرم"، میں نے بالکل نانی اماں کے لہجے میں کہا، "آج کل کے مردوں کے خیالات کیسے خراب ہوتے جا رہے ہیں" "بے انتہا" جمشید نے کہا۔ لیکن یہ بھی بڑے شرم کی بات ہے کہ عورتیں ہنڈ کلھیا پکاتے وقت، بقول ماسٹر صاحب کے "سیاسی مسئلوں" پر رائے زنی کرنے کی عادی ہوتی جا رہی ہیں" اس کے لہجے میں بڑے بڑے معنی چھپے ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے پلٹ کر مچھلیوں کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جمشید کی ناہنجار بلی میٹھی مصالحہ دار مچھلی کا آخری ٹکڑا کھا رہی ہے۔ میرے پاس مارنے کو کوئی چیز نہ تھی اس لئے میں نے کرچھے کا گرم گرم گھی اس پر الٹ دینا چاہا لیکن وہ بھاگ گئی اور جمشید بھی ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ میں غصہ کے مارے دیوانی ہو گئی اور اس کے پیچھے دوڑی۔ آخر باغ میں جا کر اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئی اور دو تین گھونسے اس کے کان پر رسید کئے اس نے جواب میں مجھے نہیں مارا بلکہ ہنستا ہی رہا شاید اسے چوٹ نہ لگی ہوگی۔ امی اب تک ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھیں ابا گھر پر نہ تھے نانی اماں روٹھے سے تھیں اس لئے بہت کم بات کر رہی تھیں اور برآمدے میں بیٹھی مسلسل نمازیں پڑھ رہی تھیں۔ میں مچھلی کے غم میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آئی۔ واقعی اگر میں پہلے اپنا کام کر لیتی اور اس کے بعد باتیں کرتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھر بھی یہ جمشید ہی کا کیا دھرا تھا اسی نے مجھے باتوں میں لگایا۔ رات کے کھانے کے بعد جمشید نے مجھ سے معافی مانگی وہ بڑی دیر تک خوشامد انہ باتیں کرتا رہا۔ لیکن میں نے اسے معاف نہیں کیا۔ مگر کل صبح کو میں اسے معاف کر دوں گی۔ میں زیادہ دیر اس سے خفا نہیں رہ سکتی آخر وہ میرا بھائی ہی تو ہے"

عزیزہ یہیں تک پڑھنے پائی تھی کہ بھڑے ہوئے دروازے میں سے ایک بلی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اس کے منہ میں ایک کبوتر تھا اس کے پیچھے ہی جمشید داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ آج صبح سے وہ مشغولیت کی خاطر اپنے محبوب کبوتروں کے گھروں کو صاف کروانے میں مصروف تھا اور ابھی ابھی اس کام سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں افسردہ خاطر کرسی پر بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ عزیزہ سے اتنی زیادہ محبت کیوں کرتا ہے۔ اور اس کی خانگی زندگی اب پھر کس طرح دلچسپ و خوشگوار ہو سکتی ہے۔ عزیزہ سے معافی مانگ لینے میں کچھ حرج نہیں ہے لیکن وہ خود ہی مجھے کیوں نہ معاف کر دے" اس نے سوچا "اسے یہ تو خیال کرنا چاہئے تھا کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں"

اس کے خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہونچا تھا کہ کبوتر خانے کی طرف سے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی اس نے جلدی سے نکل کر دیکھا تو ایک بلی کو اپنا سب سے زیادہ خوبصورت کبوتر پکڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا اس نے لکڑی اٹھائی اور اس کے

پیچھے ہولیا اتفاق سے۔ بالکل اتفاق سے وہ دونوں یعنی بلّی اور جمشید عزیزہ کے کمرے میں داخل ہوگئے۔

”آہ۔ جم۔ تو اُس نے تمھارے عزیز ترین کبوتر کو پکڑ لیا۔ ایں ہیں“ عزیزہ نے کتاب پر سے نظر اُٹھاتے ہوئے بے اختیار کہا۔ وہ بھول گئی کہ وہ جمشید سے ایک محبت کرنے والی بیوی کی طرح خفا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بچپن کے وہ دلچسپ سین تھے جبکہ وہ روزانہ ایک دوسرے سے خفا ہوتے تھے اور دوسرے دن از سرِنو ان کے اتحاد کی تجدید ہوتی تھی۔ وہ اپنی ڈائری کے وہ حصہ پڑھ رہی تھی جہاں جمشید کو معاف کردینے کی خواہش دل میں لئے ہوئے وہ سو جاتی ہے اُسے اس وقت بھی یہی محسوس ہوا کہ جمشید اس کا شوہر نہیں بلکہ اس کے کھیل کود کا رفیق اور اس کا صرف ایک دوست ہے۔

”اوہ، عزیز۔ تو تم نے مجھے معاف کردیا؟ تم مجھے معاف کردوگی؟“

جمشید کی خوشی بے اندازہ تھی ”عزیزہ! مجھے یقین تھا کہ تم اس واقعہ کو ضرور بھول جاؤگی۔ اور مجھے معاف کردوگی۔ آخر میں تمہارا شوہر ہی تو ہوں اور مجھے تم سے کتنی بے پناہ محبت ہے“

عزیزہ خاموشی سے مسکرائی ”ہاں اُس نے کہا میں نے آپ کو معاف کیا اس لئے نہیں کہ آپ میرے شوہر ہیں بلکہ اس لئے کہ کسی وقت آپ میرے شوہر نہ تھے۔ میں اس واقعہ کو بھول جاؤں گی اس لئے نہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے یا مجھے آپ کی چاہت ہے۔ بلکہ اس لئے کہ کسی زمانے میں ہمیں ایک دوسرے سے محبت نہ تھی بلکہ صرف دلچسپی“

رابعہ

سوزِ ناتمام

وہی عقل کی پرستش، وہی حوصلہ کی خامی — نہ وہ جرأتِ کلیمی نہ وہ ذوقِ ہمکلامی
مرے روز و شب کی فطرت جو بدل سکو بدل دو — کہ نہیں قبول مجھ کو مہ و مہر کی غلامی
میں زباں سے کیوں کہوں کچھ، مری خامشی ہے سب کچھ — مری ہر نظر گزارش مرا ہر نفس پیامی
مجھے کیا پیام دے گی، تری زندگی کی دنیا — کہ فنا کی وادیوں میں، مجھے دی گئی سلامی
نئے کارواں کی فطرت، ہے تمام ترسیاست — نہ حُدی کی اب ضرورت، نہ وہ ذوقِ خوشخرامی
مجھے ڈر ہے کالجوں کو نہ خراب جہل کر دے — یہ غرورِ علم و دانش یہ جنونِ پختہ کامی

مرے حالِ مضطرب پر ابھی ہنس رہی ہے دُنیا ابھی ڈھیل دے رہا ہے مرا سوزِ ناتمامی
مرے سوزِ دل کی قیمت فقط اک نگاہِ الفت ترے دردِ دل کا سودا ابھی عشرتِ دوامی
مرے دل نے آج ماہر کوئی چیز اُن سے مانگی
بہ نگاہِ مستِ خسرو، بہ سرورِ قلبِ جامی

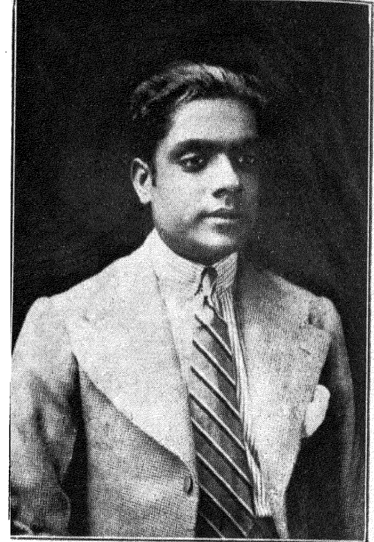
ماہر القادری

آزادی ہند کی ایک ناکام کوشش

اس تحریک کے متعلق جو عام طور پر ہندوستان کی تاریخ میں "غدر" کے نام سے موسوم ہے مورخین کے زاویہ نظر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، بعض مورخین کے نزدیک جو سر جان لارنس کی رائے سے متفق ہیں یہ تحریک محض ایک مقامی فوجی بغاوت تھی اور عام طور پر ملک میں بغاوت کے متعلق کوئی سازش نہ تھی، میرٹھ میں فوجوں کی بغاوت کو دیکھ کر چند خود غرض لوگوں نے ذاتی جلب منفعت کی خاطر ملک کے دوسرے حصوں میں شورش برپا کی اور یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ اخیر تک یہ تحریک عام نہ ہو سکی،

جنرل اوٹرم نے جو الحاق اودھ سے پیشتر کمپنی کی جانب سے وہاں رزیڈنٹ تھے اس کے برعکس رائے ظاہر کی ہے، ان کے نزدیک غدر کی تحریک مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سازش تھی جس میں ہندوؤں کے بعض طبقوں کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ جہاں ایک حد تک یہ درست ہے کہ غدر کی تحریک کبھی عام ہونے نہیں پائی ان معنوں میں کہ ملک کا ہر فرد و بشر اس سے متاثر ہوا ہو وہیں اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ملک کی وسعت اغراض کا اختلاف اور پچھلی تاریخ کو دیکھتے ہوئے ہندوستان میں اس سے قبل اتنے وسیع پیمانے پر کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی، اگر اسے محض فوجی بغاوت کہا جائے تو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بغاوت محض میرٹھ کے فوجی دستہ سے نہیں شروع ہوئی بلکہ اس سے پیشتر



مسٹر محمد بدرالدین حسین بی اے ۔ معتمد ٹینس کلب



مسٹر ذکی الدین صدیقی اسپورٹس کیپٹن



مسٹر محمد مولانا بی ۔ اے
ایک ہمہ گیر کھلاڑی ہیں اور جامعہ میں کھیل کود کی
مختلف انجمنوں کے عہدہ دار بھی رہ چکے ہیں

ہی اکثر فوجی دستوں میں بدظنی اور ہلچل پیدا ہو چکی تھی، مثال کے طور پر بیرک پور اور بیرام پور کے واقعات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ایک نیچ ذات کے ہندو کا ایک برہمن سے، پانی پلانے سے انکار کے جواب میں یہ کہنا کہ "اب ذات پات کا خاتمہ ہے اور ہم تم ایک ہیں کیونکہ خود تم کو ایسے کارتوس استعمال کرنا پڑ رہے ہیں جن پر گائے یا خنزیر کی چربی کی پالش ہوتی ہے۔ فساد کا باعث ہوا۔

اس ایک فقرہ نے بیرک پور اور بیرام پور کی چھاؤنیوں میں ہلچل ڈال دی تھی کیونکہ یہ نیچ ذات کا ہندو ڈم ڈم کی میگزین میں ملازم تھا اور اسی زمانہ میں پرانی طرز کی بندوقوں کے بجائے جنھیں براؤن براس کہتے تھے نئی قسم کی اینفیلڈ رائفلوں کا رواج فوجوں میں عام کیا گیا تھا اور ان میں کارتوسوں کا استعمال ناگزیر تھا، اس کے ساتھ ہی ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ ان چھاؤنیوں میں صرف دیسی سپاہی ہی تھے اور یوروپین افسر برائے نام تھے اور یہ معدودے چند یوروپین افسر ہرگز ان سپاہیوں کی باہمی ملاقاتوں اور خفیہ سازشوں سے باخبر نہ تھے اور میرٹھ کی شورش سے بہت پیشتر بیرم پور اور بیرک پور میں حکومت کے خلاف بدظنی پیدا ہو چکی تھی بلکہ میرٹھ خود اُن رجمنٹوں سے متاثر ہوا جو نئی بیرم پور اور بیرک پور کی چھاؤنیوں سے وہاں بھیجدی گئی تھیں۔

بنگال کی افواج کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان پر عام فوجی قانون عرصہ تک نافذ نہ کیا تھا جو مدراس اور بمبئی کی افواج پر نافذ تھا نیز یہ افواج مشتمل تھیں اودھ کے علیحدہ کردہ سپاہیوں، بنگالہ کے اونچی ذات کے ہندوؤں اور راجپوت طبقہ پر جن پر مذہب کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ حکومت اور بالخصوص ایک بیرونی اور غیر حکومت اور افسروں کی تابعداری وفرمانبرداری بھی اس کے سامنے ہیچ تھی، یہ مذہبی رنگ بنگال کی افواج تک محدود نہ تھا بلکہ ان تمام فوجوں پر چھایا ہوا تھا جو اس وقت کمپنی کی ملازمت میں تھیں، اس کا ایک تجربہ حکومت کو مدراس کی شورش ۱۸۰۶ء میں ہو چکا تھا کہ محض "پگڑی" کی بدعت پر فوج میں بغاوت کے اثرات رونما ہو گئے تھے، درآنحالیکہ ان مدراسی افواج کے متعلق تجربہ کار اور ذمہ دار انگریز افسروں کی رائے تھی کہ بنگال کی افواج کے مقابلہ میں ان کو قابو میں رکھنا کہیں زیادہ آسان ہے، لہٰذا اس شورش کی بنا پر محض یہ واقعہ نہیں پیش کیا جا سکتا کہ اس وقت ملک میں انگریزی افواج غیر معمولی طور پر کم تھیں اور دیسی سپاہیوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس فرق کی نسبت کے احساس نے شورش شروع ہونے کے بعد جلتی آگ میں تیل کا کام کیا، لیکن اس شورش کے اسباب حقیقی معنوں میں کچھ اور ہی تھے۔

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کی تھی اور مسلمانوں کی سازش کو خود غرض ہندوؤں کی مدد سے تقویت ملی، یہ

بھی غلطی پر مبنی ہے، اس میں شک نہیں کہ کمپنی نے ایک طرف مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست کا الحاق کر لیا تھا اور خود شہنشاہی کے اعزازو مراتب پر ضرب کاری لگائی تھی اور اگرچہ لارڈ ڈلہوزی ان تمام تجاویز کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے جو مجلس نظار کی طرف سے شہنشاہیت کے خاتمہ کے متعلق پیش کی گئی تھیں تاہم اپنے طرز عمل سے انہوں نے اتنا ضرور ثابت کر دیا تھا کہ دھلی کی شہنشاہیت برائے نام ہے اور لارڈ کننگ نے ہندوستان کے حالات پر ڈلہوزی کی طرح اعتماد نہ کرنے کے باوجود بہادر شاہ کو ایک یادداشت میں یہ لکھ بھیجا تھا کہ ان کے بعد شہنشاہیت کا خاتمہ ہے۔

لارڈ کیننگ کا مقصد دراصل قلعہ دہلی پر فوجی تسلط تھا کیونکہ اس قلعہ کو خاص سیاسی اور فوجی اہمیت حاصل تھی، مگر اس مقصد کی کامیابی سے پہلے ہی اس یادداشت نے قلعہ کے اندر اور باقیماندہ وابستگان دولت کے دلوں میں کمپنی کے خلاف جو جذبہ پیشتر سے موجود تھا اس کو اور بھی مشتعل کر دیا اور نواب زینت محل بیگم کی کوششیں دکن اور فارس تک کے مسلمانوں کو ابھارنے کیلئے اسی یادداشت کی وجہ سے شروع ہوئیں کیونکہ اس یادداشت کا براہ راست اثر ولیعہد کی تخت نشینی پر پڑ رہا تھا۔

مگر باوجود اس کے اس پوری تحریک کو محض مسلمانوں کی سازش سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس حکمت عملی سے مسلمانوں کو یہ نقصانات پہونچ رہے تھے اس کا اثر ہندوؤں پر بھی پڑے بغیر نہ رہا تھا اور مسلمانوں کی طرح بہت سے راجا اور رئیس، والیان ملک اور ان کی املاک "قانون الحاق" کا شکار ہو چکے تھے۔ نانا صاحب کو وراثت سے محروم کر دینا، رانی جھانسی کو بدظن کر دینا، ستارا اور ناگپور کا الحاق اور بہت سے چھوٹے چھوٹے رجواڑوں کے اعزاز خاندانی، نسلی مناصب اور مراتب میں تخفیف اور خصوصاً نانا صاحب کا ولایت (انگلستان) سے بے نیل و مرام ہونا، یہ سب مل کر ہندو قوم کی بےچینی کا باعث بننے کے لئے کافی تھا، نیز ایسے سخت ضوابط و قوانین کا نفاذ عوام کے لئے اور خصوصاً ان طبقوں کے لئے جو اس وقت تک اپنے پشتہا پشت کے امتیازات کی وجہ سے بڑی حد تک ان پابندیوں سے مستثنیٰ خیال کئے جاتے تھے، حد درجہ بےچینی کا باعث ثابت ہوا، یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسے ہی مقامات پر شورش میں شدت اور سول انگریزی باشندوں پر مظالم زیادہ ہوئے جہاں کے ممتاز طبقوں پر ان قوانین کا اثر زیادہ ہوا تھا، مثلاً لکھنؤ، دہلی، کانپور۔

بعض مورخین کی رائے ہے کہ اس عام اصول کے تحت کہ جب مرکزی حکومت کمزور ہو جاتی ہے تو امراء و رؤسا ذاتی جلب منفعت کی خاطر بغاوت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، ہندوستان میں یہ شورش پیدا ہوئی مگر یہ زاویہ نگاہ فوجی تنظیم کی حد

تک صحیح ہو سکتا ہے ، یعنی یہ کہ مرکزی حکومت دہلی کی کمزوری کی وجہ سے فوجی تنظیم میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان کے مظاہرے لارڈ ہیسٹنگز کے وقت میں پنڈاری اور مرہٹوں کے غول در غول دستوں کی تباہ کاریوں کی صورت میں ہوئے تھے ، اور اگرچہ ان کا استیصال کر دیا گیا تھا لیکن صرف جرائم کی حد تک ، ورنہ ان کا بالکلیہ خاتمہ ہو چکا تھا ، نیز انہی منتشر گروہوں کو جب کمپنی نے اپنے اغراض کے لئے جمع کیا تو ان کی سرشت بدلی نہ تھی اس وقت کی ہندوستان کی ایسی فوجی آبادی کا تو یہ عالم تھا کہ خود رنجیت سنگھ جیسا بہادر سپہ سالار یہ اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ اُسے اپنے دشمنوں سے زیادہ اپنے فتحیاب سپاہیوں سے اندیشہ رہتا ہے ، اور حقیقت بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں مرکزی حکومت کی کمزوری سے زیادہ خود کمپنی کے افسروں کی رسوم ملک سے بے اعتنائی کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس سے نہ صرف عام باشندے بد دل ہو رہے تھے بلکہ فوج کے سپاہی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے تھے ۔

عام طور پر اس تحریک کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کرنا اور ایک علاقہ کی تحریک کو دوسرے علاقہ کی تحریک سے غیر متاثر اور غیر متعلق سمجھنا صریح غلطی ہے ، اور ساتھ ہی یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اس تحریک کا مقصد تمام طبقوں کے نزدیک یکساں طور پر ہندوستان کو آزاد کرا دینا ہی تھا لیکن ایک غیر قوم کی سیادت کا احساس ، اور انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ ہندوستان میں عام تھا ، اور اسی کے اظہار کے لئے جدا جدا محاذ قائم تھے ، اگر طرز کارروائی میں یکسانیت ہوتی اور مقصد مشترک سے اغماض نہ برتا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ یہ تاریخی واقعہ "۱۸۵۷ء کا غدر" نہیں بلکہ "جنگ آزادی ہند" کے نام سے موسوم کیا جاتا۔

اس تحریک کی ناکامی ہی اس کے غدر یا شورش کے نام سے موسوم کئے جانے کی ذمہ دار ہے ، اگر اس تحریک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہم کو ایک ایسی قوم نظر آتی ہے جو صدیوں پیشتر سیاسی قومی ترقی کے مراحل سے گذر چکی تھی ، جس کے ابھی ہندوستان نے خواب تک نہ دیکھے تھے اور دوسری طرف ایک ایسا منتشر انبوہ تھا جہاں جگہ جگہ پر ذاتی اغراض ومنافع پر ملک کے مفاد کو قربان کیا جا رہا تھا ، اتحاد و اتفاق ، ہم آہنگی یا قومیت کا تصور تک نہ تھا ۔ ایک اور وجہ اس تحریک کی ناکامی کی با وجودیکہ ملک کے طول و عرض میں اس کو مقبولیت حاصل تھی ، انگریزی فوج کی تنظیم اور حکومت کی مرکزیت تھی برخلاف اس کے دیسی افواج غیر منظم اور ذاتی ہوا و ہوس کا زیادہ شکار تھیں ۔ کمپنی کے افواج کی تنظیم ، انگریزی قوم کی خصوصیات اور حکومت کی مستحکم مرکزیت کے باوجود اس تحریک میں اتنی شدت اور سرے سے اس کے وجود میں آنے کے اسباب پر اگر تاریخی حالات کی روشنی میں نظر ڈالی جائے تو ہم ان وجوہ کی حسب ذیل تقسیم کر سکتے ہیں ۔

۱- سیاسی وجوہ

۲- فوجی وجوہ

۳- معاشرتی وجوہ

۴- مذہبی وجوہ

الحاق کی حکمت عملی نے سیاسی اور سماجی دونوں طرح پر بےچینی پیدا کرکے معرکۂ ۱۸۵۷ء کے اسباب مہیا کئے، اس حکمت عملی کی بناء پر ملک کا قدیم نظام درہم برہم ہوا، جہاں دیسی ریاستوں میں صدیوں سے رعایا اپنے ایک رئیس کی تابع اور اس کے طرز حکومت پر قانع تھی اور یہ اطاعت روایاتی ہونے کے ساتھ ساتھ گویا مذہبی شکل اختیار کرچکی تھی وہاں ایک غیر ملک، غیر مذہب اور غیر معاشرت کے چند ایسے افراد کے اثر سے جن میں سے بعض شرافت نفس سے بھی معرّا تھے ایک اندرونی انقلاب پیدا ہوا، ایشیا اور خصوصاً ہندوستان کے باشندے فطرتاً بادشاہ پرست واقع ہوئے ہیں اور تخت وتاج کا انتقال ایشیائی تاریخ میں کبھی غیر اہم واقعات بغیر نہ ہوا، بادشاہ اور خاندان شاہی کے افراد سے ناقابل توجیہ محبت، ایشیائی افراد کی فطرت وجبلت میں داخل ہے، اس دور جمہوریت میں بھی ایران، افغانستان اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور روشن خیال ملک جاپان میں بادشاہ پرستی کا جو جذبہ رعایا برایا کی ذہنیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے وہ اسی شاہ پرستانہ سرشت کا نمونہ ہے، اور خود بادشاہ کی ذاتی رعایا نوازیاں ان پرستانہ جذبات کی ترقی کا سبب اور ایشیائی بادشاہوں کے لئے طرۂ امتیاز رہی ہیں۔

ہندوستان میں مرکزی حکومت پر کمپنی کا قبضہ باجگزار اور ریاستوں کے حق میں مضر ثابت ہو رہا تھا اور پھر ریاستوں پر کمپنی اور کمپنی کے ملازمین کا تباہ کن اثر افراد ریاست کے حق میں مہلک ثابت ہوا، بالخصوص ایسے طبقے زیادہ متاثر ہوئے جو اس ریاست کی خوشحالی اور اس کے قائم رہنے سے قائم تھے، اس کے علاوہ جیسا کہ اودھ میں ہوا کہ کمپنی نے اصلاح کی کوشش کی قدیم روایات کو نظر انداز کرکے ایسے عہدہ دار مقرر کئے جو ایک طرف تو ملک کے روایات سے ناواقف تھے اور دوسری طرف نظم ونسق حکومت کے معاملات میں بھی کافی وسیع النظر نہ تھے، حالانکہ حالات کا اقتضاء تو یہ تھا کہ پہلے بھی زیادہ وسیع النظری سے کام لیا جاتا۔ مرہٹوں کی شکست کے لئے لارڈ ہیسٹنگز کے عہد حکومت ہی سے کمپنی نے سیادت قائم کرنے اور حلقہ اقتدار کو وسیع کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کی اور بہ نسبت ولزلی، کارنوالس اور وارن ہیسٹنگز کے دور کے

کمپنی کو مارکوئیس آف ہیسٹنگز کے بعد اور بالخصوص ڈلہوزی کے زمانہ میں اقتدار سیاسی کا حصول بہت آسان معلوم ہونے لگا تھا، اور وہ تمام قوتیں جن سے کمپنی کو انفرادی طور پر سابقہ پڑا تھا بالکل ہیچ معلوم ہونے لگی تھیں اور اس میں شک نہیں کہ تیس سال کے اندر اندر تقریباً سارے ملک پر کمپنی کا تسلط ہو گیا مگر اس سیاسی تفوق نے ذہنی تعصب میں اور بھی اضافہ کیا، اس سیاسی سیادت کا غرہ کمپنی کے اکثر عہدہ داروں کو احساس برتری کے اظہار پر مائل کرنے لگا، چنانچہ ملک کے رسوم کے ساتھ بعض مرتبہ سیاسی معاہدوں کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور یہ بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی حالانکہ صرف سلطنت کو وسیع کرنے کی حد تک یہ حکمت عملی بہت کامیاب رہی مگر انگریز عہدہ داروں میں احساس برتری اور دیسی باشندوں میں اپنی حق تلفیوں کا احساس یہ دو ایسے نتائج تھے جو اپنی اپنی جگہ پر خوشگوار تعلقات یا رواداری کے سخت منافی تھے اور جیسے جیسے ان میں اضافہ ہوتا گیا صورت حال نازک ہوتی گئی، خصوصاً ڈلہوزی کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے تو اُن مواقع پر جہاں پالیسی صحیح بھی تھی طریق کار کچھ ایسا تھا کہ جس میں احتیاط اور رواداری کے پہلو کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا تھا، خود مقبوضات میں اتنی وسعت ہو گئی تھی کہ ان کو بیرونی واندرونی خطرات سے محفوظ رکھنا بڑے تدبر کا کام تھا، ڈلہوزی نے ایک حد تک اس پہلو کو پیش نظر رکھا اور سیاسی اور فوجی مرکز کو کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا اور ساتھ ساتھ نظمار کی توجہ انگریزی افواج میں اضافہ کی طرف مبذول کرائی، اس کے باوجود بھی اس کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ اپنے جانشین کے لئے ایک پُرامن اور مستحکم سلطنت چھوڑ رہا ہے۔

انگلستان کے وہ مدبر جو ہندوستان کے حالات کو فطرت انسانی کی روشنی میں دیکھ رہے تھے واقف تھے کہ ایک ایسے ملک پر جو خود یورپ سے زیادہ قدیم تمدن کا مالک رہا ہے اس قدر جلد اقتدار قائم کر لینا سہل نہیں، نیز نئی تعلیم کے رواج اور پُرانی تعلیم کے زوال کے نتائج حکومت کی استبدادانہ پالیسی کے لئے خوش آیند نہ ہوں گے، چنانچہ لارڈ کیننگ نے لارڈ ولیم بنٹنگ، سر چارلس مٹکاف اور سر جان مالکم کے بیانات کی بنا پر انگلستان سے روانہ ہوتے وقت یہ کہا تھا کہ اگرچہ بظاہر ہندوستان میں امن وامان قائم ہے مگر بہت ممکن ہے کہ کسی غیر اہم واقعہ ہی کی بنا پر ایک ایسا فساد برپا ہو جائے جس کا فرو کرنا حکومت کمپنی کے حیطہ اختیار سے باہر ہو، اور اس پُرامن مطلع ہند پر بادل کا چھوٹا سا ایسا ٹکڑا نمودار ہو جو بڑھتے بڑھتے ایک ایسے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو تو ہماری تباہی کا باعث بن جائے۔ لارڈ کیننگ کا یہ خطرہ خالی از علت نہ تھا، ہندوستان کی سماجی پیچیدگی سے واقف ہوش گوش رکھنے والے اہل نظر ایسی رائے قائم کریں۔

اودھ میں جیکسن اور گیبنس کی آپس کی نااتفاقیوں نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ لارنس بھی اپنی تمام تر کوشش کے باوجود

حالات پر قابو پانے سے معذور رہا، اور سوا اس کے کچھ نہ کر سکا کہ سر چارلس مٹکاف اور سر جان مالکم کی تنبیہات کا اعادہ گورنر جنرل کے پاس کرتا رہے مگر کیننگ نے لارنس کے ان پیش کردہ خطرات کو ذرا بھی کان نہ دیا، اودھ کے شاہی خاندان کی شکایت تھی کہ حکومت کا سلوک قدیم روایات سے مختلف اور ان کے اعزاز و مراتب کے شایان شان نہیں، امرا شاکی تھے کہ مالگذاری کے انتظامات جدید ان کے لئے مکلف ہیں اور حکومت ان کے ساتھ مطلق ہمدردی کا اظہار نہیں کرتی، ان کی وراثت، اور بعض مواقع پر ان کی جاگیروں کے متعلق مالگذاری کے عہدہ داروں کی سرپرستی میں کمزور درجہ کے لوگ دعاوی پیش کرنے لگے، نیز اسی زمانہ میں حق وراثت ثابت کرنے کے لئے جو ضوابط نافذ ہوئے تھے اُن پر سختی سے عمل شروع ہوا، ساتھ ہی زمینداروں کے لئے اور بھی ایسے نئے ضوابط مرتب ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ کسانوں پر جو بار ہے اس کو کم کر کے حکومت کے لئے ان کی ہمدردی حاصل کی جائے، لیکن ایسی ریاستوں اور راجپوتانوں میں جہاں صدیوں سے نظام جاگیری کے اثرات پائے جاتے ہوں اور آخر میں مرکزی حکومت کی کمزوری کے باعث والیان ریاست کے اختیارات غیر معمولی ہو گئے ہوں، ایسے ضوابط کا نفاذ ظاہر ہے راجہ اور پرجہ دونوں کے احساسات کو ٹھیس لگانے اور انقلابی تحریک کا مادہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھا، اودھ، ناگپور اور ستارا کے واقعات اس کی اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں، اس اصول کے مطابق کہ جاگیر جو معرض بحث میں ہو یا تو کمپنی کے علاقہ میں ضم کر دی جائے یا ہر ایسے مقدمہ میں جہاں وراثت مشکوک ہو تحقیقاتی مجلس کے تصفیہ کو بھی منسوخ کر دیا جائے، حکومت بمبئی نے کئی چھوٹی بڑی ریاستوں کو ختم کر لیا اور تقریباً بیس ہزار جاگیرداروں اور انعام داروں کی معاش ضبط کر لی۔

ہندوستانی رؤسا کے دربار عیش و عشرت کے زندہ مرقع ہوا کرتے تھے اور انہیں عیش پسندیوں کی بدولت ہندوستانی نواب بدنام تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ باوجود اس کے رعایا مطمئن اور خوش حال تھی کیونکہ ان کے اسباب عیش اور سامان طرب اسی ملک میں سے فراہم ہوتے تھے اور شان ریاست کے برقرار رکھنے میں ہزاروں افراد ملک کا پیٹ پلتا تھا، رؤسا کے خاتمہ کے بعد وہ تمام طبقے جو دربار کی نام نہاد "فضول خرچیوں" پر ہی زندہ تھے بے خانماں برباد ہو گئے، رؤسا کی سرپرستی ختم ہونا ان کے لئے پیام موت ثابت ہوا، درباروں کے خاتمہ نے بہت سی دیسی صنعتوں کا خون کیا اور اب ان مصنوعات کا قدردان کوئی باقی نہ رہا، مقامی صنعتوں کی اس تباہی نے معاشی انحطاط صورت اختیار کی، حکومت کی طرف سے بجائے اس کے کہ ان کی فلاح و بہبود کا کوئی انتظام ہوتا یا ان کے ساتھ رعایتیں کی جاتیں اُن کو پہلے تو اس الزام میں کہ وہ شاہی دولت کے "لوٹنے" میں حصہ

لے رہے تھے سزائیں دی گئیں اور پھر کمپنی چونکہ تاجروں کی ایک جماعت تھی اور دیسی صناع حریف کی حیثیت رکھتے تھے اسلئے نہ صرف اغماض برتا گیا بلکہ ان کے تباہ کرنے کا کافی سامان کیا گیا۔ انقلاب صنائع کی بدولت ہندوستان کی مصنوعات یونہی کس مپرسی کی حالت میں تھیں اس پر کمپنی کا رویہ اور ایک تازیانہ ہوا تاجروں کی اس جماعت نے اپنے ہم وطنوں کے شور وغوغا کی بنا پر دیسی صناعوں کی تباہی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا یہی خانماں برباد افراد "چوں تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق حکومت کمپنی کے خلاف سازش میں پیش پیش ہونے لگے۔

حکومت کمپنی کے خلاف لوگوں کے دلوں میں طرح طرح سے بدظنی پیدا کی گئی، عام طور پر یہ پشین گوئی کیجارہی تھی کہ چونکہ کمپنی کی حکومت کے سو سال پورے ہوگئے ہیں اسلئے اب اس کے خاتمہ کا وقت آگیا ہے، اور ہندوستان کے سریع الاعتقاد باشندے اس پشین گوئی سے خاصے متاثر تھے، روٹیوں کی تقسیم اب تک ایک راز سربستہ ہے مگر اس سے عوام میں ایک سازش کا پتہ ضرور چلتا ہے جس کے پیچھے چند ارباب اقتدار کے ہاتھ بھی معلوم ہوتے ہیں۔

اسی عرصہ میں قلعہ دہلی سے ایک اعلان شایع ہوا جو شاہ ایران کی طرف منسوب کیا گیا تھا اور جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ عنقریب شمالی ہند پر حملہ کرکے کمپنی اور اس کے عہدہ داروں کو ملک سے نکال دے گا، یہ اعلان جعلی تھا مگر اسکا اثر عوام پر بہت ہوا، اس پر یقین کر لینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاہی خاندان کی طرف سے پیامات ایران روانہ کئے گئے تھے اور دوسرے یہ کہ ہرات کے مسئلہ پر انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیان چشمک تھی، نیز دہلی میں امیدیں اس سے بھی پیدا ہوگئی تھی کہ فوجیں نظم ونسق کی غلطی سے کوئی انگریزی فوج مغلیہ شہنشاہی کے پایہ تخت میں نہ رکھی گئی تھی اور جو دیسی فوج دلی میں موجود تھی اس سے توقع تھی کہ وہ وقت پڑے پر بادشاہ کا ساتھ دے گی کسی مالی معاوضہ کی امید نہ سہی محض بادشاہ کا نام اسکی امداد حاصل کرنے کے لئے کافی سمجھا گیا تھا، نیز قلعہ پر بادشاہ کا پورا قبضہ تھا جس سے ایک مرکزی حیثیت قائم تھی چنانچہ جب پہلے معرکہ میرٹھ کے بعد فوجیں دہلی میں جمع ہوئیں تو اسی قلعہ پر مرکز بنایا گیا۔

فوجی اسباب کا جہاں تک تعلق ہے ان کا اثر شورش کے دوران میں زیادہ نمایاں ہوا۔ مگر جہانتک شورش پیدا کرنیوالے اسباب کا تعلق ہے وہ معاشرتی یا سماجی اور سیاسی اسباب تھے چند اور اسباب ایسے ہیں جن کو مذہبی کہاجاسکتا ہے اور جو سیاسی اور معاشرتی یا سماجی وجوہ سے کہیں زیادہ سریع الاثر ثابت ہوئے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ شروع میں انگریز محض تجارت کی غرض سے آئے تھے مگر ایک وسیع زرخیز ملک میں دولت

کی افراط دیکھ کر انہوں نے پیر جمانا شروع کئے اور رفتہ رفتہ خوب پیر پھیلائے، ولندیزیوں کی مثال ان کے سامنے موجود تھی لہذا مذہب کے معاملہ میں علانیہ وہ کوئی رویہ اختیار کرنا نہ چاہتے تھے اسلئے شروع میں اس کی خاص طور پر احتیاط ملحوظ رکھی گئی مگر ۱۸۱۳ء میں کمپنی کے منشور کی تجدید کے سلسلہ میں منجملہ اور مطالبات کے جو عوام کی طرف سے پیش کئے گئے ایک یہ بھی تھا کہ دین مسیحی کی اشاعت کے لئے کلیسا کی باقاعدہ تنظیم کی جائے، چند دانشمند اور دوراندیش انگریزوں نے علانیہ اشاعت کی اسوقت بھی مخالفت کی مگر لارڈ میکالے ایسے لوگوں کا خیال تھا کہ چند سال ہی کے اندر اندر سارے ہندوستانی باشندوں کو عیسائی بنالیا جاسکتا ہے، پیش بین انگریزوں کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا کہ جب خود کمپنی کے عہدہ دار باوجود شدید پابندیوں کے ہندوستانی عوام میں شورش کا باعث بن جاتے ہیں تو یہ مسیحی مبلغ ضرور ایک بڑی شورش پیدا کردیں گے، چنانچہ مشنریوں کو حکومتی امداد حاصل ہونے اور آزادانہ تبلیغ کی اجازت کا یہ نتیجہ ہوا کہ عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگیا کہ خود حکومت بجبر مذہب کی تلقین کرانا چاہتی ہے مشنریوں کو جو غیر معمولی مراعات حاصل تھیں وہ دیسی باشندوں کو کھٹک رہی تھیں، نو عیسائیوں کو حکومتی امداد و اعانت حاصل ہوتی تھی، دیسی آبادی پر مشنریوں نے اثر جمانا شروع کیا تھا نیز بعض مقامات پر حکومتی عہدہ دار بھی ان کے زیر اثر تھے، اس صورتِ حال نے دین مسیحی کے بجبر رائج کئے جانے کو اور بھی تقویت دی۔

لارڈ ولیم بنٹنگ ہی کے زمانہ سے مشرقی تعلیمات کے لئے سرکاری امداد کا بند ہوجانا اور مغربی تعلیم کا روزافزوں رواج لوگوں کے سامنے تھا اور اس کا جو اثر نوجوان تعلیم یافتاؤں پر پڑ رہا تھا وہ بھی پوشیدہ نہ تھا جس سے فوراً یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ مغربی تعلیم کی بدولت ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ باشندوں کا مذہب بھی خطرہ میں ہے، مسلمانوں کو انگریزوں سے سیاسی پرخاش تو تھی ہی مگر ایک قدیم مذہبی پرخاش بھی تھی جسے اس زمانہ میں خاص طور پر اہمیت دیدی گئی اور سیاسی شکایات کو زبان سے نکالنے کے بجائے یہ بتایا گیا کہ اسلام خطرہ میں ہے جو ایک حد تک واقعہ بھی تھا۔

نئی وردیوں کا رواج، کارتوسوں میں چربی کا استعمال ہندوؤں کی مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے والی چیزیں تھیں، ساتھ ہی ہندوستانی اقوام کے عقائد اور مذہبی و معاشرتی رسوم سے حکومت کی بے اعتنائی یہ ظاہر کررہی تھی کہ حکومت ان کے مذہب کے خلاف ہے، اتفاق سے لیڈی کیننگ کو دین مسیحی کی تبلیغ سے خاص دلچسپی تھی، اس کا اثر بھی لوگوں پر بہت ہوا۔ اسی طرح ۱۸۵۶ء کے قوانین سے بھی یہ واضح ہوتا تھا کہ حکومت کو اپنے اغراض کے سامنے مذہبی پابندیوں کا کوئی لحاظ نہیں ہے، نیز یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اسی وجہ سے فوج میں کمتر ذات کے ہندو زیادہ بھرتی کئے جارہے ہیں

اس زمانہ کے تاریخی روزنامچے مظہر ہیں کہ دارالعوام میں ہندوستان کے متعلق جو یادداشتیں پیش کی گئی انہیں تمدنی اختلاف کی بنار پر ایک زبردست تصادم کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے۔

غرض انیسویں صدی کے وسط میں سیاسی، مذہبی اور تمدنی یا سماجی تمام وجوہ میں ایک ساتھ شدت پیدا ہوئی، یہ وجوہ کمپنی کے ابتدائی دور سے ہی موجود تھے لیکن کمپنی کی پالیسی نے ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ناقابل برداشت بنا دیا۔

فوجی اسباب جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے خاص طور سے شورش کا سبب نہیں بنے بلکہ ممکن ہے فوری سبب فوج ——— ہو لیکن ان کی بڑی اہمیت میرٹھ کے فساد کے بعد سے شروع ہوئی، عام طور سے کمپنی کا یہ اصول رہا تھا کہ دیسی اور یوروپی افواج میں ایک خاص توازن قائم رکھا جاتا تھا، عموماً یوروپی افواج دیسی افواج کا ایک ثلث ہوا کرتی تھیں مگر جنگ کریمیا کے سلسلہ میں بہت سی انگریزی رجمنٹیں مع چند دیسی فوجوں کے ہندوستان سے بلالی گئی تھیں، لارڈ ڈلہوزی نے مخالفت کی بھی مگر کوئی اثر نہ ہوا، اس کے بعد ہی ایران سے جنگ کے سلسلہ میں بمبئی کی حکومت نے چار انگریزی اور دو دیسی دستے روانہ کیے، حکومت انگلستان کو اس بارے میں کئی دفعہ توجہ دلائی گئی کہ نہ صرف آیندہ کے لئے بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی یہ اقدام خطرناک ہے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی، اس وقت تقریباً ہر شخص کو یہ معلوم تھا کہ انگریزی افواج بہت کم کردی جاچکی ہیں اور ہندوستانی فوجوں میں یہ خیال عام تھا کہ چونکہ کمپنی کی حکومت ان پر انہی کے ذریعہ سے ہو رہی ہے اسلئے ملک کا اصلی اقتدار انہی کے ہاتھ میں ہے، اور اس احساس نے ان کو یہ موقع دیا کہ اپنی شکایات کو خود رفع کریں، عام باشندوں کی طرح فوجی سپاہی بھی انہی مشترکہ وجوہ کی بنار پر حکومت سے ناراض تھے مگر چونکہ یہ نہایت منظم، مسلح اور طاقتور جماعت تھی، اس لئے عوام کے خلفشار سے کہیں زیادہ ان کا احتجاج کارگر ثابت ہوا۔

سب سے پہلے حکومت کمپنی کے خلاف فوجی اقدام بنگال کی دیسی افواج سے شروع ہوا۔ اس فوج میں زیادہ تر اعلیٰ ذات کے ہندو اور راجپوت تھے اور تقریباً چالیس ہزار اودھ کے آئے ہوئے سپاہی تھے جن کو چند خاص مراعات حاصل تھیں، مثلاً ان کے لئے علیحدہ عدالت تھی مگر جب صوبہ اودھ کا بالکلیہ الحاق کر لیا گیا تو ان مراعات کو بھی ختم کر دیا گیا اور اودھ کی افواج اور دیگر افواج میں کوئی تفریق باقی نہیں رہی، حالانکہ اودھ کی افواج کو جو مراعات حاصل تھیں وہ بر بنار معاہدہ تھیں اور ان کی خدمات کا معاوضہ، ان کو الحاق اودھ سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا، اس ناانصافی سے فوج میں برہمی کے آثار نمودار ہوئے، ان فوجوں پر بیرون ہند جانے کی شرط عائد نہ ہوتی تھی چنانچہ جنگ برما میں سمندر پار جانے سے

ان افواج نے صاف انکار کردیا تھا، اور جب ۱۸۵۶ء میں "جنرل انلسٹمنٹ ایکٹ" کا نفاذ ہوا تو فوجوں میں حکومت کے خلاف جذبات اور بھی مشتعل ہوئے اور چونکہ یہ معلوم تھا کہ یوروپی سپاہ برائے نام ہے لہٰذا سازشوں کی گرم بازاری شروع ہوئی، شروع میں بیرام پور اور بیرک پور خاص مرکز تھے، وہاں سے ایک فوجی دستہ مرشد آباد بھیجا گیا جس نے مرشد آباد کی چھاؤنی کی فضا کو بھی مسموم کردیا، انہی فوجوں میں کا ایک دستہ میرٹھ بھی آیا تھا اور میرٹھ کی فوجیں جو پہلے ہی سے موقعہ کی منتظر تھیں ان خیالات کی ہمنوائی میں سب سے نمبر لیگئیں۔

رفیق الدین احمد
بی۔ اے (عثمانیہ)

سلطنت برطانیہ اور دیسی ریاستوں کے معاہداتی تعلقات

ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیسی ریاستوں سے معاہدات کرنے کا حق اسے چارلس دوم کے زمانہ میں بذریعہ منشور عطا ہوا شروع شروع کے معاہدات تو بالکل تاجرانہ نوعیت کے تھے۔ کیونکہ کمپنی آخر ایک تاجروں کی جماعت متحدہ تھی اُسے اپنا تجارتی اقتدار قائم کرنا تھا۔ اس لئے کمپنی ان معاہدات کے ذریعہ اپنی بنیادیں مضبوط کر رہی تھی۔ اندرونی استحکام کے لئے یہ ضروری تھا کہ آس پاس کی ریاستوں سے تجارتی معاہدات کئے جائیں۔ جب کمپنی کی بنیادیں ہندوستان میں مضبوط ہوگئیں تو اس نے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینے کے لئے قدم بڑھانا شروع کیا۔ سیاسی نوعیت کا پہلا معاہدہ وہ تھا جو ہماری ریاست ابدمدت سے ۱۷۵۹ء میں ہوا۔

اس مضمون میں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کمپنی نے دیسی ریاستوں سے کیا کیا معاہدات کئے اور رفتہ رفتہ ان کی سپرٹ میں کیا کیا تغیرات ہوئے اور بحالت موجودہ ان کی کیا وقعت ہے؟ بہتر یہ ہوگا کہ چند معاہدات کو اور ان پر کس طرح عمل ہوا دیکھا جائے

(۱) پہلا معاہدہ سندھ کے مسلمان رؤسا کا ہے۔ اس معاہدہ کو پہلے دیکھنا اس لئے ضروری ہے کہ سندھ میں معاہدہ کے وقت انگریزوں کے قدم ابھی نہیں جمے تھے۔ وہ صرف چند تاجرانہ مراعات کے طالب تھے۔

معاہدہ ۱۸۳۲ء کے الفاظ یہ ہیں:۔

(۱) دوستی نسلاً بعد نسلاً قایم رہے گی۔

(۲) معاہدین اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی ریاست کو حریصانہ نظروں سے نہ دیکھیں گے۔

(۳) (۱) کوئی شخص سامان جنگ دریائے سندھ پر نہیں لے جائے گا۔

(۲) نہ کوئی مسلح کشتی اور نہ کوئی مسلح جہاز دریائے مذکور پر سے گذرے گا۔

(۳) کوئی انگریز تاجر سندھ میں اقامت نہ رکھے گا۔ صرف اپنی تاجرانہ ضرورتوں کے لئے چندے قیام کرکے واپس چلا جائے گا"

معاہدہ کے الفاظ سے اس اسپرٹ کا پتہ چلتا ہے کہ جس اسپرٹ میں وہ منعقد ہوا تھا۔ معاہدہ کے چار سال بعد تک معاہدہ کی پابندی ہوتی رہی اور اس کے بعد......

۱۸۰۹ء میں کمپنی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے معاہدہ حلیفی کیا۔ ۱۸۳۶ء میں رنجیت سنگھ شاہ شجاع کی مہم افغانستان میں مدد کر رہا تھا۔ کمپنی رنجیت سنگھ کی حلیف تھی۔ اس لئے اسے بھی ساتھ ہونا پڑا۔ افغانستان میں داخل ہونے کے لئے سندھ کا راستہ اختیار کرنا ضروری تھا۔ کمپنی معاہدہ ۱۸۳۲ء کی رو سے اس کی مجاز نہ تھی۔ آخر کار کمپنی نے حکمت عملی سے رنجیت سنگھ کو سندھ پر سے گذرنے سے باز رکھا۔ سندھی روسار کو اپنی بروقت مدد کا احسان جتایا اور اس کے بدلے اپنا ایک رزیڈنٹ سندھ میں متعین کرنے کے لئے نور محمد خاں کو مجبور کیا۔ اس کے دو سال بعد یہ مطالبہ کیا کہ معاہدہ ۱۸۳۲ء کی دفعہ (۳) کے فقرہ (۱) اور (۲) کو منسوخ کیا جائے۔ سندھی روسا نے اس پر احتجاج کیا۔ جس کے جواب میں لارڈ آکلینڈ نے اپنے رزیڈنٹ متعینہ سندھ کو لکھا کہ اگر سندھی روسار انکار کریں تو ان کو تخت سے اتار کر ایک قدیم خاندان کو تخت نشین کیا جائے۔ یا انھیں مجبور کیا جائے کہ وہ ہماری اطاعت قبول کرلیں" فوج کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ سندھ پر سے گذر کر افغانستان جائے۔ ناچار سندھی روسا نے فوج کو گذرنے دیا۔ اس مہم کا نتیجہ ہر ایک کو معلوم ہے۔ صرف ایک سپاہی افغانستان سے لوٹ کر آیا۔

(۲) مہاراجہ اندور سے جو معاہدہ ۱۸۱۸ء میں ہوا اس کی ایک دفعہ کے تحت اندور ریاست میں رزیڈنسی کو چار سو ایکڑ زمین دی گئی۔ انگریزوں کو جب ٹکنے کی جگہ مل گئی تو پاؤں پھیلانا شروع کیا۔ ۱۸۶۵ء تک انھوں نے سات سو چونتیس ایکڑ پر قبضہ مخالفانہ جما لیا۔ اسی پر اکتفا مناسب نہ سمجھ کر اور زمین کے لئے مطالبہ کیا۔ سرمادھوراؤ وزیر اعظم اندور نے صوبہ متوسط کے گورنر کو لکھا کہ:۔

"حسب معاہدہ رزیڈنسی کی عمارتوں کے لئے جگہ دے دی گئی مکانات تعمیر ہوگئے۔ عملہ کی زیادتی کے ساتھ ساتھ مکانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ قانون بین الممالک کے تحت رزیڈنٹ نے مہاراجہ سے مراعات خصوصی بھی حاصل کرلیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس سپرد کردہ علاقہ میں رزیڈنٹ کے عملہ کے علاوہ ریاست کے باشندوں کو رہنے کی اجازت دی جارہی ہے۔ اور اُن کو بھی مراعات خصوصی سے مستفید کیا جارہا ہے۔ مراعات خصوصی صرف رزیڈنٹ اور ان کے عملہ کے لئے ہیں نہ کہ رعایائے ریاست کے لئے۔ علاوہ ازیں ایسی رعایا کو جو سپرد کردہ علاقہ میں آباد ہے۔ بغیر کسی معاہدہ کے ملکی قانون کے اختیار سماعت سے بھی مستثنٰی کردیا گیا ہے۔ اس عمل کی وجہ سے جو نقصان ریاست کا ہورہا ہے اس کا اندازہ اس مثال سے اچھی طرح واضح ہوگا۔ لندن میں اگر کوئی جرمن سفیر اپنے حدود سفارت خانہ میں انگریزی رعایا کو بسائے۔ اختیار سماعت و ملکی محصولات سے مستثنٰی کردے اور اس حصہ آبادی میں شہر لندن کے دوسرے حصوں سے لوگ آآکر بسنے لگیں۔ تو ایک طرف تو اس حصہ شہر میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جائے گی اور دوسری طرف لندن کے دوسرے محلے ویران ہوتے جائیں گے۔ یہی حال اس وقت اندور کا ہے۔ رزیڈنٹ کا یہ عمل قانون بین الممالک اور معاہدات کے مغائر ہے"

گورنر نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

(۳) ۱۸۱۸ء میں ریاست بیکانیر سے ایک دوامی دوستی کا معاہدہ ہوا جس کا ایک جملہ یہ ہے۔

"مہاراجہ۔ اُن کے وارث اپنے ملک کے حکمراں ہوں گے۔ اور برطانوی اثرات ان کے ملک میں داخل نہ کئے جائیں گے۔

۱۸۱۸ء کے معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد بیکانیر میں ایجنسی کا قیام عمل میں آیا۔ ایجنسی نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ شاہی دارالضرب کو بند کردیا۔ ۱۸۹۸ء میں زمانہ نابالغی ختم ہونے پر نئے مہاراج کو مندرجہ ذیل شرایط کے ساتھ تخت نشین کرایا گیا۔

(۱) کہ ایجنسی کی کوئی اصلاح منسوخ نہ کی جائے۔

(۲) ہر اہم معاملہ میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی رائے حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۳) کسی صورت میں بھی مہاراج بیکانیر پولیٹیکل ایجنٹ کی رائے کی مخالفت نہیں کرسکتے۔

معاہدہ ۱۸۱۸ء کے فقرہ مذکور دیکھیے۔ اس کے بعد مہاراج کے اختیارات پر یہ تحدیدات کمپنی کا مقصد یہ رہا ہے کہ ہندوستانیوں کو مسلح نہ ہونے دو۔ اس لئے ہر ریاست کے معاہدات میں تحدید اسلحہ کا بھی ذکر ہوتا رہا ہے۔ اس تحدید کے بعد جس قسم کے اسلحہ ہندوستان میں درآمد ہوتے تھے ان کا حال ذیل کی مثال سے واضح ہوگا۔

مثل دیگر ریاستوں کے ریاست نوانگر میں درآمد اسلحہ کے لئے رزیڈنسی سے "اجازت نامہ" لینا ضروری ہے چاہے ریاست خود سرکاری اغراض کے لئے اسلحہ منگوائے یا کسی فرد رعایا کے لئے۔ ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے کہ نوانگر کی پولس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ پر حملہ کیا۔ پولس کو حفاظت خود اختیاری میں ایک باڑ چلانا پڑی۔ جس کا نتیجہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ نو پولس کے سپاہی زخمی ہوئے وہ کیسے؟ بندوقوں کی نالیاں پھٹ گئیں۔ منجملہ نو زخمیوں کے دو تو اسی وقت مر گئے۔ دو کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تاکہ وہ بچ جائیں۔ پانچ کے سر میں چوٹیں آئیں —— جس کی وجہ سے وہ ناقابل ملازمت ہوگئے۔ آج سے ۲۰ سال قبل برطانیہ کی یہ پالیسی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کو سولھویں صدی کی بنی ہوئی بندوقیں رکھنے دیتی تھی تاکہ ہندوستانی اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈریں کہ کہیں نال نہ پھٹ جائے۔

آخر میں خود ہماری ریاست ابد مدت کے متعلق جو کچھ عمل رہا ہے اس کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے "Our relations with the premier Mohammedan States have rarely been fortunate."

۱۷۹۸ء میں پچاس ہزار پونڈ سالانہ کے عوض کمپنی کو شمالی سرکار میں اپنی فوج رکھنے کا اختیار دیا گیا۔ اس فوج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت آصفیہ کی وقت ضرورت مدد کرے گی۔ اس کی توثیق ۱۸۰۰ء میں ہوئی اور ایک نیا معاہدہ ہوا جس کے تحت ایک معاونتی فوج (Subsidiary force) کا قیام ریاست کے حدود میں عمل میں آیا۔ ریاست میں ایک حیدرآبادی فوج بھی تھی جس کا نام "حیدرآباد کنٹنجنٹ" تھا بعد میں یہی نام معاونتی فوج (Subsidiary force) فوج کو بھی دیا گیا۔ مگر خصوصیت کے ساتھ حیدرآبادی فوج کو کنٹنجنٹ کہا جاتا تھا اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

معاونتی فوج (Subsidiary force) کے اخراجات کے متعلق نواب نظام علی خاں نے ۱۸۰۰ء میں وہ تمام علاقے کمپنی کے سپرد کر دئے جو معاہدہ سرنگاپٹم اور میسور کے تحت حیدرآباد کو حاصل ہوئے تھے۔

اس معاہدہ کے تحت کمپنی نے اقرار کیا کہ

"معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اپنی حد تک بذریعہ ہذا اعلان کرتی ہے کہ اسے ہز ہائنس کے بچوں، رشتہ داروں، رعایا ملازمین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی حد تک ہز ہائنس مختار مطلق ہیں۔"[۵]

---

۵ Aitchison's Sunads and Treaties Vol 5

اور اسی معاہدہ کی دفعہ ۱۷ کے تحت کمپنی نے حلیفی کا اقرار کیا تھا۔

۱۸۰۳ء میں نواب نظام علی خاں کا انتقال ہوگیا۔ اور نواب سکندر جاہ تخت نشین ہوئے۔ اس وقت انگریزوں نے معاہدہ ۱۸۰۰ء کی دفعہ ۱۵ کے خلاف ریاست کے وزیر اعظم کے انتخاب میں دخل دیا۔ یا بقول کمپنی کے "نظام کو مشورہ دیا"۔ میر عالم وزیر اعظم ہوئے ۱۸۰۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ "مشورہ" کے خلاف نواب سکندر جاہ نے منیر الملک کو وزیر اعظم مقرر فرمایا کمپنی نے راجہ چندو لعل کا نام پیش کیا تھا۔ نواب سکندر جاہ نے مجبوراً راجہ چندو لعل کو نائب وزیر اعظم مقرر فرمایا۔ تمام امور سلطنت راجہ چندو لعل انجام دیتے تھے اور منیر الملک برائے نام وزیر اعظم تھے ۱۸۰۹ء سے ۱۸۴۳ء تک دو مرتبہ کمپنی نے اندرونی معاملات میں دخل دیکر ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

کمپنی حسب معاہدہ آٹھ ہزار پیدل اور ایک ہزار سوار ریاست میں رکھنے پر مجبور تھی۔ جب غدر جالنہ میں دیسی فوج کی مدد سے انگریزی فوج نے بغاوت کو فرو کر دیا تو اخراجات کی کمی کی خاطر معاونتی فوج (Subsidiary force) میں کمی کی گئی یعنی صرف دو ہزار پیدل رکھے گئے۔ تخفیف کے بعد زائد رقم حسب معاہدہ ریاست کو واپس ملنا تھی وہ بھی نہیں ادا کی گئی یعنی دو مرتبہ نقض معاہدہ ہوا۔ ایک تو فوج میں کمی کرنے سے اور دوسرے زائد رقم واپس نہ کرنے سے۔

۱۸۱۲ء میں حیدرآبادی فوج یعنی کنٹنجنٹ نے بقایا تنخواہ کی وجہ سے بغاوت کر دی۔ راجہ چندو لعل نے بغاوت تو فرو کر دی۔ مگر اس فوج میں سے باغی سپاہیوں کو نکال کر ایک نئی فوج بھرتی کی اور اس کا نام حیدرآباد کنٹنجنٹ رکھا یعنی اُس وقت ریاست میں تین فوجیں تھیں:۔

(۱) دیسی فوج جس کو کنٹنجنٹ کہتے (۲) معاونتی فوج (Subsidiary) (۳) حیدرآباد کنٹنجنٹ۔ موخر الذکر کو راجہ چندو لعل نے اپنے احکام سے رزیڈنسی کے تحت کر دیا۔ اور رزیڈنٹ کے نام سے اُس فوج کو منسوب کرکے رسل بریگیڈ (Russels Brigade) اُس کا نام رکھا۔ اِس فوج کے تمام اخراجات جو چار لاکھ پونڈ تھے حیدرآباد کے خزانہ سے ادا کئے جاتے تھے۔ اس فوج کا قیام بغیر کسی معاہدہ کے ہوا تھا۔ کہنے کو تو وہ ریاست کی فوج تھی مگر اس کی کمان رزیڈنسی کے ہاتھ تھی۔ معاونتی فوج (Subsidiary force) تو انگریزوں کی تھی ہی۔ اس کے اخراجات کا انتظام سپرد کردہ علاقہ جات سے ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ تک ریاست رسل بریگیڈ کے اخراجات ادا نہ کر سکی جس کی وجہ سے ریاست رزیڈنسی کی مقروض ہوگئی راجہ چندو لعل نے پامر کمپنی (Palmer & Co) سے ۲۵ فیصدی شرح سود پر قرض لے کر یہ قرضہ ادا کیا۔

کمپنی نے پچاس ہزار پونڈ سالانہ جو معاہدہ ۱۷۹۸ء کے تحت اس کو حیدرآباد کو ادا کرنے تھے شاید دو ہی ایک مرتبہ ادا کئے ہوں گے ورنہ وہ ہمیشہ وصول طلب ہی رہے۔ ریاست نے حساب دوستاں دردل پر عمل کرکے کبھی حساب فہمی بھی نہیں کی دوسری طرف کمپنی ریاست سے ایک ایک پائی وصول کرلیتی تھی۔ اگر حساب کیا جائے تو حیدرآباد پر ایک پائی بھی کمپنی کی باقی نہ نکلتی کیونکہ وہ پچاس ہزار پونڈ سالانہ جو حیدرآباد کو وصول طلب تھے وہی رسل برگیڈ کے اخراجات میں مجرا کئے جا سکتے تھے۔

۱۸۲۹ء میں ناصرالدولہ تخت نشین ہوئے۔ حالات زمانہ سے کمپنی کو خوف ہوا کہ کہیں رسل برگیڈ تخفیف نہ کردی جائے ایک مفت کی فوج ہاتھ سے جائے۔ یہ سوچ کر کمپنی نے گذارش کی تخفیف کے بعد ۲ لاکھ پونڈ سالانہ کمپنی کو وصول طلب رہیں گے۔ نواب ناصرالدولہ نے ۲ لاکھ پونڈ سالانہ دینے سے انکار کیا۔ اور کنٹنجنٹ علی حالہ برقرار رہی۔ اس عمل کو کمپنی نے رسل برگیڈ کے قیام کی توثیق سمجھا۔ یعنی جو فوج بغیر کسی معاہدہ کے قائم ہوئی تھی نواب ناصرالدولہ کے اس عمل سے ان کا قیام قانوناً جائز ہوگیا۔ ۱۸۵۳ء میں کمپنی بہادر نے ۴۳ لاکھ روپیہ رسل برگیڈ کے اخراجات کے متعلق واجب الوصول قرار دیا اور کہا کہ برار کا صوبہ کنٹنجنٹ کے اخراجات کی پابجائی کے لئے دیا جائے۔ نہ صرف یہ مطالبہ کیا گیا بلکہ یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر مطالبات پورے نہ کئے جائیں گے تو حیدرآباد پر حملہ کیا جائے گا۔

دابِ ناجائز سے مجبور ہوکر برار کا انتظام عارضی طور پر اس شرط کے ساتھ کمپنی کے حوالہ کیا گیا کہ اخراجات کی پابجائی کے بعد جو کچھ بچے وہ حیدرآباد کو واپس کیا جائے۔ حیدرآباد کنٹنجنٹ یا رسل برگیڈ ایک غیر قانونی فوج تھی جو ہمارے حکام کی عدم توجہی کی وجہ سے کمپنی کے قبضہ میں چلی گئی جن کی وجہ سے نہ صرف فوج بلکہ ریاست کو برار سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

اس وقت تک تو ہم نے دیسی ریاستوں کے معاہدات اور کمپنی کے نقض معاہدات کی تفصیل دیکھی اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باوجود ملکہ معظمہ۔ ایڈورڈ ہفتم جارج پنجم کے مندرجہ ذیل اعلانات کے محکمۂ سیاسیات کا یہ طریق عمل کیوں رہا؟

ملکہ معظمہ نے ۱۸۵۸ء میں اعلان کیا کہ۔

"ہم دیسی رؤسا کی عزت حقوق اور وقار کی مثل اپنے عزت کریں گے۔"

۱۹۰۳ء میں ایڈورڈ ہفتم نے اعلان کیا کہ:۔

"رؤسا اور دیسی حکمرانوں کے حقوق اور وقار کا احترام کیا جائے گا اور اس کی حفاظت کی جائے گی اور اس کو

حسب سابق برقرار رکھا جائے گا کیونکہ ان کی دوستی اور وفاداری ہمیشہ استوار رہی ہے"

جارج پنجم نے دربار دہلی میں دیسی رؤسا کو مخاطب کرتے ہوئے ۱۹۱۱ء میں فرمایا :-

" میں ذاتی طور پر ان تیقنات کی تجدید کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں جو آپ لوگوں کے اقتدار اور حقوق کی حفاظت کے لئے میرے پیشروؤں نے آپ کو دلائے ہیں "

اِس اعلان کی توثیق ۱۹۱۹ء ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ غرض ہر نیا بادشاہ ہر اہم موقع پر بطور رواج ایک اعلان کرتا یا اپنے پیشرو کے اعلان کی توثیق کرتا۔

محکمہ سیاسیات کی پالسی کا دار و مدار مندرجہ ذیل حالات پر ہے۔

غدر تک تو ہندوستان کی حکومت کمپنی کے ہاتھوں میں تھی۔ غدر کے بعد معاہدات کی نگرانی کا کام محکمہ سیاسیات کے سپرد ہوا یہ محکمہ بحیثیت اقتدار اعلیٰ کام کرتا رہا۔ پارلیمنٹ کو محکمہ پر سوالات کرنے کا موقعہ نہ تھا جنگ عظیم کے بعد سے محکمہ سیاسیات کو اپنی پالسی میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑی اور اس پالسی کی تبدیلی کی وجہ سے ایوان روساء (Chamber of Princess) کا عمل ممکن ہوا کیونکہ جنگ عظیم سے پہلے یہ پالسی تھی کہ ایک ریاست کے دوسری ریاست سے تعلقات ہی نہ قائم ہوں۔ ممکن ہے کہ معاہدہ شکنی کی صورت میں تمام ریاستیں متحد ہو کر علم بغاوت بلند کر دیں۔ ایوان روساء کے قیام سے صرف اتنا ہوا کہ والیان ریاست آپس میں ہنس بول لیتے ہیں۔ ایوان روساء کی تمام کارروائیاں محکمہ سیاسیات کے تحت ہیں۔ ایوان کے ممبروں کو اتنی بھی آزادی کلام حاصل نہیں جتنی کہ ہماری "انجمن اتحاد" کے ممبروں کو ہے ۱۹۲۲ء میں روساء نے اپنی قانونی حیثیت کے متعلق مشورہ لینا چاہا تو محکمہ سیاسیات نے اس کی اجازت نہ دی۔

جب کمپنی نے اولاً معاہدات کئے تو روساء کی حیثیت کے لحاظ سے معاہدات ہوتے تھے۔ اور اسی لحاظ سے معاہدہ میں تخاطب ہوتا تھا مثلاً بعض سے برابری کا عمل ہوتا اور بعض سے کمتری۔ بمقدمہ نواب آف کرناٹک بنام ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۷۹۲ - ۲ - ویسی جنس رپورٹس، طے کیا گیا کہ کمپنی کی حیثیت برابری کی ہے ۱۸۲۶ء تک نظام حیدرآباد سے جو سرکاری مراسلت ہوئی اس میں گورنر جنرل "نیاز مند" لکھتا اور نظام الملک "بادولت"۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور قوت میں ترقی ہوتی گئی ویسے ویسے طرز تخاطب بدلنے لگا اور معاہدات کی پابندی غیر ضروری سمجھی جانے لگی۔ ایک زمانہ وہ آیا کہ ان معاہدات کو ردی کاغذ کے پرزے[1] سمجھا جانے لگا کمپنی کے ایجنٹ اور رزیڈنٹوں کو حکومت کی خواہش تھی۔ اسی خواہش کے تحت

[1] دیکھیے "Scraps of Paper" by Nicholson

وہ دیسی ریاستوں کے معلات میں اپنی فوج کے زور پر دخیل ہوتے تھے۔ اور یہ دخل درمعقولات دوسرے رزیڈنٹ کے لئے نظیر ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تمام نظائر ایک نظائری قانون کی شکل میں مدون ہوگئے جس وقت ہندوستان کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر برطانیہ کے تحت آیا۔ اس وقت یہ نظائری قانون موجود تھے یہ قانون سرچارلس لیوس ٹوپر کا مدونہ ہے۔ اس قانون کا کچھ حصہ بصیغہ راز محفوظ ہے۔ اُس حصہ میں رزیڈنٹوں اور گورنر جنرل کے لئے ہدائتیں ہیں کہ ان کو رؤسا کے ساتھ کیسا برتاؤ رکھنا چاہیے۔ ۱۹۲۲ء میں ایوان رؤسا نے اس قانون کو دیکھنے کی خواہش کی تو انڈیا آفس نے انکار کر دیا۔

ہندوستان کی حکومت حاصل ہونے کے بعد یہ ادعا کیا گیا کہ (۱) دیسی ریاستیں چونکہ حکومت ہند کی ماتحت ہیں اور حکومت ہند برطانوی پارلیمنٹ کے۔ اس لئے برطانیہ کو اقتدار برتر (Paramountcy) حاصل ہے جب دیسی ریاستیں اس نظریہ پر اعتراض کرتی ہیں تو اُن کو مقدمات سکریٹری آف اسٹیٹ ان کونسل بنام کماچی بائی ۱۳ مور ما پریوی کونسل کیس ۲۲۔ اور سکریٹری آف اسٹیٹ ان کونسل بنام سلامن۔ ۱۹۰۶۔ ا۔ک ب ۶۱۳ کا حوالہ دے کر اقتدار برتر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ فعل مصلحت کی وجہ سے ہوا۔ اس پر نہ تو ہند کی کسی عدالت کو اور نہ برطانیہ کی کسی عدالت کو اختیار سماعت ہے۔ ابھی تک تو یہ نظریہ یک طرفہ ہے کسی دیسی ریاست نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔

۲۔ دیسی رؤسا حکومت ہند کے کارندے ہیں یا موروثی عہدہ داران کہ جن کو تاج برطانیہ نے اپنی سلطنت کے کچھ حصے انتظاماً سپرد کئے ہیں۔

محکمہ سیاسیات نے ۱۹۱۳ء میں سرچارلس لیوس ٹوپر سے "Our Indian protectorate" نامی کتاب نظریہ اقتدار برتر کے پرچار کے لئے لکھوائی جب اس کی اشاعت پر بہت لے دے ہوئی تو ڈیلیم لی وارنر سے ایک اور کتاب (Protected Princess of India) لکھوائی گئی۔ اس میں بھی ۱۹۱۰ء میں ترمیم کی گئی اس کے بعد اسے (The native states of India) کا نام دیا گیا۔ اگرچہ اس کتاب میں نظریہ اقتدار برتر کا اس قدر پرچار تو نہیں ہے جتنا کہ اول الذکر دو کتابوں میں مگر پھر بھی دبی زبان سے کئی جگہ کہا گیا کہ

"The Paramount power has the right to assert their jurisdiction to a greater or less extent"

محکمۂ سیاسیات نے یہ کتابیں عوام کے لئے لکھوائیں ہیں۔ مگر اپنے رزیڈنٹوں کو اس کی ہدایت کر دی ہے کہ وہ مارس ٹوپر کی "راز" کی ہدایتوں پر عمل کریں۔

قانون جس کے تحت ریاستوں اور اقتدار اعلیٰ یعنی تاج کا تعلق منضبط کیا جاتا ہے ایک عجیب نظام قانون ہے۔ کیونکہ اس قانون دستوری کی مثال کسی دوسرے ملک کے قانون دستوری میں نہیں ملتی ہے۔ یہ قانون خود رد طریقہ سے کمپنی بہادر کے طریق کار (Usage) سے پیدا ہوا۔ دیسی ریاستیں معاہدات سے بڑھ کر طریق کار (Usage) کی پابند سمجھی گئی ہیں۔ لارڈ کرزن دیسی ریاستوں کو برطانوی شہنشاہیت کا ستون سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے دیسی رؤسا سے کبھی بھی ان کے حقوق کے متعلق کچھ نہ کہا بلکہ اُن کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کرتے رہے۔

نظریہ اقتدار برتر کو لارڈ ریڈنگ نے اپنے خط موسومہ حضور نظام میں بہت اچھی طرح واضح کیا ہے[۱] اور اسی اقتدار برتر کے نظریہ کے تحت ریاستوں کے معاملات میں صریحی طور پر دخل دیا جاتا رہا ہے کبھی تو ضرورت اور مصلحت اور کبھی تمام ہند کے مفاد کو وجہ موجبہ بنایا گیا۔ اور جب صریحی طور سے دخل دینا وقت کے لحاظ سے مناسب نہ تھا تو مشورہ کے نام ہدایت کی گئی۔ جیسا کہ نواب سکندر جاہ کو وزیر اعظم کے تقرر کے وقت مشورہ دیا گیا تھا۔

لفظ مشورہ کے معنی جو محکمہ سیاسیات سمجھتا ہے وہ ذیل کے خطات واضح ہوں گے۔ یہ خط مہاراجہ ریوا کو ان کے پولیٹکل ایجنٹ نے لکھا تھا۔

——"ہز ایکسیلنسی وائسرائے بہادر نے کہا کہ جب وائسرائے بذات خود کسی دیسی رئیس کو مشورہ دے تو دیسی رئیس کے لئے یہ غیر دانشمندانہ اور غیر صحیح فعل ہوگا کہ اس مشورہ پر عمل نہ کرے۔ کبھی بھی اُن کو نہ تو حکم دیا جائے گا اور نہ سرکاری طور سے استدعا کی جائے گی۔——"

اقتدار برتر کے نظریہ کی اشاعت کی کوشش میں الفاظ کو اس قدر تبدیل کر دیا گیا ہے کہ اُن کے معنی میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہے مثلاً تخت نشینی کے بجائے گدی نشینی۔ کامل اختیار حکومت (Full reigning powers) کو بدل کر کامل اختیار (Full Powers) کر دیا ہے۔ (ان الفاظ کی تبدیلی سے جو معنی میں تغیر ہوا اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے)

محکمہ سیاسیات کی اس پالیسی کی روح رواں یہ ہے کہ کمپنی یا حکومت برطانیہ کے مقررہ کردہ حکام نے حکومت کی خواہش

---

[۱] دیکھئے India's new Constitutions by Eddy & Lawton Page 20

اور اپنے نام کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ برطانیہ کا فائدہ رہے۔ اسی مطمح نظر کے تحت انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ اگر ان کا مطمح نظر یہ ہوتا تو آج ہندوستان کی سیاسیات ہی بالکل علحدہ ہوتی۔ اس کے برخلاف ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ برطانیہ کے مفاد کی خاطر ہم کو کیا کرنا چاہئے؟۔ اور اسی وجہ آج کلائیو کو ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا بانی وارن ہیسٹنگز کو معمار اور ڈلہوزی کو اسٹر کار کہا جاتا ہے۔

سر طامس منرو نے لکھا ہے کہ "ہم ہندوستانی روسا کو معاہدات میں خود مختار بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اس کے بعد اپنا ایک رزیڈنٹ ان کے یہاں متعین کرتے ہیں جو بجائے سفیر کے ایک آمر (dictator) کے فرائض انجام دیتا ہے —— ان کے خانگی معاملات میں دخیل اور متمردانہ اختیارات کا استعمال کرتا ہے۔"

ایڈورڈ ہفتم نے لکھا کہ

"مجھے جس بات سے بہت تعجب اور افسوس ہوا وہ پولیٹکل افسروں کا دیسی روساء کے ساتھ برتاؤ ہے میں اس پر متاسف ہوں اور کامل الیقین کرتا ہوں کہ یہ طریق کار بالکل غلط ہے۔"

مندرجہ بالا واقعات کے نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانیہ معاہدات کو ردی کاغذ کے پرزے سمجھتا ہے۔ کاش کہ برطانیہ کو یہ سمجھایا جا سکتا کہ جس طرح وہ "کاغذ کے پرزے" کے لئے ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم میں شریک ہو کر جرمنی سے معاہدہ درسائی کر دا سکتا ہے وہی حیثیت ان کاغذ کے پرزوں کی ہے —— مگر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سر مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیل رواں (اقبال)

محمد منظر الدین احمد انصاری . بی اے (علیگ)
متعلم ال ال بی (آخری)

دل

برستے ہیں جہاں جلوے خدا کے وہ صنم خانہ
چھلکتی ہے مئے کوثر جہاں وہ بزم رندانہ

کمندِ وہم ہستی ایک نقشہ جس کی الجھن کا
قیامت ایک ادنیٰ سا نمونہ جس کی دھڑکن کا

جگر کا خون پی پی کر جہاں ارمان پلتے ہیں
جہاں درد و الم ذوقِ محبت کو مسلتے ہیں

نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں نورانی نظاروں سے
جہاں حسن و محبت کھیلتے ہیں چاند تاروں سے

جسے کہتے ہیں دل جو ایک غیر آباد بستی ہے
وہ اک قطرہ لہو کا ہے مگر بنیادِ ہستی ہے

محمود علی، سال دوم

حیدرآباد میں اصلاحِ معاشرت کی کوششیں

سبزواری صاحب نہایت مشاق مضمون نگار ہیں ان کے اکثر مضامین مجلہ عثمانیہ اور ہندوستان کے دیگر وقیع رسالوں میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے مقالوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سبزواری صاحب کے قلم سے جو مضمون نکلتا ہے وہ علمی اور تحقیقی ہوتا ہے جامعہ عثمانیہ نے ایسے اچھے محقق اور بلند پایہ مضمون نگار کم پیدا کئے ہیں۔ —————— مدیر

دنیا کی سیاسی، معاشی دستوری اور ایماناتی تاریخ میں اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس دور کے دو اہم تغیرات جن کا اثر بنی نوع انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر پڑا صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس ہیں۔ صنعتی انقلاب حقیقتاً علوم فطری کی ترقی اور فنی ترقی کی وجہ سے نمودار ہوا۔ بھاپ کی ایجاد، اور اس کی وجہ سے دخانی مشین اور انجن کی ایجاد کے امکانات پیدا ہوئے۔ ریل اور دیگر ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے سیر و سفر، حمل و نقل اور تجارت میں ترقی ہوئی۔ مختصر یہ ہے کہ قدرت پر انسان کی فتوحات کا آغاز ہوا اور معاشی زندگی میں اہم تبدیلیاں نمایاں ہونے لگیں

سرمایہ داری کے طریق کو تقویت ہوئی۔ پیدائش بر پیمانہ کبیر کا آغاز ہوا، مانگ سے زیادہ مال تیار ہونے لگا۔ پیدائش دولت سے زیادہ اہمیت دولت کی تقسیم کو حاصل ہوئی۔ آبادی دیہات سے قصبات کی طرف منتقل ہونے لگی، چھوٹے چھوٹے قصبوں نے اہمیت حاصل کرنا شروع کی۔ کارخانوں کے قیام، تقسیم عمل کے امکانات، مکانات کی قلت، آبادی کی کثرت اور صحت پر اس کے مضر اثرات، تعلیم اور اسی قسم کے دوسرے پیچیدہ مسائل پیدا ہونے لگے دوسری طرف نشاط ثانیہ کا نتیجہ آغاز امریکہ کی آزادی اور انقلاب فرانس کی صورت میں نمودار ہوا۔ امریکہ اور فرانس کا اقوام عالم پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے حقوق انسانیت کے حاصل کرنے میں دنیا کی رہنمائی کی۔ مختلف طبقوں اور بالخصوص محکوم اور ادنیٰ طبقوں کو حقوق عطا کئے گئے۔ ان کے حقوق کی نگہداشت کی جانے لگی۔ اور مختصر یہ کہ سرکاری نظم و نسق میں ان کی مداخلت کے حق کو باضابطہ طور پر تسلیم کرلیا گیا۔

قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے بعد تک یہی خیال عام تھا کہ حکومت کا کام اپنی رعایا کے جان و مال کی غیر اقوام کے حملوں سے حفاظت اور اپنی عملداری میں امن و امان قائم رکھنا تھا ایک اور خیال جو بعد میں تقویت پاتے پاتے حکومت کے فرائض میں داخل ہوگیا ہے کہ محض اندرونی اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا حکومت کے وجود کا صحیح نصب العین نہیں ہوسکتا۔ اس کا حقیقی منشا یہ ہے کہ وہ ملک کے اندر ایسے حالات پیدا کرے کہ باشندوں کی مرفعہ الحالی میں اضافہ ہو، علوم و فنون کی ترقی ہو، رعایا کی جسمانی صحت کا معیار بلند ہو ایسے انتظامات کرے جن کی بدولت باشندوں کو کھانے کے لئے صحت بخش غذا، پہننے کے لئے عمدہ کپڑا، رہنے کے لئے ہوادار مکان میسر ہو، ملک میں وباؤں اور بیماریوں کی کمی ہوجائے، اور جو باقی بھی رہ جائیں ان کے علاج کے بہترین ذرائع مہیا ہوں۔ سماجی بندشیں یا رسوم و رواج افراد کو جانی و مالی نقصانات نہ پہونچا سکیں۔ اگرچہ ابتدا میں اس اصول کو باضابطہ طور پر تسلیم نہ کیا گیا تھا مگر اس زمانہ میں بھی بہت سی باتوں پر عمل ہوتا تھا۔ مثلاً فوجی سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر، سپاہیوں کی بیواؤں اور یتیموں کی امداد، قحط اور مصیبتوں کے زمانہ میں سرکاری امداد، علوم و فنون کی سرپرستی بالخصوص درباری شعرا کی قدر و منزلت، وغیرہ وغیرہ۔ دربار صناعوں کی بھی سرپرستی کرتے تھے۔ عبادت گاہوں، مدرسوں، خانقاہوں پاٹھ شالوں کی امداد کے لئے جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ گو حکومت معاشی اور سماجی معاملات میں دخل نہ دیتی تھی مگر ہر ملک اور ہر دور میں ایسے روشن خیال، ہمدرد خلائق، فرض شناس، عالی دماغ، دیانت دار حاکم گذرے ہیں

جنکی توجہ اس طرف بھی رہتی تھی۔ (Garratt) اور (Edward) نامی مورخین اپنی کتاب
Moghul rule in India مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۳۱ پر اکبر اعظم کی اصلاحی تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے
لکھتے ہیں کہ "گو اکبر کو ہندؤں اور راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملانے کی دھن تھی مگر اس اصول کے تحت اس نے بنی نوع
انسان کی ہمدردی کو فراموش نہ کیا۔ دختر کشی کی ممانعت کی، لڑکے اور لڑکی کی بلا رضامندی کی شادیوں کو ناجائز
ٹھہرایا۔ بیواؤں کے دوبارہ عقد پر زور دیا۔ اور ستی کی رسم کو بند کرنے کی کوشش کی" مگر اس قسم کی مثالیں
مستثنیاتی صورتوں میں داخل ہیں اور چونکہ یہ اصلاحیں شخصی ہوتی تھیں اس لئے ان میں استحکام اور دیرپائی موجود نہ
ہوتی تھی۔ مگر گذشتہ صدی میں دنیا نے اس اصول کو تسلیم کیا کہ حکومت کو معاشی اور سماجی معاملات میں بھی دخل
دینا چاہئے اور اس کے بعد سے رفتہ رفتہ عدم مداخلت کی پالیسی کمزور ہوتی گئی اور سماجی اور معاشی معاملات میں
حکومت کا عمل دخل بڑھتا گیا۔

حیدرآباد کے دور جدید میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے ہر شعبہ اور ہر سررشتہ میں تبدیلیاں نظر آتی ہیں
اگر ایک طرف زراعت کی ترقی کے لئے محکمہ زراعت، زرعی مزرعے اور عظیم الشان بند تیار کئے گئے تو دوسری طرف
عوام کی ذہنی اور دماغی ترقی کے لئے جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل پڑی۔ ذرائع آمد و رفت میں ترقی، شوارع کی تعمیر
محکمہ آرائش بلدہ، عدالت العالیہ، انگریزی اور یونانی دواخانوں کا قیام، لاسلکی اور ہوائی اسٹیشنوں کی تعمیر
اسی دور کے نمایاں کارنامے ہیں اس سلسلہ میں ان معاشی اور سماجی قوانین و اصلاحات کو بھی نظرانداز نہ کیا تھا جن
کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود سے تھا۔ یوں تو اعلیحضرت غفران مکان نے سالار جنگ اول کی وفات کے بعد ان کے
رتبہ نظم حکومت کی کافی آزمایش کرکے اور نقائص کو دور کرکے ۱۸۹۲ء میں "قانونچہ مبارک" نافذ فرمایا تھا اور کچھ
عرصہ کے بعد مزید اصلاح و انتظام کی خاطر ۱۸۹۵ء میں "قواعد قانونچہ" کی اشاعت عمل میں آئی۔ جب اعلیحضرت
سلطان العلوم سریر آرائے سلطنت ہوئے تو حضور نے اصلاح کی خاطر انتظام مملکت کا بار گراں خود برداشت کرنا
قبول فرمایا اور ۵ سال کے غور و خوض کے بعد حضور نے جدید تنظیم کا ارادہ فرمایا جس کا مقصد خود الفاظ ہمایونی میں
"عزیز رعایا کی مزید فلاح و بہبود کے ذرائع کا قیام و استحکام تھا" چنانچہ ۱۹۱۹ء میں ایک جدید دستور کا نفاذ ہوا۔
اور باب حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ قوانین پر نظر ثانی ہوئی اور ان ہی کو ایک مجموعہ کی صورت میں ترتیب دیا گیا جو

"مجموعہ قوانین سرکار عالی" کہلاتا ہے اور جس میں تغیر و تبدل کی بھی گنجائش ہے۔

ہندوستان ایک قدیم ملک ہے جس کا شمار ایک زمانہ میں دنیا کے متمدن ممالک میں ہوتا تھا۔ یہاں مختلف مذاہب اور فرقوں کے لوگ آباد ہیں۔ ہر ایک کی طرز معاشرت اور رسوم و رواج جداگانہ ہیں مگر آپس کے میل جول نے ایک دوسرے پر گہرے اثرات ڈالے ہیں نئی اور بیرونی حکومت کے قیام نے قدیم معاشرت کی دیواریں متزلزل کردیں مگر نہ تو وہ قدیم معاشرت کو بالکل ہٹانے میں کامیاب ہوئی اور نہ اس کی جگہ جدید معاشرت ہی قائم ہوسکی۔ اس کے علاوہ موجودہ اعلیٰ تعلیم کی کمی، غلط تعلیمی نظریات، اور دوسرے وجوہ کی بنا پر قدیم عمدہ اصول و نظریات کی صورت ایسی مسخ ہوگئی کہ یہ بھی معلوم کرنا مشکل ہوگیا کہ ان میں کیا کیا خوبیاں تھیں۔ زمانہ اور ماحول ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ دنیا میں وہی قوم یا ملک ترقی کرسکتا ہے جو اپنے اندر زمانہ اور ماحول کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے۔ مگر ہندوستان میں ایسا نہ ہوا اور سماجی زندگی اس بری طرح تباہ ہوئی کہ اس کے اثرات نہ صرف سماج پر پڑے بلکہ ہماری معاشی، تمدن اور سیاسی زندگی میں بھی نمودار ہوگئے۔ ایسی صورت میں ملک کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوسکتی تھی کہ سماجی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ملک میں مصلحین معاشرت کی تعداد ہمیشہ کم رہی۔ ممالک محروسہ بھی ہندوستان کا ایک حصہ ہے یہاں بھی وہی حالات ہیں جو ہندوستان کے دیگر حصوں میں موجود ہیں اور یہاں کی سماجی زندگی میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے اس مضمون میں اس جز کا خاکہ مجملاً پیش کیا گیا ہے۔

نفس مضمون پر روشنی ڈالنے سے پہلے عمرانی قوانین کی مختصر تشریح ضروری ہے۔ ہر قانون کا اثر براہ راست یا بالواسطہ طریقہ پر ہماری عمرانی زندگی پر پڑتا ہے۔ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ فوجداری کے سنگین جرائم مثلاً ڈکیتی، قتل، بلوہ کو ممنوع اور زنا جائز قرار دینے والے قوانین عمرانی قوانین کے دائرہ میں داخل نہیں ہیں۔ بے شک ان سے اور اس قسم کے دیگر قوانین سے ہماری عمرانی زندگی متاثر ضرور ہوتی ہے مگر ان کا اثر بالواسطہ طریقہ پر پڑتا ہے۔ عمرانی قوانین میں ہم ان ہی اصولوں اور ضابطوں کو شامل کرسکتے ہیں جن کا تعلق براہ راست ہماری معاشرت یا سماج سے ہو۔ اس پابندی سے ہمارا دائرہ تحقیق محدود ہوجاتا ہے اور کام میں آسانی ہوجاتی ہے۔

ستی۔ ہندوستان میں قدیم زمانہ سے ستی کی رسم جاری تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوی یا بیویوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ اس لئے ان کو شوہر کی نعش کے ساتھ ہی جلا دیا جاتا تھا اکبر نے اپنے دور حکومت میں اس قبیح رسم کو روکنے کی کوشش کی۔ تو اس کو صرف اس قدر کامیابی ہوئی کہ کوئی عورت بلا رضامندی

کے جلائی نہ جاسکتی تھی۔ اس کا رواج زیادہ اس لئے نہ بڑھا کہ سماج شوہر کے مرنے کے بعد عورت کو بھی مردہ تصور کرتی تھی اس کو دوبارہ شادی کی اجازت نہ تھی۔ اس کو شادی کی تقاریب میں شرکت کی ممانعت تھی۔ اس کو کھانے پینے اور رہنے اور پہننے کی آزادی نہ تھی۔ مختصر یہ کہ اس کی زندگی موت سے بدتر تھی اس وجہ سے وہ موت کو ہی زندگی پر ترجیح دیتی تھی جب ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہوئی تو لارڈ ویلزلی نے اس رسم کے انسداد کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی بعد میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے اس کی ممانعت کے لئے ایک قانون نافذ کیا اور برطانوی ہند میں راجہ رام موہن رائے کی کوششوں سے ۱۸۲۹ء میں ستی کا خاتمہ ہوا۔ گو اس رسم کا خاتمہ آج تک قطعی طور پر تو نہیں ہوسکا ہے اور اب بھی سال میں ایک آدھ واقعہ پیش آہی جاتا ہے مگر اس کی وہ شدت نہیں رہی ہے جو پہلے تھی۔

اگرچہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں یہ رسم عام نہ تھی جیسا کہ خود قانون کی تمہید سے ظاہر ہوتا ہے تاہم بنظر دفع و انقطاع ۲۲ رجمادی الاول ۱۳۴۲ھ (۔۔۔ف) کو قانون ستی نافذ کیا گیا جس کی تمہید حسب ذیل ہے۔

"چونکہ رسم و دستور ستی کا یعنی بیوگان ہنود کا زندہ جلنا اور دفن ہونا رحم اور رقت طبیعت انسانی کے خلاف ہے اور مذہب ہنود میں بھی بطور فرض و واجبات کے کوئی حکم موکد نہیں ہے بلکہ برخلاف اس کے بیوگان کے لئے عفت سے خلوت نشینی کا طریقہ مخصوص و معین او رمقرر ہے اور گو ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس دیار کے اکثر لوگوں میں یہ رسم مروج نہیں ہے اور وہ مطلق اس کی رعایت نہیں کرتے اور بعض تعلقات میں مطلقاً عمل میں نہیں آتی تاہم بنظر دفع و انقطاع کلی رسم مذکور کے لئے ذیل کا قانون نافذ کیا گیا"

اس قانون کی رو سے ستی ہونے یعنی عورت کے زندگی میں جلنے یا دفن ہونے کو جرم قرار دیا گیا نیز جملہ زمینداروں تعلقہ داروں، مالکان اراضی، مستاجروں، جاگیرداروں، مقطعہ داروں، پٹیل، پٹواریوں اور مقدموں کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ وہ ہر ہونے والی ستی کی اطلاع پولس کو دیں اور اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں تو قانون کی نظر میں مستوجب سزا ہوں گے۔

جنسی و معاشی استحصال: جنسی استحصال سے مراد اس طرح جنسی لطف حاصل کرنا ہے جن میں جان بوجھ کر یا عمداً ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو۔ عصمت فروش طبقہ کی عورتوں کی بڑھی تعداد رضامندی اور بڑی خوشی سے اس پیشہ کو اختیار نہیں کئے ہوئے ہے۔ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ بعض افراد اس طبقہ کو قائم

رکھنے کے لئے معصوم اور کمسن اور بالخصوص غریب خاندانوں کی لڑکیوں کو یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انسان کی خرید و فروخت اگرچہ عرصہ ہوا قانوناً ممنوع قرار دی جاچکی ہے مگر قانونی گرفت سے بچنے کے لئے متعدد بہانے تلاش کئے جاتے ہیں۔
ہندوستان میں جنسی استحصال کی مختلف صورتیں مختلف شکلوں میں نظر آتی ہیں اور تواور بدنفس اور بدکردار افراد مذہب کا نام لے کر جنسی استحصال میں مدد دیتے ہیں۔ اس کی ایک شکل کمسن لڑکیوں کو دیوتاؤں کے نام پر بطور چڑھاوے کے چڑھانا ہے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں اور خصوصیت سے جنوبی ہند میں یہ رسم شدت سے جاری تھی۔ اس کی ابتدا کیوں اور کب ہوئی اور اس کا اصل مقصد کیا تھا۔ یہ بذات خود ایک تفصیلی بحث ہے۔ سردست ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے مگر یہ جانتے ہیں یہ رسم جنسی استحصال کی ایک بین صورت تھی۔ اور انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد احکامات جاری ہوئے۔ پہلا اعلان محکمہ معتمدی عدالت سے ۲۹ فروردی ۱۳۲۰ف کو ہوا جو حسب ذیل ہے۔

"سرکار عالی کو معلوم ہوا ہے کہ بعض اشخاص مذہبی رسوم انجام دینے کے بہانے کمسن لڑکیوں کو دیوتاؤں کے نام سے اس غرض سے نامزد کرتے ہیں کہ ان کی کمسنی کے زمانہ میں ان کو خلاف اخلاق کام کرنے میں مصروف کرکے ناجائز منفعت حاصل کریں۔ سرکار عالی کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ کسی فرقہ کے مذہبی افعال میں کسی طرح دست اندازی کرے لیکن جس صورت میں کہ کوئی شخص مذہبی افعال کے بہانے سے ان لڑکیوں کو جن کی عفت کی حفاظت اس کا فرض ہے ناجائز منفعت کی غرض سے فعل شنیع کے لئے یا کسی ناجائز یا خلاف اخلاق غرض کے لئے کام میں لائے گا تو سرکار عالی اس کے فعل کو کسی طرح جائز نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے بذریعہ ہذا اطلاع دی جاتی ہے کہ کوئی شخص ذمہ داری سے محض اس وجہ سے محفوظ نہ ہوسکے گا کہ کوئی لڑکی جس کی عمر ۱۶ سال سے کم ہو، مرلی، بھوانی، دراوصن، جوگن، پری، وغیرہ بنائی گئی۔"

جنسی استحصال کی دوسری شکل یہ تھی کہ بعض افراد دوسری اقوام کی کمسن لڑکیوں کو اپنی یا اپنے عزیزوں کی اولاد ظاہر کرکے شادی کی غرض سے مالدار افراد کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے نیز اس سلسلہ میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ نیچ ذات کی لڑکیوں کو اعلیٰ ذات کی ظاہر کرکے فروخت کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں خرابیوں کو روکنے کے لئے صدر نظامت کوتوالی سے ۲۷ اسفندار ۱۳۱۹ف کو حسب ذیل گشتی جاری ہوئی۔

"شادی کی غرض سے کم استطاعت کوٹی اپنی لڑکیاں ہم قوم مالدار اشخاص کو معقول رقم لے کر دینے کے

عادی ہیں۔ اس پیرایہ میں بدمعاش لوگ دوسرے اقوام کی لڑکیاں لے کر جن کو وہ اپنے عزیزوں کی اولاد ظاہر کرتے ہیں دور دراز مقامات پر جاکر ان لڑکیوں کو قسم لے کر شادی کی غرض سے مالدار اشخاص کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لہذا اس قسم کے لوگوں کی نگرانی کرنا چاہئے۔ نیز عام طور پر کومٹیوں کو ان حالات سے آگاہ کیا جائے جب کوئی شخص کمسن لڑکیوں کو ان کے پاس لائے تو اس کی اطلاع قریب ترین پولیس اسٹیشن پر کی جائے۔"

کوتوالی کی ۲/ امرداد ۱۳۴۳ف کی دوسری گشتی ملاحظہ ہو۔

"ایسے کئی واقعات پیش آچکے ہیں کہ دلالی پیشہ اشخاص نے پنج قوم کی لڑکیوں کو بڑی قوم کی ظاہر کرکے کومٹیوں کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ نیز ملک پنجاب کو جہاں لڑکیوں کی کمی ہے لڑکیاں بھگالے جانے کی کوشش کی گئی۔ ایسے اشخاص کو مجرم قرار دیا جاتا ہے۔"

غریب خاندان کے بچوں یا اطفال لاوارث کا معاشی اور جنسی استحصال بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مالدار افراد غریب آدمیوں کے بچے پرورش کے لئے لے لیتے تھے مگر بعد میں اس سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے تھے۔ اس لئے کوتوالی اور عدالت کے ایک اعلان مورخہ ۱۲/ اردی بہشت ۱۳۲۹ف کے ذریعہ دوسروں کے اطفال کی پرورش کی ممانعت کر دی گئی۔ مگر محکمہ کو اس قسم کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں کہ یہ ممانعت بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہو رہی ہے کیونکہ دیہاتی رعایا یتیم خانوں کے حسن انتظام سے ناواقف ہوتی ہے مگر مقامی متمول اور مالدار افراد پر بھروسہ کرتی ہے اور بچوں کو پرورش کے لئے ان کے سپرد کرنا آسان تصور کرتی ہے۔ کیونکہ یہاں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ والدین اور اولیا نہ صرف اپنے بچوں کے حالات سے باخبر رہتے ہیں بلکہ ان سے مختلف اوقات میں مل جل بھی سکتے ہیں۔ مگر ممانعت کی وجہ سے مقامی متمول افراد کو تو پرورش کا حق نہ رہا اور والدین اپنے بچوں کو یتیم خانوں میں داخل کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ لازماً کم استطاعت والدین کے بچوں کی پرورش میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ۱۶/ تیر ۱۳۳۴ف کو گذشتہ اعلان منسوخ کیا گیا اور آئندہ کے لئے حسب ذیل اعلان پر عمل درآمد ہونے کا حکم جاری کیا گیا۔

"غیر مستطیع اطفال کو بغرض پرورش کسی کو دینے اور لینے کی ممانعت کی گئی تھی جس کی نسبت سرکار کو اطلاع موصول ہوئی کہ اس حکم کی تعمیل سے رعایا کو مختلف دشواریاں محسوس ہو رہی ہیں لہذا اس حکم میں یوں ترمیم کی جاتی

ہے کہ اگر غیر مستطیع والدین یا اولیا اپنے اطفال کو بغیر فروخت کئے ہوئے اپنی رضامندی سے کسی کو بغرض پرورش دیں تو عدالت و پولیس تعرض نہ کرے گی مگر ان سے بدسلوکی قابلِ مواخذہ رہے گی نیز والدین کو یہ اختیار ہر وقت حاصل رہے گا کہ وہ جب چاہیں اپنے اطفال کو واپس لے لیں"

متمول افراد ابتدا میں تو غریب خاندانوں کے بچوں یا لاوارث بچوں کو پرورش کی غرض سے حاصل کر لیتے تھے مگر بعد میں ان پر بڑے بڑے ظلم کرتے تھے۔ ان سے سخت سے سخت کام لیتے تھے، اور ان کی حالت غلاموں سے زیادہ بہتر نہ ہوتی تھی چنانچہ ان مظالم کے روکنے کے لئے معتمدی عدالت و کوتوالی سے آبان ۱۳۳۹ف کو حسب ذیل گشتی جاری ہوئی۔

" چند کارروائیوں کے ضمن میں یہ ظاہر ہوا ہے کہ بعض اوقات لاوارث اطفال پرورش کے نام سے حاصل کئے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ جیسا انسانیت کا سلوک کیا جانا چاہئے وہ نہیں کیا جاتا اور ان کی حالت غلامی سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوتی۔ بعض اشکال میں کم عمر بچوں کو خانگی طور پر ملازم رکھا جاتا ہے اور ان پر ظلم کیا جاتا ہے۔ ان تمام امور کے انسداد کے لئے قانون کی شکل میں عنقریب احکام نافذ کئے جائیں گے لیکن فی الوقت ان کے انسداد کے لئے حسب ذیل احکام جاری کئے جاتے ہیں۔

(۱) دفعہ ۳۷۰ تعزیرات سرکار عالی کی رو سے انسان کی خرید و فروخت جرم قرار دی گئی ہے اس دفعہ کی بڑی سختی سے پابندی کی جائے۔

(۲) آئندہ سے ۱۰ سال سے کم عمر کے کسی بچہ کو بطور خانگی ملازم رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔

۱۳۴۳ف تک لاوارث اطفال کی پرورش کے متعلق جو مختلف احکام گشتیات اور دستور العمل نافذ تھے اب ان میں ترمیم کی گئی اور وضاحت کے ساتھ مکمل طور پر قواعد اطفال لاوارث مرتب کئے گئے جن کا نفاذ یکم آذر ۱۳۳۶ف سے ہوا۔ اس کی بعض اہم دفعات حسب ذیل ہیں۔

طفل لاوارث سے مراد وہ بچہ ہے جس کی عمر ۱۶ سال سے کم ہو اور جو ایسی حالت میں پایا جائے کہ اس کا پرورش کنندہ کوئی نہ ہو۔ لاوارث بچوں کو یتیم خانہ میں داخل کیا جائے۔ نیز ایسے بچے جن کے والدین انھیں پرورش کرنے سے مجبور رہیں انہیں یتیم خانہ سرور نگر میں داخل کیا جائے۔

اس قانون کی دفعہ ۲۱ کی رو سے جب کسی لاوارث لڑکی (جو زیر حفاظت عدالت ہو) سے کوئی شخص عقد

کرنے کی درخواست کرے تو ناظم تحقیقات کنندہ کو حسب ذیل امور کی بابت محکمہ سرکار کو اطلاع دینا ہوگی

الف۔ خواہشمند لڑکی کا ہم قوم وہم مذہب ہے یا نہیں۔

ب۔ خواہشمند اور لڑکی کی عمر کیا ہے۔

ج۔ خواہشمند کا رویہ عام طور پر کیا ہے

د۔ خواہشمند کی وجہ معاش کیا ہے اور ماہانہ یافت کس قدر ہے۔

ھ۔ خواہشمند کی شادی پہلے ہو چکی ہے یا نہیں۔ اور کیا اس کی پہلی بیوی زندہ ہے

و۔ دیگر ضروری امور

یہ وہ امور ہیں غالباً جن کی تحقیقات اچھے گھرانوں میں نہیں کی جاتی۔ ان امور کے پیش ہونے کے بعد شادی کی اجازت دی جاتی ہے۔ لاوارث لڑکی کے عقد کے لئے ۲۵ روپیہ بغرض اخراجات عقد خوانی دئے جاتے ہیں۔ یتیم خانوں میں رہنے والے بچوں کے لئے بلدہ کے اطفال کی خوراک درجہ اول ۸ روپیہ اور درجہ دوم ۶ روپیہ اور اضلاع کے بچوں کے لئے ۵ روپیہ مقرر ہیں۔

عقد بیوگان اہل ہنود۔ ہندو مذہب کے عالموں نے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ ہندو مذہب کی رو سے عقد بیوگان کی مخالفت نہیں ہے مگر رسم و رواج نے اس کو مذہبی حیثیت دے دی۔ کیشو راؤ آنجہانی نے ازدواج بیوگان ہنود کے لئے ایک مسودہ قانون ۱۳۴۰ف میں پیش کیا تھا جس کا مقصد بیوہ عورتوں کو عقد ثانی کی اجازت دینا تھا اور ان ظالمانہ قوتوں کا خاتمہ کرنا تھا جو عرصہ دراز سے ان کی زندگی پر مسلط تھیں اور جس کی وجہ سے عورتیں معاشی حیثیت سے تباہ اور سماجی حیثیت سے ناامید ہو چکی تھیں۔ مگر جب یہ مسودہ مجلس وضع قوانین میں پیش ہوا تو بعض حضرات نے اس کی سخت مخالفت کی اور ثابت کیا کہ بیوہ کا عقد ثانی مذہباً جائز نہیں۔ اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسودہ تعویق میں پڑ گیا اور ۱۳۴۵ف تک اس پر کوئی کارروائی نہ ہو سکی مگر اس سال مجلس نے اس کو پاس کیا اور حال ہی میں اعلیحضرت بندگان عالی نے اس کو شرف منظوری بخشا ہے۔ اس قانون کی رو سے ہر ہندو بیوہ کو شادی کرنے کی اجازت ہے اور ایسی شادی کی اولاد صحیح النسب متصور ہوگی۔ بیوہ کی شادی کا یہ اثر ہوگا کہ اس کے تمام حقوق جو اس کو شوہر متوفی کی جائداد میں بلحاظ احکام دھرم شاستر بہ حیثیت بیوہ کے حاصل ہیں زائل ہو جائیں گے۔ مگر اس صورت

میں اس کا اثر کچھ نہ ہوگا جب بیوہ کے حقوق از دواج سے زائل نہ ہوتے ہوں۔

اصلاحات و قوانین محابس۔ محققین جرمیات نے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ جرائم کے ارتکاب میں مواقع اور شدت ترغیب کو بھی بڑا دخل ہے۔ بعض لوگ حالات یا مصیبت سے مجبور ہو کر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جنھیں جرم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان بدقسمت افراد کو مجرم تصور کرنا یا بغیر ماحول کا لحاظ کئے ہوئے یا بغیر جرم کے داخلی و خارجی اسباب کو پیش نظر رکھتے ہوئے سخت سزائیں دینا اصلاح نہیں بلکہ ان کو تباہی کے غار میں ڈھکیلنا ہے۔ نیز بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم سزا سے بچ جاتے ہیں اور بے گناہ پھنس جاتے ہیں ان وجوہ کی بنا پر قیدیوں کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ سلوک کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ ممتاز ناول نویسوں اور ڈرامہ نگاروں کی وجہ سے ان خیالات کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور متمدن ممالک میں قیدیوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ ممالک محروسہ میں ۱۳۱۷ف سے "قانون محابس" نافذ ہے۔ اس قانون کی رو سے کسی قیدی کو جس کو قید بامشقت کی سزا دی گئی ہو یا وہ خود اپنی خوشی سے مشقت کرتا ہو ۹ گھنٹے روز سے زائد کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ نیز قیدیوں کو جرائم محابس کے سلسلہ میں جو سزائیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً قید علیحدگی میں قیدی کو روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ ورزش کے لئے دینا۔ یا اس کو ایک یا ایک سے زائد قیدیوں کے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت دینا۔ نیز کسی حالت میں بھی مسلسل ۲۴ گھنٹے سے زائد غذا اسے نہ روکا جائے۔

محابس سرکار عالی میں مذہبی اور تمدنی لکچروں کا انتظام بھی ہے اور ۲۰ سال سے کم عمر کے قیدیوں کو ان کی مادری زبانیں اردو، تلنگی، مرہٹی، اور کنڑی سکھلائی جاتی ہیں۔ قیدیوں کو اس بات کا یقین دلانے کے لئے کہ وہ بے حس یا مردہ نہیں ہیں مختلف قسم کے کھیلوں کا انتظام ہے قیدیوں کی بہتری کے لئے امدادی انجمنیں قائم ہیں۔ محکمہ متعلقہ کے زیر غور یہ تجویز بھی ہے کہ محابس میں مختلف موضوعات مثلاً خانوادہ شاہی، اکابرین ملک، نظام حکومت، ملک و مالک کے باہمی تعلقات، شہریت کے فرائض، حفظان صحت کے اصول، جغرافیہ، ابتدائی سائنس وغیرہ پر لکچروں اور تقریروں کا انتظام بھی کیا جائے۔

ماہ جنوری ۳۸ء کے اخبارات میں سررشتہ معلومات عامہ کی جانب سے ناظم صاحب کوتوالی اضلاع سرکار عالی کی حسب ذیل اطلاع شائع ہوئی۔

"تمام اضلاع میں انجمن ہائے امداد سزا یافتگان کی ایک اسکیم منظور کی گئی ہے۔ ان کی انجمنوں کی شاخیں تعلقوں میں بھی قائم کی جائیں گی، ان انجمنوں کا اصلی مقصد یہ ہوگا کہ وہ سزا یافتہ لوگوں کی قید سے رہائی کے بعد دیکھ بھال کریں اور ان کو دوبارہ جرائم کی طرف مائل ہونے سے باز رکھیں ——— عہدہ داران اضلاع کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ایسی انجمنوں کی تشکیل کی فوری کارروائی شروع کردیں، جن کے ارکان پبلک کے افراد ہوں، پیش نظر یہ تجویز ہے کہ مزدوروں سے کام لینے والے اصحاب مثلاً گرنیوں کے مالک، زمیندار، گتہ دار اور بڑے تاجروں کو ترغیب دلائی جائے کہ وہ سماج کے ان بدنصیب افراد کو ملازم رکھنے میں پس وپیش نہ کریں"۔

ان انجمنوں کا قیام اصلاح کی جانب ایک بڑا عمدہ قدم ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے مجرموں کی بڑی تعداد ایسی ہے جس میں جیل خانے جانے سے قبل ایک قسم کی حیا، حجاب، اور غیرت موجود ہوتی ہے، مگر جیل میں زندگی بسر کرنے کے بعد، اور وہاں کے ماحول سے متاثر ہونے کے بعد بُری عادتیں ان کی سرشت میں داخل ہوجاتی ہیں، نیز وہ لوگ جو قید خانے سے نکلتے وقت یہ عہد کرکے نکلتے ہیں کہ آئندہ پاک دامنی کی زندگی بسر کریں گے، سماج ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دوبارہ جرم کریں، کیونکہ ہر جگہ ان کی تحقیر ہوتی ہے کسی کارخانہ، دوکان، یا مکان میں ان کو ملازم رکھنے سے گریز کیا جاتا ہے، دوست احباب، اور عزیز واقارب ان سے ملتے جلتے ہوئے گھبراتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ معاشرتی اور معاشی اسباب ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی توبہ کو توڑیں اور پھر وہی زندگی اختیار کریں جس کو چھوڑ دینے کا وہ عہد کرچکے تھے۔ ایسی صورت میں انجمن ہائے امداد سزا یافتگان کا قیام، اور ان کی اصلاحی کوششیں اگر کامیاب ہوں تو اس سے انسداد جرائم میں بڑی مدد ملے گی۔ نیز اس سلسلہ میں جیل خانوں کے قواعد وضوابط میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے، مثلاً طویل سزاؤں میں کمی، جیل کی اصلاح، قیدیوں کے ساتھ عمدہ سلوک، ان کو نیکی کی تلقین کرنا، اور سب سے اہم چیز یہ کہ ان اسباب کو دور کرنا جن کی وجہ سے متعدد جرائم ظہور پذیر ہوتے ہیں بہت ضروری اور لازمی ہے۔

نوعمر مجرموں کو تادیب خانے میں رکھنا لازم ہے۔ اور ۱۳۲۲ھ سے قانون تادیب خانہ جات نافذ ہے۔ نوعمر مجرم سے مراد وہ لڑکا ہے جس کی عمر ۱۵ سال سے کم ہو۔ ان کے لئے حسب ذیل باتوں کا انتظام ہے۔

۱. رات کو علیحدہ سونے کا

۲. پانی، خوراک، اور بہتر حفظ صحت کا

۳. صنعت و حرفت یا کوئی مفید کام سکھانے کا

۴. بیماری کے زمانہ میں شفاخانہ میں علاج کرانے کا۔

تادیب خانہ میں رہنے کی مدت ۳ سال سے ۷ سال تک ہے اور ۱۸ سال سے زائد عمر کا کوئی لڑکا یہاں نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام صوبوں اور دیسی ریاستوں میں ایسی اقوام آباد ہیں جو جرائم کرتی رہتی ہیں ان کی نگرانی کرنا اور نیک نفس افراد اور عام رعایا کو ان کی بداعمالیوں سے محفوظ رکھنا حکومت کے فرایض میں داخل ہے۔ چنانچہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی ۱۳۲۲ھ سے قانون اقوام جرائم پیشہ نافذ ہے۔ اس قانون کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں زراعت، صنعت، یا دیگر اصلاحی کاموں کے لئے تادیب خانے قائم ہیں۔ وہاں مشتہرہ اقوام جرائم پیشہ کو رکھا جاتا ہے۔ نیز بچوں کے لئے مدارس قائم کئے جاتے ہیں۔ اور بچوں کو جن کی عمر ۶ سال سے ۱۰ سال کے درمیان ہو والدین سے الگ رکھا جاتا ہے۔ ۱۳۲۸ھ میں ان ہی اصولوں کی وضاحت کے لئے "قواعد نوآبادیات جرائم پیشہ" مرتب ہوئے زرعی نوآبادیات میں ضعیف اور معذور کے علاوہ تمام باشندوں کو لازماً کام کرنا پڑتا ہے اور کام کے اوقات حسب ذیل ہیں۔

بچہ (۱۲) سال سے کم ۴ گھنٹے یومیہ

نوجوان (۱۸) سال سے کم ۶ " "

جوان (۱۸) سال سے زائد ۸ " "

دس سال سے کم عمر بچوں کو کام کرنے کی ممانعت ہے۔

صنعتی نوآبادیات میں آباد باشندگان کے لئے حسب ذیل کاموں میں سے کسی ایک کا انتظام ہوتا ہے ان نوآبادیات میں شرح اجرت جہاں تک ممکن ہو ہر تکمیل شدہ کام کے لحاظ سے فرداً فرداً مقرر ہوتی ہے تاکہ محنت اور جفاکشی کی ترغیب اور صلہ یافی ہوتی رہے۔

(۱) پارچہ بافی (۲) دری و قالین بافی

(۳) سبد سازی یا بوریا بافی (۴) سنگ شکنی، سنگ تراشی یا سنگ کنی۔

(۵) نجاری و آہنگری (۶) باغبانی

(۷) افزائش مویشی و مرغ (۸) تعمیر و ترمیم امکنہ

(۹) مٹی کا کام

جرائم پیشہ افراد کی ہر نو آبادی میں ایک مدرسہ قائم ہے جہاں نو آبادی کے جملہ ساکنین کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے۔ ہر بچہ کو جس کی عمر ۶ سال سے ۱۰ سال کے درمیان ہو اس مدرسہ میں تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

بیگار ——— ہندوستان میں اس قسم کی غلامی کا دور تو کبھی نہیں گذرا جیسا کہ امریکہ یا دیگر ممالک میں رائج تھا مگر یہاں قدیم سے غلامی کی دوسری شکلوں کا رواج موجود رہا ہے۔ ان ہی میں سے ایک صورت بیگار کی ہے۔ سرکاری عہدہ دار، جاگیردار، زمیندار، اور دوسرے ذی اثر لوگ شہروں اور بالخصوص دیہات کے ان پڑھ اور ناواقف لوگوں سے سرکاری، غیر سرکاری اور خانگی کام لیا کرتے ہیں اول تو اس کام کا معاوضہ ادا ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کبھی ادا بھی کیا جاتا ہے تو یہ اجرت برائے نام ہوتی ہے۔ حکومت سرکار عالی نے عہدہ داروں اور سرکاری ملازموں کی حد تک تو بیگار کے اس طریقہ کو اس طرح مسدود کیا کہ ضابطہ ملازمت سیول سرکار عالی کی دفعہ ۴۶۸ کی رو سے عہدہ داروں کے دورہ یا منتقلی میں خیمے، اسباب، سرکاری دفتر کی باربرداری کا نرخ بشرح ذیل مقرر کر دیا۔

(۱) قلی مرد جو	۱۲ سیر سے زائد وزن نہیں اٹھائے گا۔	فی میل	۶ ر
(۲) " عورت	۸ " " اٹھائے گی	"	۴
(۳) " بچہ	۶ " " اٹھائے گا	"	۳ ر
(۴) یابو یا خچر		"	۱ ر
(۵) گدھا		"	۲ پائی
(۶) جفت بیل مع آدمی		"	۲ ر
(۷) اونٹ		"	۲ ر
(۸) بغیر بیل کی بنڈی		"	۲ پائی
(۹) بنڈی مع بیل و آدمی		"	۳ ر
(۱۰) کھاچر مع بیل و آدمی		"	۲ ر

نیز ۱۳۲۲ف میں قواعد شکار کا نفاذ ہوا جس میں ہانکے والوں کے لئے شرح اجرت کی وضاحت کر دی گئی۔ یعنی اگر بڑے جانور کا شکار ہو تو ان کو روزانہ فی کس ۴ ادا کئے جائیں۔ چھوٹے جانوروں کی صورت میں ۲ روپیہ اجرت دینا چاہئے۔ اگر کسی دن شکار کیمپ میں ہانکہ والوں کو جمع کیا جائے مگر ان سے کام نہ لیا جائے تو ان کو ۱ روپیہ کے حساب سے اجرت ادا کرنا لازمی ہے۔ اجرت کسی غیر شخص کے ذریعہ سے نہ دی جائے بلکہ براہ راست ہانکہ والوں کو دی جائے اور اجرت فی الفور ادا کی جائے دوسرے دن کے لئے ملتوی نہیں کی جا سکتی۔ ان دونوں نکتوں کو مفید ہونے کا احساس غریب ہانکہ والوں کو بخوبی ہو سکتا ہے کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جب اجرت کسی تیسرے شخص کے ذریعہ سے ادا کی جاتی ہے تو اس کا کس قدر حصہ تقسیم کنندہ کی جیب میں جاتا ہے اور کسی قدر کام کرنے والوں کو ملتا ہے۔ اور فی الفور اجرت کی عدم ادائگی کی صورت میں اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ گذشتہ ایام کی اجرت یا تو ادا ہی نہیں کی جاتی اور اگر ادا بھی کی جاتی ہے تو اس کی تعداد ضرور کم ہو جاتی ہے۔ مگر ان دونوں طریقوں کی وضاحت سے ان خرابیوں کے پیدا ہونے کے امکانات کم ہو گئے ہیں۔ نیز شکار کے سلسلہ میں شکار کرنے والوں کو جس قدر کھلگوں کی ضرورت ہو ان کو قطعی طور پر خرید لیا جائے۔ حکومت نے ان کی عمر کے لحاظ سے ان کی قیمت بھی مقرر کر دی ہے جو ۶ روپئے سے ۹ روپیہ تک ہے۔ مگر ۴ سال سے زیادہ عمر کے کھلگوں کو خریدنے کی ممانعت کر دی ہے کیونکہ اس سے کاشت کاروں کو نقصان ہوتا ہے کیونکہ ان کو زراعت وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔

مگر ان قواعد کے باوجود یہ کہنا کہ ممالک محروسہ میں شکار کا قطعی انسداد ہو چکا تھا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ قانون بیگار کی صریحاً ممانعت نہ کی گئی تھی۔ اس سلسلہ ۱۳۴۱ف میں حسب ذیل فرمان مبارک بتقریب سالگرہ مبارک شایع ہوا۔

"ہمارے ممالک محروسہ میں بیگار کا طریق جو ابھی تک جاری تھا اس کو میں اپنی سالگرہ کی تقریب میں یکلخت موقوف کرتا ہوں کیونکہ اس سے رعایا کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور آئندہ سے حکم دیتا ہوں کہ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ مستوجب سزا سمجھا جائے گا۔"

بہ چیچک ——— ہم جانتے ہیں کہ غذا کی کمی اور حفظان صحت کے اصولوں سے غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے ہندوستانیوں کی جانداری اور سکت کس قدر ادنیٰ اور پست ہوتی جا رہی ہے۔ معمولی معمولی امراض بھی وباؤں کی طرح پھیلتے ہیں۔ اور ہزاروں کی جان لیتے ہیں اور لاکھوں کی کارکردگی اور صحت کو خراب کر دیتے ہیں۔ "ٹائمس آف انڈیا" کی "انڈین ایربک" بابتہ ۲۸-۱۹۲۷ء کے صفحہ (۵۹۵) برطانوی ہند کی ۱۹۲۴ء کی ان اموات کو ۱۰،۵۶،۲۴۴ بتایا ہے جو کالرہ، چیچک

پلیگ، بخارات، پیچش اور دیگر امراض سے ہوئیں صرف چیچک سے اس سال ۲۸۹ ۳ ۸ اموات ہوئیں۔ حالانکہ چیچک سے بچنے کا بہت آسان طریقہ چیچک کا ٹیکہ لے لینا ہے۔ مگر ہماری نادانی اور لاپروائی کی اس سے زیادہ اور کیا انتہا ہوسکتی ہے کہ ہم اس پر بھی عمل نہیں کرتے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں چیچک کے ٹیکہ کو دو طرح سے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور ضابطہ ملازمت سیول کی دفعہ۱۹ کی رو سے کوئی شخص اُس وقت تک ملازمت قسم اعلیٰ پر مستقل طور سے مامور نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ وہ چند شرائط کا حامل نہ ہو اور ان میں سے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عمر و صحت کے متعلق ایک طبی صداقت نامہ پیش کرے جس میں بطور خاص چیچک کے متعلق حسب ذیل امور کی وضاحت ضروری ہے۔

مسمی ———

(۱) کو چیچک نکل چکی ہے۔

(۲) کے بازو پر ٹیکہ کا نشان نمایاں طور پر موجود ہے۔

(۳) کو نہ چیچک نکلی ہے اور نہ ٹیکہ لگایا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ٹیکہ لگانے کے بعد ملازمت میں شامل ہونے کے قابل ہوگا۔

مگر چونکہ یہ پابندی صرف اعلیٰ ملازمتوں کے لئے محدود تھی۔ اس سے متوسط اور ادنیٰ طبقہ کس طرح متاثر ہوسکتا تھا حالانکہ ٹیکہ کی سب سے زیادہ ضرورت ان ہی دونوں طبقوں کے لئے ہے۔ اس لئے ۱۳۴۳ف میں "قواعد چیچک آری" نافذ ہوئے۔ جس کی رو سے ان تمام اطفال کے چیچک کا ٹیکہ لگانا لازمی قرار دیا گیا جن کی عمر ۶ ماہ سے ایک سال کے درمیان ہو۔

قوانین کارخانہ جات۔ ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخر سے ایک نئے قسم کے قوانین کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس سے میری مراد قوانین کارخانہ جات ہے۔ انگلستان میں جب اول اول کارخانے جاری ہوئے تو اُس وقت وہاں عدم مداخلت کی پالیسی کا دور تھا۔ سرکاری نگرانی نہونے کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوگئیں تھیں مثلاً کارخانے تنگ و تاریک مکانات میں تھے، جہاں ہوا، روشنی اور صفائی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، مزدوروں کا ہجوم، مردوں اور عورتوں کا وقت بے وقت اجتماع، طویل اوقات کار، کمسن بچوں اور عورتوں سے ضرورت سے زائد کام، خطرناک کلوں کا استعمال، ادنیٰ اجرتیں، اور متعدد معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا آغاز ہوا۔ ان سب

باتوں نے صحت و اخلاق کو جس قدر نقصان پہونچایا ہوگا وہ محتاج بیان نہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں یہ خرابیاں اس قدر نمایاں نہ ہو سکیں کیونکہ یہاں کارخانوں کے قیام کے ساتھ ہی قوانین کارخانہ جات نافذ ہونے لگے۔ برطانوی ہند میں پہلا قانون کارخانہ جات ۱۸۸۱ء میں نافذ ہوا۔ اگرچہ یہ بہت ہی نامکمل اور ناقص تھا۔ مگر کارخانوں کے بعض معاملات میں پابندیاں عاید کرنے کا باعث ہوا۔ اس کے بعد جس طرح کارخانوں میں ترقی ہونے لگی اسی طرح ان قوانین میں بھی ترمیم و تنسیخ ہوتی گئی۔ ۱۳۳۷ف میں ممالک محروسہ میں بھی قانون کارخانہ جات سرکار عالی" کا نفاذ ہوا جس کی چند اہم دفعات حسب ذیل ہیں۔

اس قانون کی رو سے کارخانہ سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سال کے اندر کسی ایک دن کم از کم ۲۰ اشخاص ایک ساتھ کام پر لگائے جائیں۔ مگر سرکار عالی کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ ان مقامات کو بھی کارخانہ قرار دے سکتی ہے جہاں کم از کم ۱۰ آدمی کام کرتے ہوں۔ ہفتہ سے مراد وہ مدت لی گئی جو یوم پنجشنبہ گذرنے کے بعد رات کو ۲ بجے سے شروع ہو اور آئندہ پنجشنبہ کو ۲ بجے شب کو ختم ہو۔ ہر کارخانہ میں پینے کے لیے صاف پانی، بیت الخلاء اور پیشاب خانہ کا انتظام ضروری ہے۔ کسی عورت یا بچہ سے کارخانے میں کلوں کی صفائی کا کام نہ لیا جائے جبکہ وہ بھاپ یا پانی کی قوت سے یا برقی قوت یا قوت متحرکہ سے چل رہی ہوں۔

زیادہ سے زیادہ ۶ گھنٹے کے بعد ایک گھنٹہ کا وقفہ دیا جائے یا کام پر لگائے ہوئے اشخاص کی استدعا پر کم از کم نصف گھنٹہ کا وقفہ اسی طرح دیا جائے کہ کوئی شخص مسلسل ۵ گھنٹے سے زیادہ کام نہ کر سکے۔

اس قانون میں "طفل" سے مراد وہ لڑکا ہے جس کی عمر ۱۵ سال سے کم ہو۔ اور ان کے لئے ۵½ گھنٹہ کے بعد نصف گھنٹہ کا وقفہ لازمی قرار دیا گیا۔

کسی کارخانہ میں جمعہ کے روز کام نہ لیا جائے بجز اس کے کہ جمعہ کے قبل یا بعد کے تین دنوں میں سے کسی ایک دن اس کو پورے ایک دن کی تعطیل دی گئی ہو یا دی جانے والی ہو۔ تعطیل کا دن اسی طرح مقرر ہونا چاہئے کہ کسی شخص کو مسلسل دس دن سے زائد کام کئے بغیر ایک پورے دن کی تعطیل مل جائے۔

۱۲ سال سے کم عمر بچے کو کارخانہ میں ملازم نہ رکھا جائے۔ اور اس سے زائد عمر والے لڑکے کے لئے بھی صداقت نامہ طبی لازمی ہے۔ کسی لڑکے سے صبح ۵½ بجے سے پہلے یا شام کو ۷ بجے کے بعد کام نہ لیا جائے کسی لڑکے سے روزانہ ۶ گھنٹے سے

زاید کام نہ لیا جائے۔

عورتوں کو بھی صبح ۵ ½ سے پہلے اور شام کو ۷ کے بعد کام کرنے کی ممانعت کردی گئی نیز کسی عورت سے کسی دن ۱۰ گھنٹے سے زائد کام نہ لیا جائے۔ مردوں کے لئے ۶۰ گھنٹے فی ہفتہ مقرر کئے گئے مگر اس طرح کہ کسی ایک دن ان کو ۱۱ گھنٹے سے زائد کام نہ کرنا پڑے۔

کارخانہ کے عام راستہ پر ایک بورڈ لگایا جائے جس پر حسب ذیل امور کی صراحت ہوا کرے

الف۔ ہر روز کام کے آغاز اور اختتام کا وقت

ب۔ وقفہ کا تعین اور وقت

ج۔ اگر باری باری سے کام کرنے کا انتظام ہو تو اس کے آغاز اور اختتام کا وقت

د۔ کام کرنے والوں کی مجموعی تعداد

ھ۔ ہفتہ واری تعطیلات

اگر کارخانہ میں کوئی حادثہ ہو تو منتظم کو چاہئے کہ مدت مقررہ کے اندر اس کی اطلاع عہدہ دار متعلقہ کو دے۔ نیز کسی بچہ کو اگر اس کا باپ یا ولی ایک دن میں دو کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کرے تو اس پر جرمانہ کیا جائے گا جس کی مقدار ۲۰ روپیہ تک ہو سکتی ہے۔

اس قانون میں انجن یا مشینوں کے گرد جنگلہ لگانے کی اس لئے توضیح نہیں کی گئی کہ اس سلسلہ میں ۱۳۱۹ء میں ایک "قانون متعلقہ بائلر و مشینری" نافذ ہو چکا ہے۔ اس کی رو سے کسی انجن یا بائلر یا مشینری کو بغیر انجینیر یا ناظر کی بغیر اجازت استعمال کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ناظر کو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر وہ کسی مشین کے گرد کٹہرا لگانے کا حکم دے اور مدت معینہ میں کٹہرا نہ لگایا جائے تو مشین بند کی جا سکتی ہے۔

۱۳۲۰ء میں "قانون معادن" نافذ ہوا جس کی رو سے ۱۲ سال سے کم عمر بچے کو زیر زمین کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اور معدنوں میں ناظروں کا تقرر ہوا۔ جن کا فرض ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ معدن کے ہر حصہ میں ہوا پہونچنے کا معقول انتظام ہے یا نہیں۔ اور کسی شخص کو خطرہ کی جگہ تو کام نہیں کرنا پڑتا ہے۔ نیز جب کسی معدن میں کوئی حادثہ پیش آجائے تو ایجنٹ یا منیجر فوراً اس کی اطلاع حکام متعلقہ کو دے گا۔

انسداد مسکرات۔ ممالک محروسہ کی آمدنی کا مالگذاری کے بعد دوسرا بڑا ذریعہ آبکاری ہے۔ چنانچہ ۱۳۴۷ف کے موازنہ کے مطابق اس سررشتہ سے ایک کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ کی آمدنی ہونے کا امکان ہے[۱]۔ لیکن اس کثیر آمدنی کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس سررشتہ کو توفیر آمدنی کے لئے توفیر مسکرات کا باعث نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ انسداد مسکرات بھی اس کے لائحہ عمل میں داخل ہونا چاہئے۔ ممالک محروسہ میں مسکرات کے رواج کو بالکل بند کر دینا تو دانشمندی کے خلاف تھا کیونکہ ممالک محروسہ کے سامنے متمدن ممالک میں سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، ریتبول، بی۔ ایس۔ ٹونور، جے۔ پی، ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست بھوپال کی مثالیں موجود تھیں جہاں مسکرات کو یک لخت ممنوع قرار دیا گیا۔ مگر بعد کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس لئے یہاں قطعی انسداد کے بجائے تحدید پر زیادہ زور دیا گیا۔ اور حکومت سرکار عالی نے ایک کمیشن مقرر کیا کہ وہ انسداد مسکرات کے لئے ایک مرکزی انجمن کے قیام پر غور کرے۔ کمیشن نے بالاتفاق تصفیہ کیا کہ اس انجمن کی سخت ضرورت ہے چنانچہ ۱۰ رمضان ۱۳۵۱ھ کے فرمان مبارک کے ذریعہ "انجمن ترک مسکرات" کا قیام عمل میں آیا جو نواب مرزا یار جنگ بہادر صدر، دیوان بہادر ایس آر وا مودو آئینگار نائب صدر، اور چار دیگر ارکان پر مشتمل ہے۔

کام جاری کرنے کے لئے حکومت نے ۱۳۴۵ف میں ۵ ہزار، ۱۳۴۶ف میں دس ہزار، اور ۱۳۴۷ف میں ۱۵ ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ کمیٹی نے بلدہ حیدرآباد کو نو محلوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہر محلہ میں ایک اعزازی میر محلہ مقرر کیا ہے جس کے سپرد اس محلہ میں ایسے رضاکاروں کو بھرتی کرنا ہے جو اس کام میں اس کو مدد دے سکیں۔ کمیٹی کی جانب سے ایک دارالمطالعہ اور ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ کمیٹی مختلف جلسے کرتی ہے جس میں بیرونی اصحاب کو بھی مدعو کرتی ہے تاکہ وہ مسکرات کے مضر اثرات پر روشنی ڈالیں۔ اور طلسمی فانوسوں کی مدد سے بھی اپنے کام کی تبلیغ کرتی ہے۔ کمیٹی کی جانب سے ہر سیندھی خانہ کے قریب امتناعی بورڈ لگائے گئے ہیں جن پر اردو اور تلنگی میں مسکرات کو کم کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔ کمیٹی کے صدر نے ممالک محروسہ کا ایک دورہ بھی کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گلبرگہ، ورنگل اور اورنگ آباد میں بھی اس انجمن کی شاخیں قائم ہو گئیں ہیں۔ تیر ۱۳۴۶ف سے انجمن کی جانب سے ایک ماہوار اردو اور تلنگی کا رسالہ بھی جاری کیا گیا ہے۔ عنقریب کمیٹی کی جانب سے اس سلسلہ میں اردو اور تلنگی کے ڈرامے بھی دکھلائے جانے والے

---

[۱] ملاحظہ ہو کیفیت موازنہ ۱۳۴۷ف مرتبہ نواب فخر یار جنگ بہادر صفحہ ۲۷

ہیں۔ اور نشر و اشاعت کی دوسری تجاویز بھی زیر غور ہیں۔ انجمن ایک "نو آبادی" کی داغ بیل بھی ڈالنے والی ہے جو فی الحال ۵۰ مکانات پر مشتمل ہوگی۔ اس نو آبادی میں رہنے والے ہر فرد کو اس بات کا تحریری عہد کرنا پڑے گا کہ وہ تمام منشیات سے دور رہے گا۔ اور جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا اس کو نو آبادی سے نکال دیا جائے گا۔ جاپان میں اس قسم کی نو آبادیوں سے بڑے اچھے نتائج پیدا ہوئے ہیں یہ انجمن ابھی ابتدائی حالت میں ہے، اس وجہ سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کتنے افراد کو اس "لت" سے چھڑایا۔ لیکن یہ اگر اسی طرح کام کرتی رہی تو ممکن ہے کہ چند سال کے بعد اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں۔ ایک طرف ترک مسکرات کی انتہائی کوشش کی جا رہی ہے دوسری طرف بعض سرکاری یا نیم سرکاری تقاریب میں بلا تکلف ترک مسکرات کا استعمال ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ انجمن اپنے اخلاقی اثر سے کام لے کر اس کو بھی حتی الامکان کم کرانے کی کوشش کرے۔ حکومت مدراس اپنے جس رقبہ میں انسداد منشیات کا قانون پاس کیا ہے وہاں کسی سرکاری یا نیم سرکاری تقریب میں کسی قسم کی نشہ آور شئے کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا ہے۔ افیون کے استعمال پر بھی پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ آج سے ۲۰ سال پہلے ممالک محروسہ میں ۵۰۰، ۱ افیون کی دوکانیں تھیں مگر آج کی تعداد صرف ۹۰۵ رہ گئی ہے۔ افیون کی تعداد میں بھی کمی ہو گئی ہے۔ ۲۰ سال قبل ۰۰۰،۰۰۰،۱ اونس افیون سالانہ خرچ ہوتی تھی مگر اب اس کی تعداد صرف ۰۰۰، ۴۹ اونس رہ گئی ہے۔ مقدار کی اس کمی کے باوجود آمدنی میں ۷۰ فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔

بیمہ اور پراویڈنٹ فنڈ۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایسے گھرانے جو کافی متمول ہوتے ہیں مگر یا تو ان میں پیش بینی کی صلاحیت نہیں ہوتی یا وہ اپنے زائد اخراجات کی وجہ سے کچھ پس انداز نہیں کر سکتے ان کے بعد ان کے گھر بار پر مصیبت نازل ہو جاتی ہے۔ ہم کو متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جہاں اولاد کی معمولی معمولی تقریبات پر ہزاروں روپیہ صرف کیا گیا تھا مگر آج وہی اولاد نان شبینہ کو محتاج ہے۔ حکومت سرکار عالی نے ان ہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے "حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس پراویڈنٹ فنڈ" کے قانون کا یکم اسفندار ۱۳۳۲ف سے نفاذ فرمایا اور سرکار نے معتدبہ صرف برداشت کر کے بیمہ فنڈ قائم کیا۔ مستثنیاتی صورتوں کے علاوہ تمام ملازمین قسم اعلیٰ پر بیمہ فنڈ سرکار عالی میں چندہ ادا کرنا لازمی ہے۔ نیز اس میں منصب، ماہوار خاص، رعایتی لگان پانے والوں کو بھی شریک ہونا پڑے گا۔ بیمہ کے دو طریقے رکھے گئے ہیں۔

(۱) حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس

(۲) پراویڈنٹ فنڈ

یہ ہر دو فنڈ ایک مجلس انتظامی کے زیر انتظام ہیں۔ جس کے صدر نشین صدر المہام فینانس ہوتے ہیں صدر محاسب اور دوسرے عہدہ دار اس کی مجلس انتظامی کے رکن ہوتے ہیں۔ اور ریاست کے تمام ملازمین درجہ اعلیٰ علاقہ سیول و فوج ماہوار یاب زائد از ۲۵ قابل وظیفہ جائدادوں کے ملازموں کو بیمہ کرانا لازمی ہے۔ بیمہ کی عمر ۱۲ سال سے ۵۴ سال کے درمیان رکھی گئی ہے مگر شرح چندہ میں عمر کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے مگر عام طور پر شرح حسب ذیل ہے۔

۲۵ سے زائد اور ۵۰ تک کے لئے ماہوار عمہ

۵۰ ؍ ؍ ماہ ؍ عاہ

ماہ ؍ ؍ ما (۲۰۰) ؍ للعہ

ماہ ؍ ؍ سما (۳۰۰) ؍ سے

سماہ ؍ ؍ الما (۴۰۰) ؍ سے

اس کے بعد ہر زائد سو روپیہ یا اس کے حصہ پر عاہ

مقررہ رقم کی وضعات ہر ماہ کی تنخواہ کی ادائی کے وقت برآوردات سے ہوجایا کرے گی۔ اگر بیمہ شدہ ملازم ۵ سال سے قبل مرجائے تو رقم بیمہ اس کی بیوہ یا بچوں میں بموجب اس کی درخواست کے تقسیم کی جائے گی۔

پراویڈنٹ فنڈ ان ملازمان کے لئے مخصوص ہے جو حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس فنڈ میں شرکت کا استحقاق نہ رکھتے ہوں۔ اس فنڈ میں چندہ دینا اختیاری امر ہے اور معائنہ طبی کی بھی ضرورت نہیں۔ اس فنڈ میں انشورنس فنڈ کے اراکین بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ نیز سرکار ان ملازمین کی بے وقت موت کے بعد ان کے متعلقین کو کسی حق یا وظیفہ یا انعام کا حقدار تصور نہیں کرتی جو اس فنڈ میں شامل نہ ہوں۔

تعمیر الکنہ۔ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ شہروں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور دیہات و قصبات سے نہ صرف یہاں مزدور آکر بسنے لگے بلکہ شہروں کی دلچسپی اور رونق نے دیہات کے زمینداروں اور جاگیرداروں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں میں مکانات کی قلت محسوس ہونے لگی۔ معمولی معمولی مکانوں اور کمروں کے کرایوں میں

اضافہ ہوگیا۔ کئی کئی خاندان ایک چھوٹے مکان میں یا متعدد افراد ایک ہی کمرہ میں زندگی گذارنے پر مجبور ہوگئے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض مخصوص شہر محض اس وجہ سے بیماریوں اور وباؤں کا گھر بن جاتے ہیں کہ وہاں معمولی اور خراب مکانات کی کثرت ہوتی ہے۔ جن میں دھوپ، روشنی اور ہوا کا کافی گذر نہیں ہوتا۔ غلیظ پانی کی نکاس کے لئے پختہ نالیاں نہیں ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مکانات یا محلے غریب اور متوسط طبقوں کے لوگوں کے ہوتے ہیں اب ان میں اتنی سکت تو ہوتی نہیں کہ وہ اپنے مکانات روشن اور ہوادار بنوائیں، سڑکیں کشادہ کرائیں، نالیاں زمین دوز اور پختہ بنوائیں۔ حکومت کی بغیر امداد کے ان کی اصلاح ممکن نہیں اس وجہ سے تمام متمدن ممالک میں تعمیر امکنہ کے مسئلہ کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ممالک محروسہ میں ایسی ہی خرابیوں کی اصلاح کے پیش نظر محکمہ آرائش بلدہ قائم کیا گیا۔[۵] جس کا مقصد جیسا کہ خود حضرت ظل سبحانی نے جشن سیمیں کے مبارک موقع پر آرائش بلدہ کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا یہ ہے "مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے دارالخلافہ میں اس پیچیدہ مسئلہ کو حل کرلیا گیا ہے جو ہندوستان کے بڑے شہروں کے سامنے پیش ہے محکمہ کو صرف بناوٹ اور دکھاوٹ کے کاموں کی طرف توجہ نہ کرنا چاہئے بلکہ اس کا نصب العین غریبوں کے لئے نئے مکانات بنانا اور خراب مکانات کو ختم کرنا ہو۔"

محکمہ نے کثیر الآباد اور غیر صحت بخش علاقوں کی صفائی کا انتظام اپنے ذمہ لیا۔ فیل خانہ جو شہر کا ایک کثیر الآباد حصہ تھا سینکڑوں بیماریوں کی پرورش گاہ بھی تھا۔ حالیہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس محلہ کا تین چوتھائی حصہ صاف کردیا گیا ہے، نئے مکانات، کشادہ سڑکیں اور پختہ زمین دوز نالیاں اس علاقہ میں بنوا دی گئی ہیں۔ چودہ غریب وارڈ (Slums) کو ۵ لاکھ پونڈ کے صرفہ سے ختم کردیا گیا۔ گیارہ مقامات پر نئے مکانات بنائے گئے ہیں جن کی تعداد ۲½ ہزار سے زائد ہوچکی ہے اور جن پر ۲½ لاکھ پونڈ کے قریب صرف ہوچکے ہیں۔ اور ان میں آج کل دس ہزار شہری زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ مکانات کرایہ پر دیئے جاتے ہیں اور ان کا کرایہ بہت ہی قلیل رکھا گیا ہے۔ مگر بعض محلوں کے مکانات کے متعلق یہ شکایت عام ہے کہ ان پر معقول آمدنی پانے والے اصحاب نے قبضہ کر رکھا ہے اور ایک ایک فرد نے دوسروں کے ناموں سے متعدد مکانوں پر قبضہ کرلیا ہے، اس کی وجہ سے غریب اور ادنیٰ متوسط طبقہ کو جن کے لئے دراصل یہ مکان بنائے گئے ہیں سخت نقصان ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ایک محلہ کے باشندوں کو محکمہ کی جانب سے اس

---

[۵] ذیل کی معلومات مسٹر بی ایس ٹوٹو رجے ڈی کے مضمون "موجودہ حیدرآباد" سے لی گئی ہیں جو "ایشیاٹک ریویو" میں ماہ جولائی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔

قسم کا نوٹس دیا گیا ہے کہ ایک معینہ آمدنی پانے والے لوگ ہی ان مکانوں میں سکونت اختیار کر سکتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے ان مکانات کا تخلیہ کرایا جا رہا ہے۔ اگرچہ قابضین کو یہ امر بہت ناگوار گذرا مگر اصولی طور پر یہ چیز بالکل درست ہے اور میرے خیال میں کوئی سو روپئے سے زائد آمدنی حاصل کرنے والا شخص سات روپئے یا اس سے کم کے مکانوں میں نہ رہنے پائے۔

یمین السلطنت سر مہاراجہ بہادر کے دور صدر اعظمی کے زمانہ ہی سے ممالک محروسہ میں بہبودی اطفال کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور حکومت معتدبہ رقم بہبودی اطفال کے مرکز ان کو بطور امداد دیتی ہے شہر کے اکثر میدانوں و حصوں میں بچوں کے لئے خوشنما چھوٹے چھوٹے پارک بنوا دئے گئے ہیں جہاں کھیل کود کے مختلف سامان بھی موجود ہیں۔ ادنیٰ طبقہ کی عورتوں کے لئے حمام خانے بھی بنوائے گئے ہیں۔

یہ مضمون نامکمل ہو جائے گا اگر اس میں ان کوششوں کا ذکر نہ کیا جائے جو سماجی اصلاح کے لئے بعض ذمہ دار اور برسرکار حضرات کی جانب سے پیش کی گئیں یا پیش کی جانے والی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز قانون تحفظ اوقاف ہے۔ اس مسودہ کو نواب اختر یار جنگ بہادر سابق ناظم و معتمد امور مذہبی و رکن مجلس وضع قوانین نے پیش کیا تھا۔ آپ نے اپنی تقریر کے سلسلہ میں بتایا کہ مملکت حیدرآباد میں اہل اسلام و ہنود کے اکثر اوقاف ہیں اور شاہان حیدرآباد کے عطا کردہ قطعہ جاگیریں، آراضیات، زرنقد ماہانہ و سالانہ کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ایسی املاک بیشتر ہیں جو معاش مشروط کے نام سے موسوم ہیں لیکن ان کا تحفظ و انتظام جیسا ہونا چاہئے نہیں ہو رہا ہے۔ اوقاف اور معاشہائے مشروط خلاف مقاصد وقف و شرائط عطا متولیوں کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور اکثر موقوفہ جائدادیں بیع اور رہن بھی ہو چکی ہیں اور ناجائز قبضے میں ہیں۔ آگے چل کر آپ نے بیان کیا کہ ہر مہذب سلطنت اوقاف کے تحفظ کو اپنا اہم فریضہ سمجھتی ہے چنانچہ سلاطین شاہان ہند کے عہد میں صدر الصدور کا عہدہ جس کے متعلق اوقاف کی نگرانی تھی سلطنت کا سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے سلطنت ترکی کے عہد کی مستقل وزارت تحفظ اوقاف و انگلستان کے قوانین اوقاف کا ذکر کرتے ہوئے برطانوی ہند کے "قانون وقف اہل اسلام ۱۹۲۳ء" کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ قانون تحفظ اوقاف کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس قانون کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ متولی جائداد موقوفہ کی آمدنی و خرچ کا سالانہ جانچ شدہ حساب عدالت میں پیش کر دیا کریں۔ اس لئے آپ نے اوقاف حیدرآباد کے تحفظ کے لئے ایک باضابطہ محکمہ قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی اور یہ مسودہ پیش کیا جس میں مختلف ممالک اور ریاستوں کے قوانین سے مدد لی گئی تھی۔

اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ تمام اوقاف کا انتظام، تمام نگرانی اور پابندی احکام قانون ہذا ناظم امور مذہبی کے تفویض ہو جائے

تمام اوقاف کی فہرست مرتب کی جائے جس میں اس کی سالانہ آمدنی مقاصد وقف اور دیگر ضروری امور کی صراحت ہوگی جو جائداد جس کام کے لئے وقف کی گئی ہو اس کے خلاف اس کی آمدنی کسی دوسری مد پر صرف نہ کی جاسکے گی جن اوقاف کے مقاصد معین نہ ہوں سرکار ان کے مقاصد معین کرے گی۔ قدیم اور پرانی موقوفہ عمارات کو فروخت کرکے ان کے معاوضہ میں نئی عمارات خریدی جائیں گی متولی کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ جائداد موقوفہ اپنے نفع کے لئے یا کسی اور غرض سے جو اغراض اوقاف کے خلاف ہوں استعمال کرسکے نیز وہ بطور مختار کسی دوسرے کو پٹہ لگان یا قول پر دینے کا مجاز بھی نہ ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ مسودہ بہت واضح اور تفصیلی تھا مگر یہ قانونی صورت اختیار نہ کرسکا۔ ریاست سرکار عالی میں پارسی ملت کے باشندگان کی کثرت ہے مگر ان کی وراثت کے متعلق کوئی قانون یا احکام مدون نہیں ہیں حتیٰ کہ یہ حکم بھی نہیں ہے کہ مثل اہل ہنود و اہل اسلام ان کی وراثت کا تصفیہ ان کے ذاتی قانون کے مطابق ہوگا۔ حکومت ہند نے ان ہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۲۵ء میں بالصراحت وراثت پارسیان کا قانون نافذ کیا ممالک محروسہ کی انجمن پارسیان نے یہاں بھی اس قسم کا مسودہ پیش کرنے کی تحریک کی۔ اور اسی بنا پر شیشو ناتھ صاحب رکن مجلس وضع قوانین نے "مسودہ قانون وراثت اشخاص ملت پارسی" پیش کیا۔ مگر اس مسودہ کو منظوری نہ مل سکی۔

جس طرح شوہر کا حق زوجہ پر ہے اسی طرح زوجہ کا حق شوہر پر بھی ہے جس طرح شوہر جب چاہے اپنی زوجہ کو طلاق دے سکتا ہے اسی طرح زوجہ کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ چند خاص وجوہ کے تحت طلاق حاصل کرسکے۔ مسلمان عورتوں کو یہ حق دلانے کے لئے ۱۳۴۲ھ میں خلیل الزماں صاحب بیرسٹر رکن مجلس وضع قوانین حال رکن عدالت العالیہ نے "مسودہ قانون الزدواج اہل اسلام" پیش کیا۔ اس قانون کی رو سے زوجہ کو حسب ذیل صورتوں میں فسخ نکاح کا حق حاصل ہوسکتا تھا۔

الف۔ شوہر ناکارہ ہو

ب۔ مجزوم یا مبروص ہو یا کسی ایک سال میں سے سخت مرض میں مبتلا ہوکر ادائے حقوق زن وشوئی نہ کرسکے یا تعلق برقرار رکھنا زوجہ کے لئے سخت مضر صحت ہو اور ظلم کی حد تک پہونچتا ہو

ج۔ چار سال سے زائد سے شوہر مفقود الخبر ہو بشرطیکہ اس مدت کا نان ونفقہ یا جائداد زوجہ کے قبضہ میں ہو یا طویل سزا پاگیا ہو۔

د۔ بدسلوکیاں کرتا ہو۔

آپ نے اس مسودہ کی حمایت میں جو تقریر کی تھی اس میں اس بات کو پوری طرح ثابت کر دیا تھا کہ مذہبا اور شرعا عورت کو یہ حق پہونچتا ہے مگر اس کے باوجود یہ مسودہ پاس نہ ہو سکا۔

ملک کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم ابتدائی کی ترویج ہو لیکن اس کی ترویج کا معاوضہ فیس سے کامل طور پر ہو نا نہیں پایا جاتا چنانچہ دیگر ممالک کا تجربہ یہی ہے کہ محض ابتدائی تعلیم مفت قرار دئے جانے سے خاطر خواہ اس کی اشاعت عمل میں نہیں آتی اس لئے اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ تعلیم ابتدائی کو نہ صرف بلا فیس جاری بلکہ اس کو لازمی بھی قرار دیا جائے۔ چنانچہ اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے یکم تیر ۱۳۴۵ ف کو میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے ابتدائی جبری تعلیم کا مسودہ پیش کیا۔ جس کی تمہید میں آپ نے بتایا کہ "لازمی تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کو سرکار عالی کے ذمہ دار عہدہ داروں نے بھی مختلف موقعوں پر تسلیم فرمایا ہے اور ملک کی رائے عامہ بھی اس کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اس مسودہ میں اس امر کی بھی کوشش کی گئی تھی کہ لازمی تعلیم کے اغراض کو پورا کرنے کے لئے اس کی مشینری جس قدر سہل ہو رکھی جائے اور مالی مشکلات کا جو سوال ایسے مسائل کے پیش رفت میں حائل ہوتا ہے اس کا حل بھی بتایا جائے۔ علاوہ ازیں بلحاظ حالات مقامی وہ ناگزیر صورتیں جو زراعت پیشہ اشخاص کو اپنی اولاد سے زراعتی کام لینے کے متعلق پیش آتی ہیں ان کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ ممکنہ طور پر اختلافی مسائل کو اس قانون میں شریک نہ کیا جائے تاکہ ضمنی اختلافات سے اصل مقصد متاثر نہ ہو"۔

اس مسودہ میں "طفل" سے مراد وہ لڑکا لیا گیا جس کی عمر ۶ سال سے ۱۲ سال تک ہو اور "ابتدائی تعلیم" میں لکھنے پڑھنے اور حساب کے اس نصاب کو شامل کیا گیا جو محکمہ تعلیمات کی جانب سے مقرر کیا جائے۔ اور ۴ سال کی تعلیم پر مشتمل ہو۔ تمام والدین پر یہ امر لازمی گردانا گیا کہ وہ اپنے لڑکوں کو مسلمہ مدرسوں میں روانہ کریں۔ نیز کسی شخص کو کسی ایسے لڑکے کو ملازم رکھنے کا حق نہ ہوگا جس پر قانون ہذا کے تحت مدرسہ جانا لازمی ہو۔ اس رقبہ میں جہاں یہ قانون نافذ ہوگا مجلس بلدیہ اور مجلس تعلیمی کا فرض ہوگا کہ وہ مدرسہ کے لئے جگہ فراہم کرے اور خاص "تعلیمی محصول" عائد کرنے کی مجاز بھی ہوگی۔ اور جو کچھ آمدنی اس محصول سے ہوگی وہ کلیتاً اس رقبہ میں رہنے والے لڑکوں کی ابتدائی تعلیم پر خرچ کی جائے گی۔

اسی سال وامن رام چندر نایک ایک انعامی جاگیردار و رکن مجلس وضع قوانین نے ابتدائی جبری تعلیم کے متعلق

ایک دوسرا مسودہ پیش کیا تھا۔ ان دونوں مسودوں کو ایک ساتھ ہی پیش کیا گیا تھا۔ اور ان میں دونوں میں صرف جزوی اختلافات تھے مثلاً دوسرے مسودہ میں "طفل" سے مراد وہ لڑکا لیا گیا تھا جس کی عمر ۶ سال سے ۱۱ سال ہو۔ مگر بنیادی اصولوں میں دونوں صاحبان کو اتفاق تھا

ان سوالوں کو پیش ہونے سے پہلے ہی بعض حضرات نے حکومت سے درخواست کی کہ جبری تعلیم کے مسودہ کو پیش کرنے کی اجازت نہ مرحمت فرمائی جائے اور اس کے حسب ذیل وجوہ پیش کئے۔

(۱) زراعت، تجارت، اور دوسرے کاروبار سے لوگوں کا رجحان ملازمت کی طرف پھر گیا ہے مگر ملازمتیں کم ہیں اس وجہ سے مسئلہ بے روزگاری اور سخت ہو جائے گا۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ بنگال یا برطانوی ہند کے بعض صوبوں کی طرح یہاں بھی دہشت انگیزی کے طریقے پیدا ہو جائیں۔

(۲) کاشتکاروں کی اولاد ۹ سال تک ان کے کام میں مدد نہ دے سکے گی اور اس سے ان کی آمدنی کو نقصان پہونچے گا

(۳) اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے کروڑہا روپیہ درکار ہوں گے۔ اگر یہ رقم ٹیکس سے وصول کی جائے تو رعایا پر ٹیکس کا بار بہت بڑھ جائے گا۔

(۴) ابتدائی تعلیم کے لئے چھ سال کی مدت بہت قلیل ہے اور اتنے قلیل عرصہ کی تعلیم سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا اس لئے اس مدت کو نو سال ہونا چاہئے۔ مگر مدت کی توسیع سے مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا۔

(۵) موجودہ تعلیم و نصاب دونوں ناقص ہیں اس وجہ سے ناقص تعلیم کی جبری اشاعت کہاں تک مناسب قرار دی جاسکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معترض کے بعض اعتراضات معقول ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تصویر کے صرف ایک رخ کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور اس کے نقصانات ہی گنا دیے ہیں۔ اور فوائد سے قطع نظر کرلی ہے۔ بہرحال اس مخالفت کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور یہ دونوں مسودے مجلس وضع قوانین میں پیش ہوئے اور ان پر بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ اس دوران میں معلوم ہوا کہ خود حکومت ابتدائی جبری تعلیم کے نفاذ پر غور کر رہی ہے اور عنقریب ایک مسودہ

پیش کرنے والی ہے۔ اس وجہ سے یہ دونوں مسودے واپس لے لئے گئے

۹۔ امرداد ۱۳۴۵ف کو میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے ایک اور مسودہ "قانون آزادی مذاہب" کے نام سے پیش کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص کو مذاہب کی آزادی کے ساتھ یہ حق بھی حاصل ہونا چاہئے کہ بصورت تبدیلی مذہب وہ اپنے ان حقوق سے جو بلحاظ قانون و رواج اس کو حاصل ہو سکتے تھے محروم نہ کیا جائے گا۔ اور وہ احکام جن سے کہ بوجہ تبدیلی مذہب کوئی شخص غیر مستحق قرار پاتا ہو منسوخ کئے جائیں۔ یہ مسودہ آج کل زیر بحث ہے۔

گیشٹ راؤ آنجہانی کا شمار ملک کے مصلحین معاشرت میں کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے ۱۳۴۳ف میں حسب ذیل مسودات پیش کئے تھے۔

۱۔ مسودہ قانون انسداد نابیوگان ہنود

۲۔ مسودہ قانون شادی گوسائیاں

۳۔ مسودہ ترمیم امتناع جماع بازوجہ کم عمر

پہلے مسودہ کا تو ہم تفصیلی ذکر کر چکے ہیں اور اب اس کو قانونی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ دوسرا مسودہ گوسائیوں کی شادی کے متعلق تھا۔ ممالک محروسہ میں گوسائیوں کے دو فرقے پائے جاتے ہیں ایک تو وہ جو باقاعدہ شادی کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو بغیر شادی کے کسی ایک عورت سے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ غیر منکوحہ عورت سے جو اولاد ہو وہ اولاد نہیں کہلاتی بلکہ اس کو "چیلا" کہا جاتا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ بڑا بیٹا باپ کا چیلا بنتا ہے اور اس سے چھوٹے لڑکے کو بڑے بھائی کا چیلا بننا پڑتا ہے۔ گرو (باپ) کے مرنے کے بعد پہلے اس کا چیلا (بڑا لڑکا) جائداد کا وارث ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کا چیلا (دوسرا بیٹا)۔ اس مسودہ کا مقصد یہ تھا کہ گوسائیوں کو باقاعدہ شادی کا پابند کیا جائے اور اس کی اولاد کو حق وراثت عطا کیا جائے۔ تیسرا مسودہ برطانوی ہند کے اس قانون پر مبنی تھا جس کے رو سے ایک معینہ عمر کے اندر زوجہ سے زن و شوہر کے تعلقات قائم نہیں کئے جا سکتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کمسن عورتوں سے تعلقات زوجیت پیدا کرنے سے نہ صرف اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے بلکہ خود عورت بھی مختلف جسمانی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ نیز ہندوستان میں زچاؤں کی کثرت اموات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی شادیاں قبل از وقت ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی اولاد اس وقت پیدا ہونے لگتی ہے۔ جب کہ خود ان کا جسمانی نظام بھی مکمل طور پر نشو و نما نہیں پایا ہوا ہوتا۔ بہر حال ان دونوں مسودات کا مقصد اصلاح تھا مگر

یہ قانونی صورت اختیار نہ کرسکے۔

رنگا ریڈی صاحب نے امتناع شادی نابالغان کا مسودہ پیش کیا یہ دراصل برطانوی ہند کے "قانون ازدواج اطفال کمسن" کی دوسری صورت تھی۔ اور اس قانون سے کمسن لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کو روکنا تھا۔ مگر یہ مسودہ بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ باوجود اس کے ملک کے اکثر طبقوں سے اس قانون کے نفاذ کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے چنانچہ گذشتہ ماہ خواتین حیدرآباد کی کانفرنس میں منجملہ اور تحریکات کے ایک تحریک یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ یہ کانفرنس حکومت اور پبلک کی توجہ اس واقعہ کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہے کہ اس ریاست کی خواتین گذشتہ ۰ سال سے ازدواج کمسنی کے مذموم رواج کے خلاف نہایت صبر سے متعدد طور پر صدائے احتجاج بلند کرتی رہی ہیں اور پرزور استدعا کرتی ہیں ان اپیلوں کا جو ہر گوشہ سے فوری اور پر اثر قانون سازی کی نسبت دہرائی گئیں ہیں کامل اور فوری لحاظ کیا جائے گا۔

ہندوؤں میں مذہباً اپنے گوتر میں شادی کرنا جائز نہیں۔ اس اصول کا نتیجہ یہ ہونے لگا کہ ایک خاندان مسلسل دس پندرہ پشتوں کے گذرنے کے بعد بھی اس میں شادی بیاہ نہ کرسکتا تھا۔ ایک گوتر میں شادیوں کی ممانعت کی وجہ سے شادیاں ہمیشہ غیر خاندانوں میں ہوتی رہیں۔ ابتدا میں اس خیال سے کہ لڑکیوں کی شادی غیر خاندانوں میں ہوتی ہے اور ان کے نام پر جائداد کرنے سے وہ جائداد بھی غیر خاندانوں میں چلی جاتی تھی اس وجہ سے لڑکیوں کے نام جائداد نہ کی جاتی تھیں۔ مگر بعد میں رسوم و رواج سے یہ قانون سا بن گیا۔ اور لڑکیوں کو محروم الوراثت قرار دیا گیا۔ چونکہ یہ ایک صریحاً حق تلفی تھی اور مذہباً بھی جائز نہ تھا اس وجہ سے اس خرابی کو دور کرنے کے لئے مسٹر کاشی ناتھ راؤ صاحب ویدیا نے حال ہی میں ایک مسودہ "ترمیم قانون وراثت خواتین ہنود" پیش کیا ہے جو آج کل بھی وضع قوانین میں زیر بحث ہے۔ اس کے چند دفعات حسب ذیل ہیں۔

(۱) گوتر صرف تین نسلوں تک محدود ہوگا۔

(۲) جائداد مشترکہ کی صورت میں کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی بیوی، اس کی غیر شادی شدہ یا بیوہ لڑکیاں بھی جائداد کی حق دار متصور ہوں گی۔ بھائی کی جائداد میں ماں اور غیر شادی شدہ یا بیوہ بہنوں کو حصہ ملے گا۔

(۳) اگر کوئی مشترکہ جائداد آپس میں تقسیم ہو تو بیوی کو بشرطیکہ اس کا شوہر زندہ ہو اپنے شوہر کے حصہ کا نصف ملے گا۔ اور بیٹے کی صورت میں ماں کو نصف حصہ ملے گا۔ بہن کی صورت میں بشرطیکہ اس کا بھائی زندہ ہو وہ بھائی کے حصہ کے ایک چوتھائی کی وارث تسلیم کی جائے گی۔

(۴) مشترکہ خاندانوں میں جہاں جائداد کافی ہو وہاں ایک مرد پر اپنی حسب ذیل اناث رشتہ داروں کی پرورش لازمی ہوگی

الف۔ سوتیلی ماں

ب۔ کنواری بہن کی جب تک شادی نہ ہو

(۵) حسب ذیل صورتوں میں زوجہ اپنے شوہر سے علحدہ رہنے کی حقدار تصور کی جاسکتی ہے اور اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہوگی۔

الف۔ جبکہ شوہر کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو

ب۔ جبکہ اس نے گھر میں کسی عورت کو بطور داشتہ رکھ لیا ہو۔

ج۔ جبکہ اس نے دوسری شادی کرلی ہو

د۔ جبکہ وہ اپنی زوجہ پر اس قدر سختیاں کرتا ہو کہ اس کی صحت یا جان خطرہ میں ہو یا اس کی طرف سے بے پروائی اختیار کرے۔

ھ۔ جبکہ وہ ہندو مذہب کو ترک کرچکا ہو۔

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ممالک محروسہ میں کن عمرانی قوانین کی ابھی سخت ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ ان قوانین کے نفاذ کی شدت سے ضرورت ہے جو ابھی تک ناکام ہوچکے ہیں۔ اور بالخصوص انسداد ازدواج کمسن، اور تحفظ اوقاف کے متعلقہ قوانین کا نفاذ تو ملک کی سماجی، معاشی اصلاح کے لئے ازحد ضروری ہے۔ چونکہ ان دونوں قوانین کے مسودات پیش ہوچکے ہیں اس لئے میں ان کے فوائد کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ البتہ چند امور کی جانب عوام اور پبلک کی توجہ منعطف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں مختصراً ان امور کو پیش کیا گیا ہے

سب سے پہلی چیز تو گداگری کا انسداد ہے۔ گداگری کو ایک پیشہ تصور کیا جاتا ہے چنانچہ ۱۹۳۱ء کی ممالک محروسہ سرکار عالی کی رپورٹ مردم شماری میں ایسے افراد کی تعداد جنھوں نے گداگری کو بطور پیشہ اختیار کر رکھا تھا ۱،۲۹،۹۹۵ بتائی گئی ہے۔ جن میں

۳۴۸و۶۳ عورتیں اور ۱۲۱۲و۲۶ مرد شامل ہیں۔ صرف بلدہ حیدرآباد میں ان کی تعداد ۸۰۰،۵۸ تھی۔ جس میں ۵۱ فیصدی اناث شامل ہیں۔ یہ تو صرف پیشہ ور گداگروں کی تعداد ہے اس کے علاوہ عارضی بھیک منگوں اور شریف گداگروں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ گداگری کے روک تھام کی کوشش نہ کرنا ہی خود گداگری کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔ تندرست، توانا، ریاکار فریبیوں کی امداد کرنا خیرات کرنا نہیں ہے بلکہ قوم و ملک کے اجتماعی افلاس میں اضافہ کرنا ہے۔ اور ان افراد کو ان کے حقوق سے محروم کرنا ہے جو جائز طور پر اس کے حقدار ہیں۔ انسانیت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم صرف ان لوگوں کی امداد کریں جو بے دریا، بے بس اور مجبور ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ملک میں فوراً ایک قانون انسداد گداگری نافذ کیا جائے۔ اور طاقت ور تندرست صحت مند افراد کو قطعی خیرات حاصل کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اور جو لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کریں ان کو سخت اور با مشقت قید کی سزائیں دی جائیں۔ البتہ بوڑھوں، معذوروں، اپاہجوں، اندھوں یا دوسرے ناکارہ لوگوں کی امداد حکومت اور عوام دونوں پر فرض ہے۔ اور ایسے سرکاری و غیر سرکاری ادارے قائم ہونا چاہئے جہاں اس قسم کے افراد کی پرورش و نگہداشت کا انتظام ہو۔

موجودہ زمانہ میں کارخانوں میں جہاں بڑی بڑی متحرکہ مشینیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اکثر اس قسم کے حادثات پیش آتے رہتے ہیں جن میں یا تو مزدور ہلاک ہو جاتے ہیں یا عمر بھر کے لئے بیکار اور اپاہج بن جاتے ہیں گو اس میں نہ تو مزدوروں کا کوئی قصور اور نہ کارخانہ داروں کا۔ مگر ان کے مضر نتائج غریب مزدوروں یا ان کے پس ماندگان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے

کہ برطانوی ہند کی طرح یہاں بھی "قانون معاوضہ مزدوران" کا نفاذ ہونا چاہئے۔ نیز کارخانوں میں مستقل کام کرنے والی عورتوں کو ایام زچگی سے پہلے اور بعد مع تنخواہ کے رخصت کا حق بھی ملنا ضروری ہے۔

بیمہ کے قانون میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے اور جہاں اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے وہاں عمل کرانے کی ضرورت ہے اور ادنیٰ ملازموں پر بھی اس فنڈ میں شرکت لازمی کردی جانا چاہئے کیونکہ حقیقتاً امداد کے زیادہ محتاج تو ادنیٰ طبقہ اور اس کے پس ماندگان ہی ہیں۔ البتہ ان کے لئے اقساط کی رقم کی مقدار کم کردی جائے۔

بلدہ میں قانون ضابطہ صفائی" نافذ ہے۔ جس کی رو سے ہر مالک مکان پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ بجائے سڑک یا گلی کوچے میں پھینکنے کے کسی ٹوکری یا برتن وغیرہ میں بھر کر اپنے دروازہ کے باہر رکھدے تاکہ جب بلدیہ کی بنڈی گذرے تو وہ اس کو جمع کرلے۔ نیز جب کسی مکان میں کوئی شخص کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کے اعزا کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی اطلاع عہدہ دار صفائی کو دے دیں۔ اس ضابطہ کے تحت ان اشیائے خوردنی کی فروخت ممنوع قرار دی گئی ہے

جو پرانی یا مضر صحت ہوں۔ ذبیحہ کے دو گھنٹے بعد گوشت فروخت نہ کیا جائے۔ نیز گھوڑے کا ذبیحہ اور اس کے گوشت کی فروخت کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ حفظان صحت کی خاطر اس ضابطہ کا یا اس قسم کے دوسرے ضابطوں کا نفاذ تمام اضلاع میں کیا جائے۔

ایک اور چیز کا ذکر ضروری ہے جس کی طرف ملک کے بعض ممتاز اور اہل الرائے حضرات توجہ کر رہے ہیں اس سے میری مراد کمسن بچوں کی تمباکو نوشی سے ہے۔ چنانچہ مولوی کلیم الدین صاحب انصاری بی۔ اے ایل ایل بی نے طیلسانین عثمانیہ کی پانچویں سالانہ کانفرنس کے خطبہ صدارت میں مسکرات کا بذریعہ قانون سازی انسداد کے طریقہ پر زور دیتے ہوئے کہا "کہ یکایک قانون کے ذریعہ انسداد ناممکن یا نامناسب ہو تو کم از کم اس چیز کو حکومت اپنے پروگرام میں تو شامل کرلے اور رفتہ رفتہ اس پر عمل پیرا ہو، سب سے پہلا قدم فوری طور پر یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ اسکول کے طلبا اور کم عمر بچوں کی تمباکو نوشی قانونی طور پر جرم قرار دی جائے، اور اس کے لئے ان کے سرپرستوں اور اساتذہ سے بازپرس کی جائے"۔ اس میں شک نہیں کہ تجویز بہت اچھی ہے اور ہندوستان کے بعض حصوں یا ریاستوں میں بچوں کو تمباکو نوشی سے روکنے کے لئے انجمنیں قائم ہیں۔ اس سال کے ابتدائی حصہ میں ریاست کشمیر نے اپنے یہاں اس قسم کا ایک قانون نافذ کیا ہے جس کی رو سے تیرہ سال سے کم عمر کے بچوں کو سگریٹ بیڑی یا سگار وغیرہ پینے کی ممانعت کردی گئی ہے اور ان بچوں کو یہ چیزیں فروخت بھی نہ کی جائیں گی۔ اور حکومت نے عوام اور سرکاری و غیر سرکاری ذمہ دار اصحاب سے اشتراک عمل کی درخواست کی ہے کہ وہ حکومت کی اس تجویز کو کامیاب بنانے میں ہاتھ بٹائیں میرے خیال میں ہمارے یہاں اس سے زیادہ پیچیدہ اور نازک ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ننھے ننھے سپوت' ہوٹلوں اور کافی خانوں میں جا کر ان منشیات کا استعمال کرتے ہیں جو سگرٹ اور بیڑی سے بدرجہا قیمتی اور بدرجہا زیادہ مضر صحت و اخلاق ہیں۔ کیا والدین اور اساتذہ کو اس ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ ان کی اولاد یا شاگرد ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا ہم کو ان سے بازپرس کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیا ہوٹلوں پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی کہ جس کی وجہ سے وہ ایک مقررہ عمر سے کم عمر والے بچوں کے ہاتھ ہرگز ایسی منشیات فروخت نہ کرسکیں تاکہ آئندہ نسلیں جن پر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے، جن کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور رہیگی، جو قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے ہونگے اپنے اخلاق اور صحت کو خراب کرکے ملک کے اخلاق، معاشی، معاشرتی اور سیاسی معیار کو نقصان نہ پہونچا سکیں۔

میں آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے ازراہ مہربانی اس مضمون کے سلسلہ میں ضروری مواد بہم پہونچایا۔ اور ذیل میں ان کتابوں اور مسودات کی تفصیل موجود ہے جن سے اس سلسلہ میں استفادہ کیا گیا۔

(۱) ضابطہ ملازمت سیول سرکار عالی۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ حیدرآباد دکن ۱۳۳۴ء ف
(۲) مجموعہ قوانین سرکار عالی چہار حصہ (قوانین و قواعد مع ترمیمات تا آخر ۱۳۲۲ ف) مرتبہ ونایک راؤ صاحب بیرسٹر و ولدار علی صاحب وکیل۔ دکن لاپورٹ پریس۔ جام باغ۔ حیدرآباد دکن۔
(۳) گنجینۂ قوانین مختص الامر ممالک محروسہ سرکار عالی۔ جلد اول۔ مولفہ ویریا صاحب وکیل مطبوعہ ۱۳۴۴ ف حیدرآباد
(۴) مسودہ تحفظ اوقاف۔ مرتبہ نواب اختر یار جنگ بہادر۔ مطبوعہ۔
(۵) مسودہ ترمیم وراثت قوانین ہنود۔ کاشی ناتھ راؤ صاحب ویدیا۔ غیر مطبوعہ
(۶) مسودہ ابتدائی جبری تعلیم۔ از میر اکبر علیخاں صاحب بیرسٹر غیر مطبوعہ
(۷) 〃 〃 از وامن رام چندر صاحب نایک آنجہانی مطبوعہ
(۸) مسودہ قانون آزادی مذہب۔ از میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر غیر مطبوعہ
(۹) مسودہ قانون ازدواج اہل اسلام۔ از خلیل الزماں صاحب بیرسٹر مطبوعہ
(۱۰) مسودہ قانون وراثت اشخاص ملت پارسی۔ از بشیشور ناتھ صاحب 〃
(۱۱) رپورٹ مرکزی انجمن ترک مسکرات بابت ۱۳۴۲-۴۵ ف غیر مطبوعہ
(۱۲) رپورٹ مردم شماری ممالک محروسہ سرکار عالی بابتہ ۱۹۳۱ء۔ مرتبہ مولوی غلام احمد صاحب۔ دار الطبع سرکار عالی۔

محمد احمد سبزواری بی اے (جامعہ عثمانیہ)

درسِ عمل

کب تک رہے گا موردِ آفات و صد بلا؟ — او بے عمل! ہے کچھ تری پستی کی انتہا!
پیغام ہے فنا کا تساہل کی زندگی — اک موت ہے جمود و تعطّل کی زندگی

ہے اپنی پستیوں کا بھی احساس فاقہ مست — تو خود بھی پست، اور ترا حوصلہ بھی پست
او بدنصیب! غم سے ہی تو کس لئے نڈھال؟ — کیوں ہو گئی ہی تیرے لئے زندگی وبال؟
دل سے نکال طالعِ برگشتہ کا خیال! — کر چرخ کو اسیر، ستاروں کو پائمال!
ہمت ہی گر تو ہے رہِ اک گام آسماں — پایاب ہی نظر میں تری بحرِ بیکراں!

تو اپنے بختِ خفتہ کو خود ہی جگائے جا
دنیا کو زندگی کا طریقہ سکھائے جا

ایک ایک ہو نفس، نفسِ آتشیں ترا
تڑپا دے اہلِ شوق کو نقشِ جبیں ترا

ہے شش جہت سے حسنِ عمل ہی تو جلوہ گر
دنیا ہے کارگاہِ عمل، کاہلی سے ڈر

قائم اسی کے دم سے ہیں اعیانِ ممکنات
یعنی کہ ہے عمل ہی رگِ جانِ کائنات

افتخار الدین احمد فاخر (عثمانیہ)
متعلم سال دوم

سائنس سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ

اجزاے کائنات و اشیاے عالم کی حقیقت جاننے اور ان کے تاثرات و تاثیرات معلوم کرنے کو سائنس کہتے ہیں ہمارا موجودہ علم جو ہزارہا سال کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے یقیناً انسانی مشاہدات و تجربات کا ماحصل کہلانے کا مستحق ہے قدرت کی عجوبہ کاریاں اور بوقلمونیاں جس قدر بھی انسان کے علم و ادراک میں آتی جائیں اسی قدر اس کے لئے مفید اور کارآمد ہوں گی ان کو مضرت اور نقصان سے تعبیر کرنا عظیم الشان غلطی ہے

سائنس کے مفہوم سمجھنے میں اس قدر غلطی ہوئی ہے کہ اس کے صحیح مفہوم کے ذہن نشین کرانے میں بڑی دشواری ہوتی ہے اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہمارے کچھ احباب و بزرگ تو سائنس کو مذہب اور روحانیت کے خلاف دہریت اور شیطنیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ حضرات تو مذہب کے نام پر سائنس کو گالیاں تو نہیں دیتے۔ البتہ معاشرتی، اقتصادی اور امن عام کے نقطۂ نظر سے برا سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے سائنس کا حقیقی مطلب نہیں سمجھا۔ میں نہایت آزادی کے ساتھ بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ سائنس کی مخالفت میں کوئی تقریر یا تحریر مدلل نہیں ہو سکتی۔ اس سے جتنی برائیاں منسوب کی جائیں گی وہ ہماری اور آپ کی برائیاں ہوں گی نہ کہ سائنس کی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے بجائے خوش کلامی کے گالیاں دینے کا کام لیتا ہے تو وہ خود قصوروار اور ملزم ہے نہ کہ زبان اور

اگر ایسا ہی ہے یعنی زبان ہی قصوروار ہے اور گناہ کے ارتکاب میں ہمارے قصد و ارادے کو کوئی دخل نہیں اور ہم اپنے کاموں میں عقل کے تابع نہیں تو پھر ہمارے جتنے اعضا ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کو جسم سے علٰحدہ کر دیا جائے۔

یوں سمجھنا چاہیئے کہ تہذیب و تمدن یعنی سوسائٹی ایک جسم ہے اور اس کے اعضا سائنس کے آلات ہیں۔ اگر ان سے کام لینے میں سوسائٹی غلطی کرتی ہے۔ جرائم اور خیالات مجرمانہ کی تخلیق اس کا دماغ کرتا ہے تو کیا یہ دانشمندی ہو کہ بجائے اپنی اصلاح کے اپنے ارکان تہذیب کو ڈھا دیں۔ اپنے تمدن کی بنیادوں کو مسمار کر دیں؟ میں عقل و ادراک کے نام پر اپیل کروں گا کہ ذرا اپنے دماغوں اور دلوں کو جلد فیصلہ کرنے سے باز رکھئے۔ بلکہ اپنے دل و دماغ کو تفکر اور تدبر کا موقع دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ آپ کے دماغی دار الافتاء سے سائنس کے متعلق کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں تمام برکات سائنس کو بیان کر دینا میرے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ اور میں مناسب بھی نہیں سمجھتا کہ ان ایجادات نو کا تذکرہ پھر کروں جن کے فوائد عالم آشکار ہیں۔ اور جن سے عامۃ الناس بحیثیت اجتماعی اور بحیثیت انفرادی یکساں طور پر مستفید ہو رہے ہیں۔ بلکہ آپ کی توجہات کو اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ سائنس پر بے روزگاری، مفلسی اور تباہ حالی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مشنری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے کہ اس نے مارڈالا، برباد کر دیا لوٹ لیا اور نہ معلوم کیا کیا۔ اس کے جواب کی بھی مجھے اجازت دیجئے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ سائنس نے انسانی اعمال کو بہت ہلکا کر دیا اور ایک وہ کام جس کو عظیم الشان جماعت انجام دیتی تھی اب تھوڑے سے آدمیوں کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ سائنس نے ان بیکار آدمیوں کے لئے ہزارہا قسم کے دوسرے وسائل معاش بہم پہونچا دیئے ہیں جن سے ہمارے آبا و اجداد قرون اولیٰ میں نا آشنا تھے۔ سائنس پر یہ الزام قطعاً درست نہیں یہ ترقی کا سیلاب طلسم اپنی پوری رفتار کے ساتھ بہا چلا جا رہا ہے جو ہرگز ان غلط اور قدامت پسندانہ خیالات سے نہیں رک سکتا۔ آپ خس و خاشاک کی طرح اس سے ٹکرایا کیجئے وہ آپ کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔

باخبر اور ذی ہوش انسان واقف ہیں کہ اس فلاکت و افلاس کا اصلی راز عدم ایثار، خود غرضی اور سرمایہ داری ہے۔ دولت مند اپنی دولت کو محفوظ رکھ کر اس کے اضافے کی نت نئی تدابیر سوچتے اور اختیار کرتے ہیں۔ انسانی ہمدردی، ایثار عام دلوں سے معدوم ہو گیا۔ سرمایہ داری میں مقابلہ کیا جانے لگا۔ سرمایہ داروں کی فہرست شایع ہونے لگی۔

ایک کروڑ کے سرمایہ دار کو اس بنا پر دو کروڑ کا مالک بن جانا شہرت عام کے لئے ضروری ہوا۔ کیا دولت اس لئے دی گئی ہے کہ جس شخص کے پاس چلی جائے وہ اس میں سے ایک حبّہ بھی خرچ نہ کرے۔ کیا دولت محض اس لئے ہے کہ غیر معین اوقات تک اس کو جمع ہی کیا جاتا رہے۔ دنیا بھوک بھوک پکارتی رہے اور سرمایہ دار اپنے اصلی کیش کو جو ریکارڈ کے درجہ کو پہونچ رہا ہو کم نہ ہونے دیں۔

دولت قید و بند کے لئے پیدا نہیں کی گئی ہے۔ دولت کا فلسفہ تخلیق محض گشت یعنی لین دین ہے ایک طرف سے داخل ہوا اور دوسری طرف سے نکل جائے۔ یہ طریقہ کسی دور میں ثابت نہیں ہوتا کہ دولتمندی میں مسابقت کی گئی ہو۔ لیکن آج یہ تمام معانی اپنے معکوس مفہوم میں مستعمل ہو رہے ہیں۔ اب آپ ذرا غور فرمائیے کہ جب بڑے بڑے دریاؤں کے بہاؤ کو روک کر قبضہ کرلیا جائے گا تو وہ مخلوق جو ان کے پانی سے زندگی بسر کرتی تھی کیونکر زندہ رہ سکتی ہے؟۔

ہندوستان کی مصیبت اور بے روزگاری کا سبب سائنس نہیں آلات سائنس نہیں بلکہ ہماری جہالت اور خدمات سائنس کا نقصان ہے۔ اول تو ماشاءاللہ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ہی بہت ہے۔ پھر جو کچھ تھوڑے بہت ہیں انھوں نے اپنی نظر کو اس قدر محدود اور تنگ بنا لیا ہے کہ سوائے تلاش ملازمت کے اور کسی ذریعہ معاش تک نظر ہی نہیں پہنچتی ہے کہ خاندانی پیشہ ور بھی تعلیم حاصل کر کے ملازمت کی فکر میں پڑ گئے اور انھوں نے اپنے اپنے پیشوں کو خیرباد کہہ دیا۔ کیا یورپ کا طریق کار یہی ہے؟۔ کیا امریکہ میں ایسا ہی ہوتا ہے؟ کیا جاپان کا طرز عمل یہی ہے؟ آپ جاپان کو کیوں کہتے ہیں کہ ہندوستان کے بازاروں پر قبضہ کرلیا۔ آپ اپنے اندر خود جذبۂ عمل اور ولولۂ کار کیوں نہیں پیدا کرتے؟

سائنس پر ایک اور الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے شاعرانہ احساسات اور مذہبی عقاید کو نقصان پہونچایا میں عرض کروں گا کہ اگر شاعری اور احساسات لطیف اسی کا نام ہے کہ زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جائیں۔ جذبات فاسد اور خیالات شیطانی کو برانگیختہ کیا جائے۔ تو سائنس نے جہاں تک ان کی بیخ کنی کی خوب کیا۔ ہم کو ایسے شعرا اور بیکار شاعری کی ضرورت نہیں۔ البتہ جو حقیقی شاعری ہے۔ جو ملک اور قوم کے لئے مفید ہے۔ اس میں سائنس کے اثرات نے اضافہ کردیا آپ کے یہاں حالی، اقبال اور ٹیگور اسی عصر سائنس کے پیداوار ہیں۔ اب گل و بلبل، خال و خد، سیب ذقن اور چاہ زنخداں کے تعریف کرنے والے شعرا کی ضرورت نہیں۔

مذہب اور عقائد دینیہ کی آڑ میں سائنس کو برا بتانا بھی سراسر غلط ہے حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کی ترقی سے

مذہبی لٹریچر کی اشاعت عام ہوگئی اور تبلیغ مذاہب کے بہتر سے بہتر ذرائع مہیا ہوگئے۔ رہا بے دینی اور دہریت کا سوال تو یہ چیزیں عصر ما قبل سائنس میں بھی عام تھیں پہلے بھی دہریت کا چرچا تھا اور بے دین لوگ پہلے بھی تھے۔ مذہبی عقائد سے تمسخر کرنے والوں کی پیشتر بھی کمی نہیں رہی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ غالب نے جو موجودہ دور ترقی و تمدن سے پہلے گذر چکا ہے اور جس غریب کو ترقیات سائنس کی ہوا بھی نہیں لگی کیوں تنگ اعتقادات دینی کا مذاق اڑایا اس نے کیوں کہا کہ:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اسی قسم کے اور بہت سے شواہد و نظائر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مرزا متین احمد بیگ
متعلم سال اول عثمانیہ کالج اورنگ آباد

افکارِ لطیف

(۱)

نغمۂ حیات

چاند ہے ——— اور وہ بھی چودھویں رات کا چاند! سہانی چاندنی ایسی چھٹکی ہوئی ہے جیسے چنبیلی چاروں طرف کھلی ہوئی ہو۔ نیلگوں آسمان پر چھوٹے چھوٹے ستارے نوری شعلیں لئے ماہتاب کے گرد گھوم رہے ہیں ———

فضا میں سکوت مطلق چھایا ہوا ہے پھول مائل بہ تبسم ہیں اور ان کی ادائے شگفتگی پر دلنواز نغمے نثار ہو رہے ہیں۔

یہ منظر کتنا روح افزا... ——— کس قدر جاذبِ نظر اور کیسا دل افروز ہے!!

میرا دل رنج والم سے بیگانہ ہے میں سوچتی ہوں کہ تمام کائنات خدا جانے کیوں اس وقت خاموش ہے ساری دنیا کس لئے بے خود... ... و مدہوش ہے؟ چاند کی ضیا پاش کرنیں نرگس، لالہ، چنبیلی اور بیلے پر پڑ رہی ہیں اور ان کا عکس رنگین پانی کی روانی میں حل ہو کر ایک عالمِ کیف و سرور پیدا کر رہا ہے ساری کائنات سو رہی ہے لیکن ایک میں بیدار ہوں اور ہستی کے ذرہ ذرہ سے لطف اُٹھا رہی ہوں! ——— اے میرے دل کے چاند! آ ——— مجھ سے قریب رہ کر اس قدر دور کیوں ہے مجھے اس چاندنی رات میں اپنا لطیف و شیریں نغمہ سُنا ———

اے نغمہ سنج! تو کہاں ہے! میرا دل تجھ سے ملنے کے لئے بیقرار ہے میری نگاہیں تیرے چاند سے مکھڑے کو ڈھونڈھ

رہی ہیں ... میں تیری دلربا آواز سننے کے لئے مضطرب ہوں ———

آہ ——— تیرا نغمہ کیسا جادو اثر ہے؟ تیری تانیں کس قدر شعلہ ریز ہیں؟ اے غیرت ناہید تو میرے دل سے بہت قریب ہے میں سانس لیتی ہوں تو ہر تارِ نفس سے تیری محبت کا راگ پیدا ہوتا ہے تیرے ہی گیتوں کی آواز سنائی دیتی ہے (میرا وجود سراپا رباب اور میری روح یکسر نغمہ بن جاتی ہے ———

اے موسیقی کے دیوتا! آسمان تیرے نغموں سے معمور اور زمین تیرے راگوں سے مسحور ہے تو جب کوئی راگ چھیڑتا ہے تو ستارے جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں ———

تیری تانوں کے اثر سے مہر و ماہ لرزہ براندام ہونے لگتے ہیں ۔ اے روحِ کائنات! تو نغمۂ زندگی ہے! تیرے پرکیف نغموں سے دلوں کی سوئی ہوئی دنیا جاگ پڑتی ہے مردہ آرزوئیں، بیجان تمنائیں، انگڑائیاں لے کر پیدا ہونے لگتی ہیں ———

اے نغمہ نواز! تیری موسیقی اس دنیا سے بالاتر ہے تیرے حیات افروز نغمے مردہ روحوں میں جان ڈال دیتے ہیں ... تیرے نغموں سے روح تسکین پاتی ہے تیرا نغمہ سببِ حیات ہے ؟

اے جانِ تمنا! تو فردوسِ محبت ہی تیری یاد میرے کاشانۂ دل کی تاریکیوں کے لئے شمعِ سرمدی ہے اے پیکرِ جمال! تیرا حسن دائمی اور غیر فانی ہے تیرے دلفریب نغموں سے دنیا کی فضا میں مترنم ہیں اور یہ تیرے ہی نغموں کی برق پاشیوں کا اثر ہے کہ کائنات اس طرح اضطرابِ حیات کی لہروں سے معمور ہے!!!

(۲) جب میں اداس ہوتی ہوں!

جب میں اداس ہوتی ہوں ——— اور کھیتوں میں دو گھڑی جی بہلانے کے لئے نکل جاتی ہوں، تو میں سوچتی ہوں کہ اللہ یہ دنیا کے لوگ کیونکر خوش اور شادکام ہیں، جب کہ میں اس درجہ اداس ہوتی ہوں؟

یہ ہر روز کھیتوں پر جانے والے کسان کھیتوں کی کٹائی سے فارغ ہو کر مسرت و کامرانی کے راگ گانے لگتے ہیں، میں ہر روز دیکھتی ہوں ——— کہ ہوائے جنوب کس آزادانہ بے تکلفی، کس محبوبانہ دلکشی سے حنا کی میانہ قد جھاڑیوں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہے اور اس کے ننھے ننھے شگوفوں کی خوشبو کو جنگل کی شفاف فضا میں کس طرح پھیلا دیتی ہے

یہ چھوٹی چھوٹی نازک اندام چڑیاں پھرتے ہوئے سمندروں کے سنسان ساحلوں پر بیٹھی کس جوش مسرت سے محبت کے گیت اور کامرانی کی تظمیں چیخ چیخ کر گا یا کرتی ہیں ———— !! مگر میں سوچتی ہوں کہ اے اللہ! کسی وقت مجھے بھی ایسی ہی آزادی ایسی ہی مسرت نصیب کیوں نہیں ہوتی ؟ ————

جب میں برسات کی شور انگیز صبح میں کھیت کاٹنے والی دوشیزہ کا نغمہ سنتی ہوں، یا جب کسی خاموش چاندنی رات میں اس ملاح کے نغموں کی صدائیں جو اپنی کشتی میں بیٹھا گاتا چلا جا رہا ہو میرے کانوں میں آتی ہیں، جب کسی فوجی سپاہی کے بگل کی شوخ آواز مجھے چونکا دیتی ہے تو میں اپنے بربط روح کے ہر تار میں ایک ارتعاش آمیز سکون، ایک بیقرار نجات، ایک مضطرب آسودگی محسوس کرتی ہوں اور بے تاب ہو کر فطرت سے سوال کرتی ہوں کہ آخر میں بھی اسی طرح کیوں نہیں گاتی ———— ؟

دوپہر کے دراز ہونے والے سایہ میں کس انداز سے مویشی سبز سبز گھاس چر رہے ہیں اور چرواہے، اونچے اونچے پہاڑوں کی پرسکون وادیوں میں درختوں کے گنجان سایہ میں میٹھے اپنی بانسریوں سے کیسے کیسے سریلے اور دل دکھا دینے والے راگ نکال رہے ہیں ———— !

اے معبود! میرا دل پوچھتا ہے کہ میں بھی انہیں کی طرح مسرت کا ایک گیت — اطمینان کا ایک راگ — سکون کا ایک نغمہ کسی دن کیوں نہیں گاتی ؟ ———— اور امن کا ایک طویل اور حسین خواب کیوں نہیں دیکھتی ؟

مگر فطرت میرے ان دیوانہ پن کے سوالوں کا جواب نہیں دیتی۔ وہ جواب دے ہی نہیں سکتی وہ بھی موگی میسوں کی طرح مسکراتی ہے اور میرا منہ تکتی ہے " " اور پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتی ———— میں اپنے کانوں سے اپنے دل کے دھڑکنے کی صدائیں سنتی ہوں ———— اور ———— محبت کے یہ نغمے، فطرت کے یہ راگ آہ کتنے پیارے ہیں !!!

میمونہ بیگم آہ

انگلستان میں ذرائع نقل و حمل

مسٹر محمد اقبال حسین خاں فاضل جامعہ عثمانیہ کے قدیم طالب علم ہیں ڈیڑھ سال قبل آپ محکمہ ڈاک اور ٹیلیفون کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان تشریف لے گئے تھے جہاں انھوں نے ٹپہ خانہ سے متعلق تمام شعبوں کی تفصیلی تعلیم عملی طور پر حاصل کی ہے۔ مسٹر اقبال پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے انگلستان جاکر ایسے اہم شعبہ کی تعلیم حاصل کی۔ ہائی کمشنر فار انڈیا نے آپ کی ذکاوت اور کارگذاری کی بہت ستایش کی ہے۔ واپسی کے بعد سے آپ ٹپہ خانہ سرکار عالی میں کارگذار ہیں۔ آپ کی کامیابی جامعہ عثمانیہ کے لئے قابل مبارک باد ہے۔

مدیر

پوسٹ آفس کا تصور جو عام پبلک کو ہو سکتا ہے جیسا کہ سابق پوسٹ ماسٹر جنرل لندن Sir Kingsley Wood نے بیان کیا ہے صرف اس قدر کہ "ایک خطوط رساں جو ان کے خطوط گھروں پر تقسیم کرے یا مندوبی خطوط اندازی سے ان کو جمع کرے۔ اہلکار پٹہ جو اسٹامپ فروخت کریں یا ان کے پارسل کا وزن کریں یا بینکنگ ثبت



مسٹر محمد اقبال حسین خاں (عثمانیہ)
پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے انگلستان میں محکمۂ پوسٹ آفس
اور ٹیلیفون کی عملی تعلیم پائی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

کھاتوں کے لئے رقم لیں یا واپس کریں اور بس"

لیکن وہ اس سے واقف نہیں کہ صندوق خطوط اندازی وغیرہ کے علاوہ اس محکمہ میں کس قدر اہم ترین کام انجام پاتے ہیں۔ عام طور پر پبلک پوسٹ آفس کے کاروبار سے تقریباً لاعلم رہتی ہے جب تک کہ اس کو واقف نہ کرایا جائے۔

سرکاری محکمہ جات میں صرف ٹپہ ہی ایک ایسا محکمہ ہے جس سے بالراست پبلک کا تعلق ہوتا ہے جہاں وہ رقوم کی داد و ستد کرتی ہے دوسرے معنوں میں ٹپہ ایک تجارتی سررشتہ ہے جو عوام بالخصوص تجارتی اصحاب کے اہم ضروریات کو آسان اور کمتر شرح اجرت پر کامل ذمہ داری سے تکمیل کرتا ہے۔

تمام حکومتوں کا متحدہ خیال ہے کہ ڈاک اور پولس ہی دو ایسے محکمہ جات ہیں جن سے کسی ملک کی انتہائی ترقی و حقیقی تمدن و شائستگی کا اندازہ ہو سکتا ہے سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کی شوکت و عظمت کے دو ذمہ دار جزو ٹپہ اور سکہ ہیں جس وقت میں بلڈنگ برانچ میں کام کر رہا تھا تو متعدد ایسی مسلیں دیکھنے کا موقع ملا جس میں نئے سرے سے ٹپہ خانہ جات کی تعمیر کے لئے منظوری یہ کہہ کر لی گئی تھی کہ ملک کے تمدن اور شائستگی کے مظاہرہ کا ٹپہ خانہ واحد ذمہ دار ہے جن حضرات نے انگلینڈ کے جدید تعمیر شدہ ٹپہ خانہ جات کو ملاحظہ فرمایا ہوگا وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ تجارتی مرکزوں میں ہر اعتبار سے خوبصورت پاک صاف عمارتیں ٹپہ خانہ جات کی ہیں۔

بادی النظر میں ٹپہ خانہ کے خدمات زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتے لیکن حقیقت میں دنیا کے تمام متمدن ممالک کے لئے جو بڑی بڑی تجارت گاہیں ہیں ٹپہ خانہ ایک اہم ترین محکمہ ہے۔ ذرا آپ اس وقت پر غور کریں جبکہ آپ اپنے کسی عزیز کے حالات فوری معلوم کرنا چاہیں یا انھیں اپنے حالات سے مطلع کرنا مقصود ہو یا کسی دور دراز مقام سے ذریعہ منی آرڈر رقم کا انتظار ہو یا آسان اور کافی شرح منافع پر رقم محفوظ کرانا چاہیں تو آپ کو ٹپہ کی اہمیت معلوم ہوگی سچ تو یہ ہے کہ ملک کی خوش حالی کا محکمہ ڈاک بڑی حد تک ذمہ دار ہے

فی الحال میں لندن پوسٹ آفس کے پچاس (۵۰) محکمہ جات اور نو سو (۹۰۰) صیغہ جات میں سے صرف ایک شاخ نقل و حمل (Removal Branch) کا ذکر کروں گا جس سے پوسٹ آفس لندن کے وسیع کاروبار اور اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ پبلک کا ہر فرد متمول ہو یا مفلس خوشحال

ہو یا بھکاری ٹپہ سے کس طرح مستقل فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ٹپہ خانہ سے متعلق بعض ایسے حالات بھی بیان کروں گا جس کا مطالعہ یقینی طور پر پبلک کے لئے دلچسپ ہوگا

پوسٹ آفس نے ہزارہا موٹروں کی تعداد کو گھٹانے کے لئے جو صرف لندن خاص میں ٹپہ کے کاروبار کے لئے چلائی جاتی تھیں جن کا بڑھتے ہوئے ٹرافک سے گذرتے وقت کافی وقت صرف ہوتا تھا بالخصوص جب کہ لندن کی فضا ناقابل گذر کہر (Fog) سے مکدر ہو جاتی ہے ایک خاص زمین دوز ریل کی تیاری کے لئے منتخب کمیٹی ہوز آف لارڈز منعقدہ ۱۹۱۳ء سے منظوری حاصل ہوئی جو پوسٹ آفس ریلوے کہلاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک سرنگ فی الحال ایسٹرن ڈسٹرکٹ آفس، لیورپول ریلوے اسٹیشن، کنگ ایڈورڈ جنرل پوسٹ آفس، ماؤنٹ پلیزنٹ آفس، ویسٹرن سنٹرل ڈسٹرکٹ آفس، ویسٹرن ڈسٹرکٹ آفس، ویسٹرن پارسل آفس، پیڈنگٹن ریلوے اسٹیشن کے درمیان لندن کے عظیم الشان عمارتوں کے نیچے جو کم از کم ۷۰ فٹ گہرائی میں واقع ہے بنائی گئی ہے۔ اس سرنگ کا قطر نو فٹ ہے جس میں بغیر ڈرایور اور گارڈ کے برقی قوت سے ۸۴ گاڑیاں ہر روز دوڑتی ہیں جس کا اہم کام خطوط اور پارسل کے خریطوں کو حسب متذکرہ بالا مقامات کے درمیان لانا اور لے جانا ہے۔

اس سرنگ میں گاڑی کی آمد و رفت کے لئے دو پٹریاں جدا جدا بنائی گئی ہیں۔ اسٹیشن کے قریب سرنگ دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے جس میں سے ایک ایک پٹری گذر کر ان پلیٹ فارم تک پہونچتی ہے جو اسٹیشن میں بنائے گئے ہیں۔ پلاٹ فارم کی لمبائی دو ہزار تین سو تیرہ فٹ تک ہوتی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے بغیر ڈرایور اور گارڈ کے چلنے والی اس ریل کو قابو میں رکھنے کے لئے اسٹیشن پر سوئچ کیابن (Switch Cabin) بنائے گئے ہیں جس پر صرف ایک آدمی کام کرتا ہے ہر ایک گاڑی کی لمبائی ۲۷ فٹ ہوتی ہے جس میں ۴ ڈبے لگے ہوتے ہیں۔ ہر ڈبہ میں ۱۵ خطوط کے خریطے اور ۶ پارسل کے خریطے رکھے جاسکتے ہیں۔ اس کی اوسط رفتار ۳۵ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جب یہ اسٹیشن کے قریب پہونچ جاتی ہے تو خود بخود الکٹرک قوت گھٹنے لگتی ہے یہاں تک کہ اسٹیشن پر پہونچنے سے قبل بالکل رک جاتی ہے ۔ اور پھر خود بخود حرکت کرتے ہوئے آٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پلیٹ فارم پر داخل ہوتی ہے۔ اگر اس کو اسٹیشن پر ٹھہرنا ہوتا ہے تو اٹو میاٹک برک لگ جاتے ہیں اور یہ بالکل رک جاتی ہے ورنہ جب تک یہ پلیٹ فارم سے گذرے اپنی سست رفتار قائم رکھتی ہے اور جیسے ہی اسٹیشن سے سرنگ میں داخل

ہوتی ہے دوبارہ ۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار اختیار کر لیتی ہے

خریطوں کو چڑھانے اور اتارنے کے لئے چند آدمی کام کرتے ہیں۔ سارٹنگ آفس سے اسٹیشن تک اور وہاں سے سارٹنگ آفس تک خریطوں کو منتقل کرنے کے لئے لفٹس اور (Band Conveyors) لگے ہوتے ہیں۔ سارٹنگ آفس سے جو سطح زمین پر واقع ہیں اسٹیشن تک خریطوں کو منتقل کرنے کے لئے جب (Conveyors) پر ڈال دئے جاتے ہیں تو یہ برقی قوت سے حرکت کرتا ہوا ان کو زمین دوز اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک پہونچا دیتا ہے۔ جہاں پر ان کی سارٹنگ Containers (جو صندوق نما مستطیل شئے ہے) میں کی جاتی ہے جن کو آسانی سے ڈھکیل کر ریل پر چڑھا دیتے ہیں۔ اور گاڑی دوسرے اسٹیشن کے لئے روانہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے اسٹیشن پر Containers ریل گاڑی سے جدا کئے جا کر لفٹس کے ذریعہ سارٹنگ آفس میں پہونچا دئے جاتے ہیں اگر Conveyor سے منتقل کرنا ہوتا ہے Container ایک خاص آلہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ جو خود بخود برقی قوت کے تحت حرکت کرکے Conveyor پر ان خریطوں کو انڈیل دیتا ہے۔ جو حرکت کرتے ہوئے سارٹنگ آفس میں پہونچ جاتے ہیں دنیا میں یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی ریل گاڑی ہے جو سالانہ کم از کم چالیس لاکھ (۴۰۰۰۰۰۰) پارسل کے خریطے اور پینسٹھ لاکھ (۶۵۰۰۰۰۰) خطوط کے خریطے لاتی اور لے جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اسٹور ڈپارٹمنٹ کا کثیر المقدار سامان صادر اور یونی فارم بھی اس کے ذریعہ منتقل کیا جاتا ہے۔

ڈپہ کو دور دراز مقامات تک لے جانے کے لئے پوسٹ آفس کی خاص ریل گاڑیاں ہوتی ہیں جو صرف خطوط اور پارسل کے لئے مخصوص ہوتی ہیں ان کو سفر کرنے والا ڈپہ خانہ (Travelling Post office) کہتے ہیں اس گاڑی کی خصوصیت یہ ہے کہ بجز ان بڑے مقامات کے جہاں سیکڑوں خریطے لینا اور دینا ہوتا ہے کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی مگر اس میں اس قسم کا انتظام ہوتا ہے کہ ہر اسٹیشن پر بغیر ٹھہرے یا رفتار سست کئے ڈپہ لیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس اسٹیشن کا موسومہ ڈپہ بھی دے جاتی ہے۔ اس کے ہر ایک ڈبہ کی لمبائی ۴۰ فٹ سے ۷۰ فٹ تک ہوتی ہے۔ اس میں ۱۲ سے ۱۶ ڈبے لگائے جاتے ہیں جن کا طول تقریباً (۹۶۰) نوسو ساٹھ فٹ ہوتا ہے جو دنیا میں خالص ڈپہ کی طویل ترین گاڑی ہے جس کی اوسط رفتار اسی میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

اس مختصر مضمون میں ان تفصیلات کا بیان کرنا کہ کس طرح بغیر ٹھہرے ڈپہ لیتی اور دیتی ہے ممکن نہیں۔ البتہ آپ ایک سفر کرنے والی گاڑی سے جس کا ذکر ذیل میں کروں گا اندازہ لگا سکیں گے کہ کس قدر ڈاک صرف ایک سفر کرنے والا

گاڑی لے جاتی ہے۔ لنڈن مڈلینڈ اسکاٹش ریلوے (London Mid land Scottish railway) میں ایک ڈون اوپیل (Travelling Post office) گاڑی Euston سے آبرڈین Aberdeen تک پانسو چالیس (۵۴۰) میل فاصلہ طے کرتی ہے اس میں حسب ذیل مقامات کے لئے ڈبہ لگائے جاتے ہیں۔

ایک ڈبہ لیورپول (Liverpool) کے لئے ایک منچسٹر (Manchester) کے لئے ایک پرسٹن (Preston) کے لئے ایک Stranraer کے لئے دو آبرڈین Aberdeen کے لئے ایک گلاسگو (Glasgow) کے لئے ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دو سارٹنگ ڈبے (Sorting carriages) ابرڈین کے لئے اور تین گلاسگو کے لئے لگے ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی جس وقت لنڈن سے نکلتی ہے تو اس میں کثیر التعداد خطوط اور پارسل کے خریطے بالراست خاص خاص مقامات کے لئے ان کے مخصوص ڈبوں میں روانہ کئے جاتے ہیں ان کے علاوہ سیکڑوں خریطے جو صرف اس ریل کے موسومہ ہوتے ہیں ان کی سارٹنگ۔ سارٹنگ ڈبوں میں کی جاتی ہے جب یہ کسی بڑے اسٹیشن پر ٹھیرتی ہے تو اس کا موسومہ ڈبہ فوری جدا کرلیا جاتا ہے جو سیکڑوں خریطوں سے لدا ہوتا ہے اگر کسی اور مقام کے لئے جدید ڈبہ لگانا مقصود ہو تو فوری جوڑ دیا جاتا ہے۔ اور چند سکنڈ میں گاڑی روانہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے ستر (۷۰) "سفر کرنے والے ٹپہ خانے" انگلینڈ میں ہر روز دوڑتے ہیں ان کے علاوہ بہت سے اور گاڑیوں میں جن میں مسافر بھی سفر کرتے ہیں ٹپہ روانہ کیا جاتا ہے۔

ان دونوں ریلوں کے علاوہ مختلف سائز کی چھوٹی بڑی ٹپہ کی موٹریں تمام انگلینڈ میں دوڑتی پھرتی ہیں جن کا کام صندوق خطوط اندازی سے خطوط کو جمع کرنا یا خطوط اور پارسل بھر کر سڑکوں پر تقسیم کے لئے لے جانا یا اسٹیشن سے سارٹنگ آفس تک یا وہاں سے اسٹیشن تک ٹپہ کا منتقل کرنا یا ٹیلیفون اشیا کا لانا اور لے جانا ہوتا ہے۔ ٹپہ کی موٹریں جو تمام انگلینڈ میں ۱۸ سے ۲۴ گھنٹوں تک کام کرتی ہیں گیارہ ہزار پانسو پچپن ہیں (۱۱۵۵۵) جنھوں نے صرف ۱۹۳۶ء میں بارہ کروڑ پچاس لاکھ (۱۲۵۰۰۰۰۰) میل فاصلہ طے کیا اور ان کے چلانے میں باسٹھ لاکھ پچاس ہزار (۶۲۵۰۰۰۰) گیالن پٹرول خرچ کیا گیا۔ ان موٹروں سے منتقل شدہ پارسل و خطوط کو ستر ہزار (۷۰۰۰۰) خطوط رساں تقسیم کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ ٹپہ کے ہوائی جہازوں کا جو ۱۹۳۶ء میں ایک لاکھ چھیانوے ہزار (۱۹۶۰۰۰) پونڈ پارسل اور ایک کروڑ پانچ لاکھ (۱۰۵۰۰۰۰۰) خطوط لندن سے باہر لے گئے دس ہزار بائیسکلوں، ڈھکیلنے کے گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کا ذکر ہو تو طوالت سے خالی نہ ہوگا۔

محمد اقبال حسین خاں

نقد و نظر

جامعہ جنوری سنہ ۳۸ء

قومی تخیل کی تبدیلی کے ساتھ ادبی اور علمی رجحانات بدل جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی قوم کے کسی خاص عہد کا مطالعہ کرنا چاہیں تو سب سے پہلے اس دور کے ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ہندوستان میں قومیت کا تخیل پیدا ہونے کے ساتھ ہی اردو ادب میں بھی نئی زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں اور اس کی ترقی کے لئے انفرادی اجتماعی طور پر کوششیں کی جارہی ہیں لیکن ایسے قابل فخر ادارے جو واقعی خلوص اور ایثار سے خدمت کر رہے ہوں گنتی کے چند ہیں ان اداروں میں "انجمن ترقی اردو" کے بعد سب سے ممتاز "جامعہ ملیہ" ہے جس کو خوش قسمتی سے دارالمصنفین اعظم گڈھ کی طرح نہ صرف لایق اور مخلص کارکن مل گئے بلکہ اس نے قوم کا اعتماد حاصل کرنے میں بھی کامیابی حاصل کرلی ہے جو بدقسمتی سے بہت کم اداروں اور رہنماؤں کو حاصل ہے۔ جامعہ ملیہ کے ارکان نہ صرف علوم جدیدہ سے واقف ہیں بلکہ علوم قدیم سے بھی ان کی انگلیاں زمانہ کی نبض پر ہیں اور وہ اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت بیمار کو کس قسم کا علاج اور اس کو کونسی دوا کی ضرورت ہے۔

سیاسیات کے عملی میدان سے قدرے ہٹ کر انھوں نے قومی تعلیم اور تربیت پر توجہ کی معاشیات، عمرانیات وغیرہ پر مضامین اور تصانیف کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنا ضروری سمجھا اور کوشش کر رہے ہیں کہ قوم کے اس بگڑے ہوئے مذاق کو سدھاریں جو دور تنزل میں انتہائی پستی تک پہونچ گیا تھا۔

گذشتہ چند برسوں میں جامعہ ملیہ نے نہایت بلند پایہ تصانیف ترجمے اور تالیفیں شائع کیں۔ یہ کتابیں نہ صرف علمی وادبی لحاظ سے انقلاب آفریں ہیں بلکہ اتنی دیدہ زیب چھپی ہیں کہ دیگر ناشرین کتب اپنی مطبوعات بہتر اور نفیس تر طباعت وکتابت کے ساتھ شایع کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں جس سے قوم کا جمالیاتی ذوق سدھرنے کی امید ہے۔

اس وقت جامعہ ملیہ سے تین رسالے، یعنی جامعہ پیام تعلیم اور کتب نما شایع ہو رہے ہیں۔ پیام تعلیم بچوں کے لیے بہترین رسالہ ہے، کتب نما میں اردو ادب کی نئی کتابوں پر تبصرے ہوتے ہیں اور جامعہ علمی رسالہ ہے جو کئی سال سے بہترین علمی وادبی خدمت انجام دے رہا ہے کہنے کو تو اس کے اڈیٹر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہیں لیکن اس کے ادارہ میں دیگر ارکین اور اساتذہ جامعہ بھی شامل ہیں جو اپنی بلند نظری اور اصابت رائے کے لئے ممتاز ہیں۔

گذشتہ چند سال سے جامعہ نے معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات پر خاص توجہ مبذول کی ہے اور بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جامعہ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے چوٹی کے رسائل کے صفحہ اول میں ہے۔

گذشتہ چند ماہ سے تعمیری تعلیم کی طرف ملک کی توجہ مبذول ہے اس مقصد کے لئے واردھا میں ایک جماعت ماہرین تعلیم کی غور وخوض کرنے کے لئے جمع ہوئی تھی۔ جامعہ نے اس پر خاص توجہ کی اور گذشتہ چند ماہ میں کئی بلند پایہ مضامین شائع کئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس کمیٹی کے صدر تھے انھوں نے اس موقع پر اپنے ذاتی تعلیمی تجربات پیش کئے۔ اس سے قبل موصوف ایک کتاب مشہور تعلیمی مفکر پستا لوزی اور اس کے اصول تعلیم پر شایع کر چکے ہیں اس کانفرنس میں بھی موصوف نے پستا لوزی اور گاندھی جی کے تعلیمی اصولوں میں یکسانیت کا اظہار کیا تھا لیکن بعض حلقوں میں اس کو خاص جذبات کی بنا پر پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

جنوری ۳۸ء کے جامعہ کو شذرات کے عنوان کے تحت ہندوستان ممالک غیر اور اسلامی دنیا پر تقسیم کیا ہے اس کے بعد چند بلند پایہ معاشی مضامین اور ان کے بعد رفتار عالم کے تحت اسپین برطانیہ اٹلی، جرمنی جنوبی امریکہ مصر، حجاز مراکش، سولینی اور اسلامی دنیا، چین وجاپان کی جنگ وغیرہ پر مختصر نوٹ ہیں جن کے بعد چند صفحات تعلیمی دنیا کے لئے وقف کرکے آخر میں وردھا ایجوکیشنل کی کمیٹی کی رپورٹ کا تیس صفحی ضمیمہ ہے جو علحدہ بھی ۲ ر میں مل سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ رہنمایان قوم اس ضمیمہ پر خاص طور پر غور کریں کیونکہ ہمارے تنزل اور بربادی کا ایک بڑا سبب ہمارا ناقص طریقہ تعلیم ہے

جامعہ ملیہ نے ترقی ادب کے لئے ایک اکیڈمی بھی قائم کی ہے جس کا سالانہ چندہ صرف للعہ ہے اس چندہ کے

خوش جامعہ ملیہ اسی قیمت کی کتابیں رسالہ جامعہ مفت دیتا ہے۔ اس لحاظ سے خاص طور پر علم دوست احباب کے لئے اس کی رکنیت مستحق توجہ ہے۔

ہم کارکنان جامعہ کو مبارک باد دیتے اور دعا کرتے ہیں کہ جن مفید کاموں کا سلسلہ انھوں نے شروع کیا ہے ان میں خدا انھیں کامیاب کرے۔

حیدر علی یہ ایک مختصر سا دلکش تاریخی ناول ہے جو جناب محمود بنگلوری نے کوثر پریس بنگلور سے شایع کیا ہے۔ موصوف کا نام ان کی وسیع اور بلند مرتبہ کتاب "تاریخ سلطنت خداداد میسور" کی وجہ سے اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں

ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ اتنی غلط لکھی گئی ہے کہ اسے دوبارہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک غیر جانبدار شخص ٹاڈ جیسے مورخوں کو معاف کرسکتا ہے جو خود ساختہ اور جعلی دستاویزیں پیش کر کے مختلف فرقوں کے معاشرتی تعلقات خراب ہونے کا باعث ہوئے لیکن ان ہندوستانی مورخوں کو معاف نہیں کرسکتا جو ان افسانوں کی شہرت کا باعث ہوئے بدقسمتی سے ان لوگوں میں سے اکثر کچھ تو اصلی ماخذات سے مستفید نہ ہوسکے اور کچھ اکسائے ہوئے جذبات سے برانگیختہ ہوکر تعصب اور منافرت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔

تاریخوں کے بعد افسانوں اور ناولوں کا دور آیا اور ان میں بھی انھی جذبات کو جگہ دی گئی چنانچہ اس معاملہ میں بنگالی اور مرہٹہ مصنف بہت زیادہ قابل الزام ہیں جنھوں نے دلکش الفاظ میں مسلمان سلاطین اور بیگمات کے متعلق بالکل بے بنیاد لیکن نہایت شرمناک من گھڑت افسانے پیش کئے ان افسانوں کا جادو ایسا چلا کہ لوگ انھی کو واقعات سمجھنے لگے چنانچہ آج بھی اکثر واقعات بار بار اسلامی دور کا لطیف وجمیل مرقع نہایت کریہہ لباس میں ہمارے سامنے آتا ہے جس سے قومی منافرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس قسم کے افسانوں سے جن میں کسی فرقہ کے کسی فرد کی داستان حیات بیان کی گئی ہو خصوصاً اگر اس میں اس کردار کی زندگی کا کوئی تاریک پہلو پیش کیا گیا ہو اجتناب کیا جائے۔ ہندوستانی قومیت کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے مختلف فرقے اپنے محدود نظریہ قومیت میں، جسے درحقیقت فرقہ پروری کہنا چاہئے، تبدیلی کریں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ عہد قدیم کے تہذیب و تمدن پر اسی طرح فخر کریں جس طرح قرون وسطی کے تہذیب و تمدن پر کرتے ہیں اور اسی طرح ہندوؤں کا فرض ہے کہ قرون وسطی کی اسلامی سلطنت کو اسی طرح اپنا سمجھیں جس طرح عہد قدیم کی حکومتوں کو سمجھتے ہیں۔

مصنف نے کتاب کو غالباً جاذب نظر بنانے کے لئے ناول کا نام "حیدر علی" رکھا ہے لیکن درحقیقت اس کا ہیرو حیدر علی نہیں۔ اگر اسے بدنور کی مہارانی ویراجی کی ہوس رانیوں کی داستان کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اسی سلسلہ میں حیدر علی کی ترکتازیوں، مرہٹوں اور مندروں کی زبوں حالی کا ذکر بھی آگیا ہے جو اس زمانے میں فحاشی اور عیاشی کے اڈے بن گئے تھے۔ جن واقعات پر افسانے کی بنیاد رکھی گئی ہے تاریخوں میں موجود ہیں اور مصنف نے ملک کے حالات دیکھتے ہوئے احتیاطاً دیباچہ میں اقتباسات کے ساتھ ان کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ یہ دیباچہ شاید اس لئے اور بھی ضروری تھا کہ وہ ناظرین جو تاریخ میسور سے واقف نہیں افسانے کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔

فتح بدنور کے سلسلے میں معلوم ہوتا ہے کہ لطف علی اور مرزا خاں کی داستان عشق شرر مرحوم کے ناول منصور موہنا کے پلاٹ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے اور اگرچہ کہیں کہیں زبان اور محاورے کی غلطیاں رہ گئیں ہیں لیکن اس سے افسانہ کی دلچسپی میں کمی نہیں آتی۔

کاغذ معمولی، کتابت اور طباعت صاف اور عمدہ ہے صفحات ۱۴۰ قیمت صرف ۸ر

پتہ :۔ محمد سراج الدین بک سیلر و پبلشر۔ ڈکنسن روڈ بنگلور۔ (م)

ماہنامہ سب رس

نگران ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، مدیر صاحبزادہ میر محمد علیخاں صاحب میکشؔ مہتمم خواجہ حمید الدین صاحب۔ اشتراک سالانہ چار روپیہ، بیرون حیدرآباد کے لئے چار روپیہ آٹھ آنہ۔ دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد، حیدرآباد دکن

یہ ماہنامہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا آرگن ہے جس کے جنوری اور فروری کے شمارے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ جنوری کا شمارہ مضامین کی ترتیب اور تنوع کے اعتبار سے دلچسپ ہے اور بعض مضامین نظم و نثر غور و فکر کے ساتھ پڑھے جانے کے لائق ہیں۔ سرورق چغتائی آرٹ کے ان نقوش کا رہین منت ہے جو عام طور پر نگاہوں کو تو بھلے نہیں لگتے، مگر دماغ، طویل غور و فکر کے بعد ان کی قدردانی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ فروری کے شمارہ پر جو اس رسالہ کا دوسرا پرچہ ہے، ہم قدرے تفصیل کے ساتھ تبصرہ کرتے ہیں۔

"اداریہ" سب رس کے افتتاحیہ کا عنوان ہے جو انیس بیس سطروں پر مشتمل ہے۔ اسی اداریہ کا ایک جملہ یہ ہے :۔

"اس سال اسلامک کلچر سوسائٹی نے یوم اقبال منا کر موجودہ زمانہ کے

"ایک پیام بر" اور مستقبلی شاعر کا خراج تحسین ادا کیا"

خط کشیدہ الفاظ کے چونکا دینے والے "ربط باہمی" سے قطع نظر کی جا سکتی ہے، مگر اس "مستقبلی شاعر" کو وجدان کس طرح گوارا کرے گا، "شاعر مستقبل" نہایت ہی مانوس اور فصیح لفظ پہلے ہی سے موجود ہے۔ ادارہ سب رس کو غالباً اس ترکیب میں ثقل نظر آیا۔

تبصرہ کے عنوان سے المُوسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے :۔

"اور اس میں بھی ہمیشہ کی طرح اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے :۔

"مستقبلی شاعر" کے بعد "اپنی صلاحیتوں کو پڑھکر ہم حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم ادارہ ادبیات اردو کے فاضل ارکان کی خدمات میں ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں، کہ وہ اس نوع کی عجیب و غریب ترکیبیں تراش کر اردو زبان کو "بازیچہ" نہ بنائیں، اور اپنی "اپنی صلاحیتوں" کو منظر عام پر لانے کی کوشش نہ فرمائیں۔

ادارہ کے بعد سب سے پہلے "علامہ راشد الخیری کی یاد" کو درج کیا گیا ہے، یہ مضمون صرف ایک صفحہ پر مشتمل ہے جس کا ایک حصہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے "منادی" سے لیا گیا ہے۔ اب چند سطریں جو خود مضمون نگار کی لکھی ہوئی باقی رہتی ہیں ان کا حال یہ ہے :۔

لہ "جب کہ ہماری صنف لطیف کی عام علمی سطح بام عروج"
"پر گامزن ہو کر اوہام و خرافات سے بچ رہی تھی"

ٹلہ "آج دنیائے ادب میں مصور غم کی دلآویز انشا پردازی"
"اور بہترین افسانہ نگاری کا ڈنکا بج چکا ہے"

ٹلہ "یہ امتیاز علامہ مرحوم ہی کو حاصل ہے کہ جہالت اور غیر ضروری"
"آداب زندگی میں جکڑی ہوئی افسردہ عورتوں کے لئے ہنسانے اور"
"خوش کرنے والا ذخیرہ کافی مقدار میں بہم پہونچایا۔"

طرز بیان کی اسی "سادگی اور دلآویزی سے متاثر ہو کر، ادارہ سب رس نے اس مضمون کو سب سے پہلے جگہ دی ہے۔

"فطرت" کو ہم نے کئی مرتبہ غور و خوض کے ساتھ پڑھا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ مضمون نگار آخر کیا کہنا چاہتا ہے۔

اس مضمون کا ایک جملہ یہ ہے :۔

"اس نے لکنت لیتے ہوئے دبی زبان سے کہا"

یہ پورا مضمون کوئی جدید آرٹ معلوم ہوتا ہے۔

بچوں کے صفحات میں "چار مینار" جس مضمون کا عنوان ہے، اس کی دوسری سطر کا آخری جملہ یہ ہے:۔

"جس کی تاریخ اس پریمی شہر کی

گذشتہ اور موجودہ عظمت کو ایک رشتہ میں پرو دیتی ہے"

پریمی نالبا (Lovely) کا ترجمہ ہے جو صحیح نہیں ہے۔

عربی ادب خلفائے راشدین کے عہد میں، زندگی کے مظاہر، اور ناسکیو کے سیاسی نظریات وغیرہ مضامین قابل قدر ہیں، اور "حسن و دل" اس شمارہ کا سب سے زیادہ کامیاب اور دلچسپ مضمون ہے۔

حصہ نظم میں نواب عزیز یار جنگ بہادر کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

نہ لگا ٹھوکریں ظالم نہ لگا رستے میں ‏ ‏ گر پڑا ہے دل رنجور پڑا رہنے دے

چارہ گر دیکھتا ہی ان کو اسی وزن سے ‏ ‏ دل مجروح میں ناسور پڑا رہنے دے

یہ وہی فصیح الملک داغ کے "تلمیذ رشید" نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز ہیں جنھوں نے باقیات فانی کے سیکڑوں اشعار کو "غلط، مہمل اور لغو" بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ (خط کشیدہ مصرعوں اور الفاظ پر قارئین کا وجدان بہتر طور پر تنقید کر سکے گا۔) اسی غزل کا ایک شعر ہے :۔

ہم سمجھ لیں کہ یہی ہے ترے کشتہ کا کفن ‏ ‏ پرتوے عارض پر نور پڑا رہنے دے

"پرتوے عارض" نہ معلوم شاعر کے قلم کی لغزش ہے یا کاتب صاحب کا فیض اثر۔

جس نظم کا عنوان "بیوی کی یاد میں" ہے اس کی اشاعت سے کارکنان ادارہ کا مقصد شاعر کے غم میں شریک ہو کر انسانی ہمدردی کا ثبوت دینا معلوم ہوتا ہے، یہ جذبہ بہرحال قابل قدر ہے۔

"نیا پل اور شام میں" "چغتائی آرٹ" جیسی "حسن کارانہ" کشش پائی جاتی ہے، اس نظم کا آخری شعر ہے:۔

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے کھوئی ہوئی

"میری ذات ہے کھوئی ہوئی" کا صحیح لطف کوئی "فنا فی الذات" صوفی ہی اُٹھا سکتا ہے۔

"ساون" پر ادارہ نے ایک نوٹ سپرد قلم فرماتے ہوئے اظہار خیال کیا ہے:۔

"سادگی اور پرکاری اس نظم کی خصوصیت ہے"

اس نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:۔

"سب درختوں نے ہے سبز جوبن لیا، گونجتی ہے پپیہے کی پیہو"
"دیکھ کالی گھٹا میرے سندر پیا، یاد آنے لگے تیرے گیسو"

پوری نظم اسی "صنعت سادگی و پرکاری" میں فرمائی گئی ہے، "سبز جوبن لیا" کی سادگی اور پرکاری کی صحیح داد "اچھی صلاحیتوں" والے حضرات ہی دے سکتے ہیں تشبیہات میں بھی خاص ندرت کا لحاظ رکھا گیا ہے، آنکھوں کو "دیدے" کہہ کر "روپہلی کٹوروں" سے اور پلکوں کی "چھوئی موئی" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نظم کے چوتھے بند کا پہلا مصرعہ ہے:

"چپ کے چپ کے کٹاری چلانے لگیں"

"چپکے" کے بجائے "چپ کے" "لکھنا" اردو رسم الخط کے لئے کیا عجب ہے کوئی فال نیک ہو ـــــ!

گیارہویں بند میں "موسم" کو "عالم" کے قافیہ کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ اسی نظم کے "نوٹ" کو پڑھ کر اس عجیب حقیقت کا بھی اظہار ہوا کہ جناب باہر کی نظم "ہائی سو" "علمی طبقوں" میں بہت مقبول ہوئی۔

تصاویر میں کوئی گورسرن بلی صاحب آزاد بھی اپنی ایک رباعی کے ساتھ جلوہ فرما نظر آتے ہیں۔ کارکنان سب رس غالباً شعراء کی ریسرچ (Research) فرمارہے ہیں۔

ہم آخر میں کارکنان سب رس کی ادبی کاوشوں اور علمی سرگرمیوں کا صدق دل سے اعتراف کرتے ہیں یقین ہے کہ ملک اپنے نوخیز مجلہ کا فراخدلی کے ساتھ خیر مقدم کرے گا۔ ہم سب رس کو پھولتا پھلتا دیکھنے کے متمنی ہیں۔

اُردو مسعود نمبر | اڈیٹر، مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے (علیگ) آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)

نواب مسعود جنگ سر سید راس مسعود مرحوم اُس علمی اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کے کارنامے دنیا پر آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ مسعود کے بچپن کے ابتدائی سال اُس عظیم المرتبت انسان کی آغوش میں گذرے جو عمل کے اعتبار سے سمندر کی موج اور وقار و تمکین کے لحاظ سے پہاڑ کی چٹان تھا۔ راس مسعود کو سر سید احمد خاں جیسا شفیق سرپرست ملا، کتنا خوش نصیب تھا مسعود کا بچپن! ۔۔۔۔۔ مسعود جنگ کی ذات، اپنے نامور دادا سر سید احمد خاں کے جوشِ عمل اور اپنے لایق باپ جسٹس محمود کی ذکاوت و ذہانت کا سنگم تھی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیمی دلچسپیوں میں گذرا، عثمانیہ یونیورسٹی کی محرابیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بام و در راس مسعود کے احسان سے جھکے رہیں گے مسعود جنگ کو ہم سے اُس وقت جدا ہونا پڑا، جبکہ اُن کی ہم کو بڑی ضرورت تھی۔ قوم میں مفکر اور علمی انسانوں کا قحط ہے، جانے والا، اپنا جانشین چھوڑ کر نہیں جاتا۔ افسوس کہ مسعود بھی اپنے تعلیمی تجربات اور عظمت و خودداری کو لے کر موت کی نیند سو گئے۔ اب وہ وہاں ہیں، جہاں اُن کو "مسعود جنگ" اور "سر راس مسعود" نہیں بلکہ صرف "مسعود" کی حیثیت سے دیکھا جائے گا، جہاں اُن کی ڈگریوں اور خطابات پر نہیں، بلکہ اُن کی "سیرت مسعود" اور "اعمال حسنہ" پر حصہ ملے گا ۔۔۔۔۔

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کے مشہور آرگن "اُردو" نے اسی محبوب و مسعود ہستی کی یادگار میں اپنا خاص شمارہ نکالا ہے، جس پر ہم ذیل میں تبصرہ کرتے ہیں:۔

"مسعود نمبر" کے قریب قریب تمام مضامین دلچسپ اور بلند پایہ ہیں، جن کے پڑھنے سے مسعود جنگ مرحوم کی زندگی کے بہت سے گوشے روشنی میں آجاتے ہیں۔ یہ تمام مضامین سر راس مسعود کے احباب و شناسا حضرات کے لکھے ہوئے ہیں جو سنے سنائے نہیں بلکہ تجربہ اور مشاہدات کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ "چند روز مسعود" "علی گڑھ میں سید راس مسعود کا کام" "مسعود مرحوم کی زندہ دلی" جن مضامین کے عنوانات ہیں، وہ مختلف اعتبارات سے قابل قدر ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے "زندہ دلی" پر فلسفیانہ انداز میں تبصرہ فرما کر مضمون کو بہت زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون "سر راس مسعود" اس شمارہ کی جان ہے۔ مولوی صاحب قبلہ نے آنسوؤں

کے ساتھ موتی بھی برسائے ہیں، اور یہ مضمون سیرت نگاری کا شاہکار ہے۔

اس مضمون کے آخر میں، اس مسعود مرحوم کے بعض انگریز احباب کے انگریزی مضامین ہیں، جن کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ہی دے دیا گیا ہے۔ ان مضامین سے مرحوم کی شخصیت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر ای، ای، اسپیٹ کا مضمون، ان میں سب سے بہتر اور دلچسپ ہے۔ مسعود جنگ مرحوم ہی، پروفیسر صاحب موصوف کو عثمانیہ یونیورسٹی میں لائے تھے۔ پروفیسر اسپیٹ کا یہ مضمون "احسان شناسی" کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ انگریزی مضامین کے سلسلہ میں صفحہ ۱۵۸ (اردو ترجمہ کی سطر ۵) پر جرمنی (Germany) کا ترجمہ جرمانیہ کیا گیا ہے، جس پر ہماری نگاہ نے خفیف سی ٹھوکر کھائی، عربی میں جرمنی کو "المانیہ" کہتے ہیں، غالباً اسی وزن پر "جرمانیہ" بنایا گیا ہے۔

مسعود نمبر کے مضامین نثر کے پڑھنے سے ہم کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ سر راس مسعود مرحوم، انگریزی عہدہ داروں سے کبھی جھک کر نہ ملتے تھے۔ وہ جس طرح شکل و صورت کے اعتبار سے وجیہہ تھے، اسی طرح قلب و ضمیر کے لحاظ سے خود دار اور حوصلہ مند تھے، اُن کے دل و دماغ "مغرب زدگی" کے طوفان سے متاثر نہیں ہوئے۔ راس مسعود مرحوم کی زندگی کا یہ پہلو ہندوستانی عہدہ داروں اور ذی مقدرت اصحاب کے لئے اپنے اندر عبرت و بصیرت کا درس رکھتا ہے ——— کاش! اس حقیقت پر غور کیا جائے ———!

حصہ نظم میں سب سے پہلے علامہ سر اقبال کی نظم درج کی گئی ہے۔ جس کا ابتدائی بند تو مسعود مرحوم سے متعلق ہے، باقی حصہ میں شاعر نے فلسفۂ موت و حیات بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت سے کس کو انکار ہے، لیکن یہ نظم ان کے رتبہ سے قدرے فروتر ہے۔ اقبال کی دوسری المیہ نظموں (مرثیوں) میں جو سوز و گداز پایا جاتا ہے، وہ اس نظم میں مفقود ہے، ممکن ہے دوسری نظمیں از خود کہی گئی ہوں، اور یہ نظم "فرمائش" کا نتیجہ ہو تاہم اس شعر کا حافظہ سے محو ہونا مشکل ہے :-

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمر گریز پا کیا ہے؟
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے؟

سید ہاشمی صاحب فریدآبادی کی غزل کا ایک شعر ہے :-

چشم مست ساقی کے فیض سے نگاہوں میں
بوند بوند پانی کی بادۂ معظم ہے

یہ "بادۂ معظم" "بنت العنب" کا شوہر معلوم ہوتا ہے۔

چودھری خوشی محمد صاحب ناظر اور جلیل قدوائی کی نظمیں دردانگیز ہیں ان کے پڑھنے سے طبیعت پر اثر ہوتا ہے، یہ نظمیں "مرثیہ" کی حیثیت رکھتی ہیں "فلسفہ" بن کر نہیں رہ گئیں۔

محترمی مولوی عبدالحق صاحب کی یہ کوشش یقیناً مستحق تہنیت وتحسین ہے۔ "مسعود نمبر" اپنے طرز کا واحد شمارہ ہے۔ جو عامیانہ مضامین اور سوقیانہ خیالات سے پاک وصاف ہے، جو حضرات راس مسعود مرحوم کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہشمند ہوں، وہ اس نمبر کو ضرور پڑھیں۔

نذر ولی

سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ (۹۴)
از طالبات جامعہ عثمانیہ ناشر:- ادارۂ ادبیات اردو، رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے اپنا چودھواں قابل قدر کارنامہ "نذر ولی" کے نام سے پیش کیا ہے۔ جس کی تقریب: ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یوم ولی کے حسن قبول اور اہمیت سے بحث کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان (ولی) کے کلام کی بعض خصوصیات جو اب پھر اردو شاعری میں جگہ حاصل کر رہی ہیں، اور یہ ثابت کرتی ہیں، کہ انھوں نے اس نازک دور میں، فارسی کے مقابلہ میں اردو کو بچانے کی جو سعی بلیغ کی تھی، وہ کتنی مستحکم بنیادوں پر مبنی تھی، کیونکہ آج ہندی کے مقابلہ میں اردو کو بچانے کے لئے جو تدابیر اختیار کی جارہی ہیں، اور زبان کو اصلاح کی طرف جو توجہ ہے، وہ ان ہی اصولوں پر مشتمل ہے، جن پر ولی نے عمل کیا تھا"

ولی کے زمانہ میں ریختہ اور فارسی میں نہ کوئی آویزش تھی، اور نہ اس قسم کی "مدافعت واقدام" کا کوئی تصور

جاتا تھا۔ اردو، ہندی کی موجودہ سیاسی کشمکش کو عہد ولی کے لسانی اور ادبی انقلابات سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے نہ معلوم کن "قدیم مخطوطات" سے ماخوذ ہے۔ جناب ذرا آگے چل کر ایک حقیقت ثابت کرنا فرماتے ہیں :۔

"ولی نے اردو کو تمام ہندوستان میں عام فہم بنانے کی خاطر اس کو صوبجاتی قید و بند سے آزاد کیا۔ دکنی عنصر کم کر کے شمال کے روزمرہ کو بھی شامل کر لیا"

کوئی شک نہیں کہ شمالی ہند کے روزمرہ نے دکن کی اردو میں نزاکت اور حلاوت پیدا کر دی۔ اہل دکن ولی کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتے۔ اردو کو صوبجاتی قید و بند سے آزاد کر کے مرکزیت اور ہمہ گیری پیدا کرنے کی آج بھی ضرورت ہے۔ ولی کی پاک روح اس خصوص میں اپنے اقدام کو تکمیلی شان کے ساتھ دیکھنا چاہتی ہے۔

یہ کتاب چار (۴) مضامین پر مشتمل ہے۔ جو سب کے سب جامعہ عثمانیہ کی فاضل طالبات کی نگارش جمیل کے رہین منت ہیں۔ اردو ادب میں اس نوع کی یہ پہلی کتاب شائع ہوئی ہے، "شاعری" فن لطیف ہے، جس سے صنف لطیف کو یقیناً دلچسپی ہونی چاہئے یہ کتاب اسی دلچسپی کا ایک خوش جمال مرقع ہے۔ فاضل خواتین نے اپنے اپنے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، اسلوب نگارش شگفتہ، اور قوت استدلال پُر زور ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے کے بعد، مضمون نگاروں کے تفکر و تعمق اور وسعت نظر کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے تصوف اور شاعری پر فنی انداز میں بحث کی گئی ہے، اس کو پڑھ کر محترم خواتین کی وسعت معلومات پر حیرت ہوتی ہے۔ ان مضامین کے طرز بیان میں قدرے ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے لیکن محاسن کا پلہ بہرحال بھاری ہے۔

لطیف النساء صاحبہ بی اے نے ولی کے بعض اشعار کو "حسن محبوب، چشم فسوں ساز، مژگاں، نگاہ ناز، ابروئے رنگیں، دہن نازک، لب لعلیں، زلف عنبریں، قد رعنا، خال زیبا، خط و لب، رخسار، ناز و انداز، بیان عشق اور رفتار مستانہ" کے عنوانات کے تحت پیش فرما کر کتاب کو بہت زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے ——— اردو ادبیات اردو کی ادبی سرگرمیاں بہرحال لائق توصیف ہیں۔ کاش، ملک کو ان کی صحیح طور پر قدر کرنے کی توفیق نصیب ہو۔

سرورق پر حضرت ولی کو "بابائے ریختہ" لکھا گیا ہے، اس ترکیب میں طنز و مزاح کا ایک پہلو نکلتا ہے۔ اور خلاف معانی ولی کے نام کے ساتھ مزاح و ذم کی بعید سے بعید اور خفیف سے خفیف وابستگی کو بھی ہم برداشت نہیں کر سکتے

ولی کی شاعرانہ عظمت، ہمارے خطابات و القاب کی محتاج نہیں ہے، اور اگر یہ ضرورت ناگزیر ہوگئی ہے، تو پھر اُردو ادب میں شگفتہ اور پاکیزہ ترکیبوں کی کمی نہیں ہے ہم کو امید ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو، کے فاضل ارکان اپنی ترکیب پر اصرار نہ فرمائیں گے۔

دو سو اڑتالیس صفحات کی یہ مجلد کتاب، طباعت و کتابت کے اعتبار سے بھی دیدہ زیب ہے مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد نے نہایت محنت کے ساتھ کتاب کو چھاپا ہے قیمت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

"ادارہ"

غزل

نہ ہنسانا مجھے چاہا نہ رلانا چاہا　　غم نے اک پیکرِ تصویر بنانا چاہا

حُسن بنکر ہی رہی چاکِ گریباں کی ادا　　جوشِ وحشت نے بہت عیب لگانا چاہا

کیا تماشا ہی کہ تدبیر سے عاجز ہیں ہجر　　موت نے بھی کوئی آنے کا بہانا چاہا

مجھ پہ اک اور شبِ غم یہ قیامت ٹوٹی　　مسکراتے ہوئے تاروں نے ہنسانا چاہا

دلِ محروم سا دیکھا نہیں پابندِ وفا　　جان پر کھیل کے ایمان بچانا چاہا

ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا تھا بہت　　تم نے خود میری طرف ہاتھ بڑھانا چاہا

برمحل ان کی نگاہوں میں تبسم دیکھا
ہم نے جب درد کا احساس چھپانا چاہا

کون اس عالمِ تخئیل میں رہبر تھا مرا
راہ بھولا تو مجھے کس نے بتانا چاہا

بیٹھے بٹھلائے لیا مفت کا جھگڑا زیبا
دلِ دیوانہ کو کیوں راہ پہ لانا چاہا

زیبا

وفاؔ

محمد عمر خان وفاؔ خلف نواب برق الدولہ بہادر ملک کے اُن شعراء میں سے ہیں جنہیں امتداد زمانہ نے گمنامی کا شکار بنایا ہے۔ ان کے جد امجد عمر بن عوض نواب ناصر الدولہ بہادر کے عہد حکومت میں حیدرآباد آئے۔ اولاً راجہ شیو پرشاد کی ماتحتی میں ۱۰۰ نفر عرب کی جمعداری پر تقرر ہوا۔ قومی شجاعت اور وفاداری کے مدنظر مہاراجہ چندو لعل بہادر کے دور میں اس جمعیت میں ۵۰۰ عرب کا اضافہ ہوا۔ انکے فرزند صالح خدمت جمعداری کے علاوہ خطاب (برق جنگ بہادر) سے سرفراز تھے۔ برق جنگ اول کے بعد انکے فرزند محسن بھی آبائی خدمات اور خطاب سے ممتاز رہے۔ وفاؔ انہیں برق جنگ ثانی کے فرزند ارجمند ہیں جنہیں دربار سخن سے شاعری کا خلعت عطا ہوا۔

وفاؔ کا سال ولادت ۱۲۹۸ھ ف ہے۔ کمسنی ہی سے انھوں نے اپنی اعلیٰ دماغی قوتوں اور ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت دینا شروع کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں اسلامیات کی تعلیم سے فراغت پائی۔ دسویں سال میں اردو اور فارسی میں دستگاہ حاصل کی۔ عربی گو مادری زبان تھی لیکن اسمیں بھی کافی دلچسپی لیکر کامل مہارت پیدا کرلی۔ مرہٹی اور گجراتی کا آپکو بہت شوق تھا اور اسطرف کچھ توجہ بھی کی مگر انگریزی میں مبتدی ہی رہے فارسی اور اردو میں میر بہادر علی صفیؔ سے تلمذ تھا۔ یہ غضب کے طباع اور ذہین تھے۔ طبیعت موزوں تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی

خاصی مہارت تھی۔ کم عمری میں انکی شادی کرنل افسر الملک بہادر کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جلسۂ عقد میں اتنے سہرے پڑھے گئے کہ انکا مجموعہ "ترانۂ شادی" کے نام سے شایع ہوا۔ فصاحت جنگ جلیل کے سہرے کا مقطع یہ ہے :-

بھولا میرا نوشاہ ہے نادان ہے سہرا دونوں کی جلیل آنکھوں سے لیلوئیں بلائیں

یوں تو وفا نے بچپن ہی سے شعر و شاعری کی رنگین دنیا میں قدم رکھا لیکن پندرہ سال کی عمر سے اس فن میں جو لانیاں دکھائی شروع کیں۔ دکن کے قدیم اخبار المحبوب میں ان کے علمی و ادبی مشاغل کا ذکر "دکن کے ہونہار بچے" کے عنوان سے ملتا ہے۔ تین چار سال بعد انکی غزلیں مقامی رسائل کے علاوہ بیرون ملک کے بعض اعلیٰ ادبی پرچوں میں شایع ہوتی رہیں۔ پہلی مرتبہ انکی جو غزل چھپی تھی اسکے چند شعر یہ ہیں :-

کی وفا میں نے تو یہ طرز جفا بھی آئی
دل میرا آپ پہ آیا تو ادا بھی آئی

اشک بہتے ہیں اگر دل میں جلن ہوتی ہے
درد کے ساتھ ہی دنیا میں دوا بھی آئی

تیرے آنے سے ہوئی اور ہی گلشن کی ہوا
آج اٹھلاتی ہوئی باد صبا بھی آئی

ملتے رہتے ہیں وہ ارباب وفا سے اکثر
کوئی پوچھے تو سہی قدر وفا بھی آئی

وفا کے کلام میں کہیں غالب کی چاشنی ہے تو کہیں داغ کی روانی۔ کسی جگہ امیر کا اثر کارفرما ہے تو کسی جگہ آتش کی رنگ آمیزی۔ باوجود ان اثرات کے شاعر کی انفرادیت، مخصوص رنگ اور خاص طرز بیان پورے کلام پر حاوی ہے۔ عربی انکی مادری زبان تھی اسلئے خال خال قومی استعارے ———— برق وادی ایمن، کوس لمن الملکی، شکل کلیم، صحرا نوردی قیس، ناقۂ لیلی وغیرہ نظر آتے ہیں۔

وفا عشق کی دل نوازیوں اور جذبات کی رنگینیوں کو مسحور کن انداز میں پیش کرتے ہیں۔ انکی شاعری ایک سریلا راگ ہے جس سے محبت کے نغمے نکل کر فضائے بسیط میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ انکا قلم حسن و جمال کی ہنگامہ آرائیوں اور حسن و محبت کی منتہائی گہرائیوں کی تصویریں کھینچتا ہے۔ انکا پیکر تخیل طائر بلند پرواز کی طرح عشق کے آسمان رموز تک پہنچتا ہے اور غیر فانی نقوش سامع کے صفحۂ دماغ پر مرتسم کرتا چلا جاتا ہے۔ گو مضمون حسن و عشق پامال و فرسودہ ہو چکا ہے مگر وفا کی قوت بیانیہ اور مرصع کاری مردہ مضامین میں ایسی جان ڈالدیتی

ہے کہ سننے والے کے قلب کو گرما دیتی ہے اور روح کو تڑپا دیتی ہے۔

مثلاً

ویں بھی درد عشق جگر میں بھی درد عشق — کیونکر بتاؤں یہ کہ کہاں ہے کہاں نہیں
جنت سے کم نہیں دل پُر داغ کا چمن — گلچین کا یاں گذر نہیں خوف خزاں نہیں
دیر و حرم میں گلشن و صحرا میں کوہ میں — آنکھیں جو ہوں تو یار کا جلوہ کہاں نہیں

جوشِ وحشت کا تو جب لطف ہے دستِ جنوں — ٹکڑے داماں و گریباں بھی ہوں زنجیر کیساتھ

کیا کیا ملا ہے عشق کی سرکار سے ہمیں — پر آب چشم خستہ جگر بیقرار دل
اک دل کی اصل کیا ہے محبت کے سامنے — کرتے نثار تم پہ جو ہوتے ہزار دل
گل اسطرف چمن میں کھلائے بہار نے — داغوں سے اسطرف ہے میرا لالہ زار دل

شاعر ——— نوجوان شاعر شباب کے سرشار سمندر میں جب قدم رکھتا ہے تو مستانہ لہریں اسکی نظر کو دعوت کیف دیتی ہیں اور نسیم روح افزا کے خوشگوار جھونکے اسکے تخیل کو بام عروج تک پہونچا دیتے ہیں۔ وہ عیش و نشاط اور حسن و محبت کی رومان آفریں دنیا میں جگہ پاتا ہے جہاں کا ہر فرد بہار و نور، سرور و خمار میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعر کیلئے اسکا محبوب پیکر جمیل و مجسمہ حسن و رعنائی ہے۔ وہ اسکی پرستش کا مرکز، احساسات کا جولانگاہ اور حسین خیالات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

عاشق کے قلبی کیفیات، ذہنی رجحانات اور روحانی احساسات کو احاطۂ تحریر میں لانا شاعری کا ایک نازک مقام ہے۔ مگر جس سادگی و روانی کیساتھ وہ دل کی گہرائیوں تک پہنچکر دلکش پیرائے میں اپنے تاثرات کو بیان کرگئے ہیں۔ اسی سے انکی دقتِ نظر، سلامتی طبع، جودت ذکا اور ذوق فن کا پتہ چلتا ہے۔ وفا معشوق کی تعریف میں اسطرح کھوئے جاتے ہیں ———

بارش مضمون ہے کیا کیا وصف روئے یار میں — یوں کبھی برسا نہ ہوگا ابر گوہر بار صبح
وصف گیسو گر کروں ہو جائے عالم شام کا — ذکر ہو رخ کا تو پیدا ہوں ابھی آثار صبح

تری تلوار کا سایہ عجب سایہ ہے اے قاتل — ملا آرام ایسا نیند سی طاری ہے بسمل پر

میرے صیاد کا عالم کوئی دیکھے گلستان میں　　　نظر ہے روئے گل پر کان آواز عنادل پر
اثر میرے تڑپنے کا ہوا اتنا تو قاتل پر　　　کہ تھی جب ہاتھ میں تلوار اب وہ ہاتھ ہے دل پر

معشوق کی تیغ جور و تعدی کے عاشق بسمل ہوا ہی کرتے ہیں۔ کبھی تیر نظر سے گھائل تو کبھی خنجر ادا سے زخمی ـــــ کبھی تبسم کی بجلی خرمن صبر کو آن واحد میں تباہ کرتی ہے تو کبھی نسیم التفات کے جھونکے اور جلاتے ہیں لیکن عاشق ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ اور اپنے بس کی ہر چیز ہر وقت قربان کرنے کو حاضر!

صبح کی معصوم فضاؤں میں، صبا کے دلربا جھونکوں میں، خوش گلو پرندوں کے دلفریب چہچہوں میں عاشق بے خود ہو جاتا ہے۔ ابر کی محشر آفریں چال، ساون کی مدہوش گھٹائیں، شفق کی بوقلموں سحر طرازیاں اُسے پیغام سرشاری سناتی ہیں۔ گلشن میں کلیوں کی چٹک، پھولوں کی مہک، کوئل کی کوکو، بلبل کا ترانا اسے رہ رہ کر کسی کی یاد دلاتا ہے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک میں اسکے لئے فردوس گوش اور جنت نظر کے سامان مہیا رہتے ہیں ـــــ وہ جلووں کی ضیا پاشی سے پروانہ وار کسی کے شمع حسن پر قربان ہونا چاہتا ہے جب وہ زمان و مکان کے قیود سے آزاد ـــــ داخلی کائنات کا جائزہ لیتا ہے تو داغہائے دل گل ہائے لالہ زار کی طرح درخشاں نظر آتے ہیں اور انکا ہر ذرہ مجسمہ سرور و زمزمہ اور مرقع خمار و کیف نظر آتا ہے۔

عاشق کی ناکامی، شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ اسکی نامرادی کے چرچے ایسے مشہور ہو جاتے ہیں کہ حسن و عشق کے افسانے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ جفا محبوب کا مقبول حربہ ہے۔ جو اوس سے وفا کرتا ہے وہ اوس غریب سے ہمیشہ ترش روئی، تلون اور اغماض سے کام لیتا ہے۔ اپنے چاہنے والوں سے نہ صرف بدمزاجی سے پیش آتا ہے بلکہ اسکا دل جلانیکے لئے رقیب روسیاہ کے ساتھ محبت، مروت اور دوستی سے ملتا ہے۔ فراق کے اضطراب اور کسک کو کس شاعر نے بیان نہیں کیا مگر جس ندرت سے وفاؔ ہجر کے اضطراب کو بیان کرتے ہیں اُسسے ایک عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ وفاؔ ہجر، ناکامی، رقابت اور اسی قبیل کے تاثرات کو نئے نئے لباس میں اور انتہائی شگفتہ انداز میں اسطرح پیش کرتے ہیں:۔

پامال کر دیا تیری رفتار شوخ نے　　　یوں ٹھوکروں سے دلکو نہ ظالم کچل کے چل
تم اور ترک جفا یہ خیال بھی نہ کرو　　　گذر ہی جائینگے ہر حال میں ہمارے دن

شب فراق میں یوں دل ہے مضطرب میرا
فلک پہ برق کو جسطرح اضطراب نہ ہے

گرفتاران الفت کی عجب حالت ہے فرقت میں
کبھی آہیں کبھی نالے کبھی فریاد کرتے ہیں

کون سنتا ہے شب ہجر کہانی میری
کوئی مونس ہے نہ ہمراز نہ ہمدم پیدا

کچھ اس ڈھب سے شہیدان محبت کے علم نکلے
تماشائی بھی حسرت نوحہ گر با چشم نم نکلے

کب الجھ سکتے ہیں اب سلسلۂ دہر میں ہم
دل لگا بیٹھے ہیں جب زلف گرہگیر اسکے ساتھ

چالیں یہ سب رقیب کی ہیں ورنہ کیا سبب
تیری نگاہ لطف میرے حال پر نہو

وفا کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی تھی جبکہ محسنات معنوی و لفظی کی کلام میں بھرمار تھی۔ ہر شاعر و ناشاعر انکو آزادی سے استعمال کرتا تھا۔ کلام کی خوبی زیادہ تر لفظی الٹ پھیر ترکیب و ترتیب میں سمجھی جاتی تھی۔ مگر جس زمانہ میں وفا کی ادبی نشو نما ہو رہی تھی شاعرانہ رجحانات سادگی کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اہل ذوق صنعتوں کی افراط سے کسی قدر برداشتہ خاطر ہو گئے تھے اور فطری شاعری کی طرف توجہ کر رہے تھے۔ بناوٹ تصنع، مشکل پسندی سے احتراز کیا جانے لگا۔ گرو بستان قدیم کے اساتذہ کا ذوق تغزل ارادی یا غیر ارادی طور پر پرانی ڈگر پر قایم تھا۔ لیکن جنہوں نے نئے دور میں سانس لی، پھولے اور پھلے وہ ماضی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور مستقبل کی تاریکی میں امید و بیم کی کرنوں کے متلاشی تھے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ استعارہ، کنایہ، تشبیہ وغیرہ کا مناسب استعمال شعر کی خارجی خوبیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ جب دقیق مطالب، غامض مسائل اور باریک نکات پیچیدگی پیدا کرتے ہیں تو شاعر انہی سے مدد لیکر الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھاتا ہے جس سے نہ صرف ادائے مطالب میں غیر معمولی سہولت پیدا ہوتی ہے بلکہ شعر میں برجستگی و لطافت بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ اور مثنوی میں انکا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور غزل میں کمتر۔

بعض شعرا کے کلام میں سادگی کی بجائے تصنع، روانی یا بے ساختگی کی بجائے بناوٹ، سلاست کی بجائے آرائشگی ملحوظ خاطر رہتی ہے۔ پھر معنی سے معنی آفرینی کافی گنجلک پیدا کرتی ہے۔ لیکن وفا کا کلام چند مستثنیات سے ہے اور شاید اسی لئے زیادہ دلکش اور جاذب نظر ہے۔ انکے کلام کی بڑی خوبی زبان کی صفائی اور بیان کی سلاست ہے۔

وہ حتی الامکان مناسب الفاظ سے شعر میں موسیقیت پیدا کرتے ہیں۔ انکا کلام بڑی حد تک صنایع بدایع سے پاک ہے اور معنوی خوبیوں کے ساتھ عاشقانہ رنگ میں شرابور۔

ہماری شاعری پر ردو قدح اور نکتہ چینی بڑی حد تک اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اسمیں سوائے تقلید کے کچھ نہیں۔ وہ خیالات جو زمانہ گذشتہ کے شعرا باندھ چکے ہیں ——— معشوق کی بے وفائی ——— عاشق کا پاس وفا ——— رقیب کی رقابت وغیرہ بلا کم و کاست ابتک جاری ہیں لیکن اہل ذوق اس امر سے واقف ہیں کہ حقیقی شعرا نے ان ہی خیالات کو اسطرح بیان کیا ہے کہ انمیں ندرت، جدت، اور انتہائی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ جسطرح صانع قدرت کے مظاہرات فطرت میں سے کسی دو میں خواہ وہ ایک ہی طبقہ، جنس یا خاندان سے تعلق رکھتے ہوں تطابق نظر نہیں آتا ——— اسی طرح شاعر کا تخیل بھی بعض نئے کرشمے اسطرح دکھاتا ہے کہ انمیں بہت کم تعلق نظر آتا ہے ——— مگر ایک بلند پایہ شاعر کا تصور ایسی چیزیں پیش کرتا ہے جو نہ پہلے تھیں اور نہ اب ہیں۔ چنانچہ وفا کے حسب ذیل اشعار سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے :۔

تم سلامت رہو او جان کے لینے والے
ہم بھلا موت کے کب شرمندۂ احسان ہونگے

جدت خرام ناز میں اے یار تا کجا
رکھ چھوڑ کوئی چال قیامت کے واسطے

صحرائے قیس دیکھ کے دل نے مرے کہا
کافی نہیں جگہ میری وحشت کے واسطے

نجد میں پھرتا رہا مجنون بقدر حوصلہ
میرے دیوانے کو اک عالم بیاباں چاہئے

حیدرآبادی نغموں میں وفا کا قابل لحاظ حصہ ہے۔ انکی بعض غزلیں زبان زد خاص و عام ہیں مگر بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ یہ وفا کے فکر سخن کا نتیجہ ہیں۔ دکن کی گلی کوچوں، محلسراوں اور محفلوں سے کبھی کبھی انکی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دیگی۔ انمیں سے صرف دو نمونے یہاں درج کئے جاتے ہیں :۔

وہ ستم ترا وہ میری وفا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
گلے شکوے ہوتے تھے بر ملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم سے نامہ پیام تھا کبھی ذکر غیر حرام تھا
یہ ابھی ابھی کا ہے ماجرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

غریق بحر محبت کا سن لے افسانہ
ہمیشہ زیست کی کشتی رواں رہے نہ رہے
شباب ہو گیا رخصت ہے آمد پیری
سحر کو دیکھئے یہ کارواں رہے نہ رہے

ہندوستان کی قومی تحریکات میں ادبا و شعرا کا کافی حصہ رہا ہے۔ غدر کے بعد سرسید "آزاد" حالی، شبلی و اکبر کی کاوشوں نے ہندوستانی قومیت کے جد خاکی میں برقی لہر دوڑادی۔ زمانہ حال کے شعرا اور نثر نگاروں میں حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، سلیمان ندوی، ڈاکٹر اقبال، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری اپنی ملی اور قومی جدوجہد کے باعث مشہور نام ہیں۔

وفا کی پرورش دکن کے ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو قومی اور مذہبی روایات کے اعتبار سے نہایت راسخ العقیدہ تھا۔ وہ خود بھی اپنے سینہ میں دردمند دل رکھتے تھے۔ پھر مولوی عبدالقادر اور زمان خاں کی صحبتوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اسی وجہ سے وہ کہیں خود غرض رہبران ملت پر برس پڑتے ہیں۔ کہیں ننگ قومی کا پاس دلاتے ہیں تو کہیں یورپ زدگی اور فیشن پرستی کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ قومی اور مذہبی تحریکات اور معاشرتی جلسوں سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ وہ نہایت خلیق اور ملنسار تھے۔ اخبار بینی کا بے حد ذوق تھا۔ روزنامچہ پابندی سے لکھنے کی عادت تھی۔ حلقۂ احباب گو محدود تھا لیکن ذی اثر و پرخلوص۔ اس سلسلہ میں لیاقت جنگ، نواب ماہر جنگ، نواب وزیر جنگ، نواب حامد یار جنگ، افسر جنگ نواب ممتاز یار الدولہ، محسن بن سعید، علی بن حسین اور محمد بن عیسے کے نام قابل ذکر ہیں۔

وفا کی والدہ کے قبل از وقت انتقال (۱۳۲۵ھ) نے انکی نوجوان مسرتوں پر پانی پھیر دیا۔ چند سال بعد والد کی وفات نے زندگی کے ایک پریشان کن باب کا آغاز کیا۔ اب وراثت کے جھگڑوں نے وہ سر اٹھایا کہ ۱۹ ارخورداد ۱۳۲۳ف کو ذریعہ فرمان خسروی شاہی کمیشن کا حکم صادر ہوا تاکہ تنازعات کی تحقیق اور وراثتی مسائل کی تدقیق کرے۔ مقدمہ بازی کی بھول بھلیوں کا ایک عبرت ناک اور افسوس ناک پہلو ہے کہ آج

وفا کے انتقال کے ۱۴ سال بعد بھی اس امر کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون لوگ جمعداری اور جاگیرات کے مستحق ہیں۔ ان ہی پریشانیوں کے متعلق وفا لکھتے ہیں کہ "۱۹۱۹ء میں میرے لئے بہت سی عبرتیں۔ بہت سی مصیبتیں تھیں۔ جو اس جانے والے سال کی طرح سب فنا ہو گئیں۔ اب صرف انکا احساس باقی رہگیا ہے۔ اس سال کا نصف میرے لئے تو بہت ہی نامبارک اور منحوس ثابت ہوا۔ حضرت والد مرحوم کی وفات حسرت آیات کا ناقابل برداشت صدمہ مجھے زندہ درگور کر گیا اور اس سال مجھے ایسی تکلیفیں پہونچیں جنکی تلافی قیامت تک نہیں ہو سکتی۔ الٰہی تو اپنے فضل سے آنے والی گھڑیوں اور آنے والے سال کو میرے اور میری اولاد کیلئے سبب کامرانی اور وجہ شادمانی بنا"۔

والد کا سایہ عاطفت سر سے اُٹھنے کے بعد وفا بالکل آزاد تھے۔ آزادی کا نشہ اتنا ہی خطرناک ہو سکتا ہے جتنا کہ مفید ——— مگر خصوصاً ایک نوجوان شاعر کے لئے انتہائی دلکش اور بے باک!

شباب، شعر اور شراب کے امتزاج نے وفا کو وہ بنا دیا جسکی کسی کو توقع نہ تھی ——— اور شاید یہ نہوتے تو حافظ کا دیوان اور خیام کی رباعیات بھی نہ ہوتیں۔ ساغر و مینا کے متعلق خود وفا کی زبان سے خمریات کا لطف دوبالا ہوتا ہے:———

اب تو دے مئے کی اجازت اے شیخ ۔۔۔ دیکھ رحمت کی گھٹا چھائی ہے

خدا وہ دن بھی دکھائے کہ اے فصل بہار ۔۔۔ بساط عیش ہو ساقی رہے شراب رہے

اُمنگیں جوش زن ہیں جلد بھر دے جام و پیمانہ ۔۔۔ رہے آباد ساقی حشر تک یہ تیرا مینخانہ

بہار آئی ہے جلسے ہو رہے ہیں بادہ خواروں میں ۔۔۔ کرم ساقی کا ہو مدت سے ہوں اُمیدواروں میں

وفا کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ وہ جلد سنبھل گئے۔ ماحول کی پابندیاں، والد مرحوم کی دیرینہ تربیت اور ذاتی جوہر نے آخر غلبہ پا یا۔ جب نشہ ہرن ہوئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ زمانہ کئی کروٹیں بدل چکا

بعض خود غرض احباب کی جھوٹی محبت کے دعوے، وراثت کے جھگڑے اور معاشی مشکلات نے انکی آنکھیں کھول دیں۔ اب انکے لئے سوائے اسکے کچھ نہ تھا کہ مبدائے فیض کی طرف خشوع و خضوع کے ساتھ رجوع ہوں۔ یہاں انہیں وہ اطمینان حاصل ہوا اور ایسی آسودگی نصیب ہوئی کہ دنیا کی نعمتیں اور لذائذ ہیچ نظر آنے لگے۔ سرکار مدینہ کی یاد، بیابان مدینہ میں آبلہ پائی کی خواہش، روضۂ نبوی پر پروانہ وار قربان ہونے کی حسرت —— یہ وہ جذبات تھے جو وفا کے دل میں موجزن تھے۔ مداحیہ اور نعتیہ اشعار و قصائد کی فراوانی ہونے لگی۔ افسوس کہ زمانہ نے وفا نہ کی۔ آخر دم تک انہوں نے اپنی حرمان نصیبی کو سکون نما اضطراب میں چھپائے رکھا۔ مگر مقدس تمناؤں کے یہ شاعرانہ مرقع ادبیات کا سرمایہ بنے رہیں گے۔ ——

اک عمر سے یارب ہوں میں بیمار مدینہ   اب جلد دکھا دے مجھے گلزار مدینہ
جاؤنگا سر و چشم سے جب یاد کرینگے   آقا مرے مولیٰ مرے سرکار مدینہ
دم بھر میں گداؤں کو بنا دیتے ہیں سلطان   سلطانوں کے سلطان ہے سلطان مدینہ
یہ سیر کبھی آنکھوں سے دکھا دو مرے مولیٰ   ہو صبح وطن شام غریبان مدینہ
ہر دم ہو مری آبلہ پائی کی تراوش   سیراب رہیں خار بیابان مدینہ

نبی کے جلوۂ عارض کی ہو یوں جلوہ فرمائی   مری بزم تصور ہو مرا دل شمع محفل ہو

منور کیوں نہ ہو جلوے سے تیرے اپنا غمخانہ   برنگ شمع روشن دلمیں ہے داغ الم تیرا
ترے گھر کے ہزاروں نام ہیں اور تو مکین تنہا   کلیسہ، صومعہ، بیت الحرم، بیت الصنم تیرا
نہیں ہے انتہا دونوں کی دونوں حد سے بیحد ہیں   گنہ میرے تری بخشش مرے عصیان کرم تیرا

زندگی کے تلخ حقایق، بڑھتی ہوئی خوش اعتقادی، پاکیزہ مذاق نے وفا کے کلام میں سوز و گداز، مستانہ و رندانہ پن اور صوفیانہ رنگ بخشا۔ وہ اس عالم آب و گل کی ہر ایک شئے کو اب باطن کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ انکی نظر چیزوں کی سطح پر نہیں بلکہ انکی اندرونی ماہیت پر پڑتی ہے۔ وفا شوق وصال کی تحصیل کی

خاطر روح کو بدن کو خیرباد کرنے کا پیغام دیتے ہیں اور اس غیر فانی مسرت سے لطف اندوز ہونے کیلئے وہ ایسے سکوت کے طالب ہیں جسپر شور و غوغا نثار! زندگی کے مسحور کن خواب سے بیدار ہونے اور عمر رواں کا زاد راہ مہیا کرنیکی وہ لوگوں کو پُر درد الفاظ میں تلقین کرتے ہیں۔ کلی کے نور، گل کے خمار، غنچہ کے سکوت اور مصنوعات فطرت کے نقش و نگار میں انہیں ایک بہار و کیف، سرور و زمزمہ، سرشاری و تجلی محسوس ہوتی ہے۔ صنمکدہ، مے خانہ، خانقاہ، مندر و مسجد انکے لئے ایک ہیں ——— فنا و بقا کی پابندیاں ——— ہستی و نیستی کی تفریق ——— مضحکہ خیز!! فرماتے ہیں:—

شوق وصال کا یہ تقاضہ ہے بار بار　　　اے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدنکو چھوڑ

خواب غفلت سے اٹھا سر چھوڑ دے طول عمل　　　کوچ کا سامان کر عمر رواں کچھ بھی نہیں

صنمکدے کے جو جلوے مری نگاہ میں ہیں　　　نہ وہ حرم میں ہیں زاہد نہ خانقاہ میں ہیں

اک خدائی کا تماشہ نظر آیا اسمیں　　　سیر جو وادیٔ دل میں ہے گلستاں میں نہیں

مرنیکے بعد نام و نشان سے مفاد کیا　　　روح مزار کیا ہے نشان مزار ہیچ

افسوس کہ وفا کی عمر نے وفا نہ کی۔ صرف ۳۵ سال کا سن تھا کہ ۱۳۳۳ف میں یہ ہونہار شاعر دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔

محمد بن عمر بی۔ اے (عثمانیہ)

مئے عرفاں

حریم عقل میں مستی نہیں صہبائے بیداری
شرابِ بیخودی پی ہے اگر جویائے بیداری

یہ فردوسِ تخیل جس سے دل بہلا رہا ہے تو
سرابِ آرزو ہی دیکھ دھوکا کھا رہا ہے تو

جنھیں تو بے خبر سمجھا ہے سرشارِ محبت ہیں
یہ دیوانے نہیں ہیں محرمِ رازِ حقیقت ہیں

فریبِ حسن بینش ہی جسے تو ہوش سمجھا ہے
تری نامحرمی نے نیش کو بھی نوش سمجھا ہے

اُٹھا ذرا اوہام کے پردوں کو ناداں چاک کرتا جا
یہ داغِ نارسی ہیں ان سے دل کو پاک کرتا جا

یہ نادانی کہاں تک اکتسابِ معرفت کرلے
بہت تھوڑی ہے تیری عمر فکرِ عاقبت کرلے

پیامِ بیخودی ہر ذرہ دنیا کو سناتا ہے ؛
نگاہوں کو ہجومِ رنگ و بو بیخود بناتا ہے

رہیگا یہ غم و اندیشہ سود و زیاں کب تک ؟ تجھے ملنا ہی اک دن خاک میں ہے حفظِ جاں کبتک ؟

غلط یہ آسماں سے شکوۂ بیداد ہے ناداں؟

تو اپنی نارسی کی زد میں خود برباد ہے ناداں!!

متاعِ عمرِ فانی، گنجِ حکمت سے نہیں بڑھکر جنونِ شوق ہے حسنِ خرد سے بھی کہیں بڑھکر

مقامِ شوق میں انسان خود کو بھول جاتا ہی جب آنکھیں بند ہوتی ہیں یہاں تب ہوش آتا ہی

جو مستِ ہوش ہیں وہ لوگ مدہوشی کو کیا سمجھیں؟ خودی میں جو مگن ہیں خود فراموشی کو کیا سمجھیں؟

شرابِ بیخودی کے جام پی کیسے غمِ دوراں

وہ زندہ ہے جو ہی ناآشنائے تلخیٔ دوراں

خواجہ معین الدین جمیل (عثمانیہ)
متعلم سال دوم

سہ ماہی رپورٹ کارگذاری انجمن اتحاد
۹ ستمبر تا ۹ دسمبر ۳۸ء

انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کا جائزہ ۹ ستمبر ۳۸ء مطابق ۹ آبان ۱۳۴۶ف کو حاصل کیا گیا۔ جائزہ سے اس وقت تک اپنی تقریباً تین ماہ کے دوران میں انجمن اتحاد کی جو کچھ مصروفیات رہیں اس کا مختصر سا خاکہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

ہماری کابینہ کا سب سے اہم نصب العین طلباء برادری کو انجمن سے قریب سے قریب تر کر دینا تھا۔ اس سلسلے میں ہماری کوشش برابر جاری ہے اور طلبا کی اکثریت انجمن اتحاد سے گہری دلچسپی کا ثبوت دے رہی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں ہم نے باقاعدہ انجمن اتحاد کے تقریری جلسے منعقد کرنے کی کوشش کی چند ہی ہفتے تعطیلات کے باعث ایسے گذرے جن میں مباحثے منعقد نہ ہو سکے۔ اس وقت تک ۵ معمولی اور ۸ غیر معمولی جلسے ہو چکے ہیں۔ غیر معمولی جلسوں میں بابا صاحب کا پڑوے سابق وزیر تعلیمات صوبہ متوسط و برار اور مسٹر ڈیوس سالٹر رکن وفد نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی تقاریر بھی شامل ہیں۔ انجمن کے معمولی و غیر معمولی تقاریری جلسوں کے علاوہ دو کاروباری اور ایک تعزیتی جلسہ بھی انجمن کی طرف سے اس عرصہ میں منعقد کیا گیا۔ اس طرح اب تک انجمن کے جملہ عام جلسوں کی تعداد ۱۳ ہوتی ہے۔ ہمیں اس امر کا اظہار کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ ہماری برادری نے انجمن کی مصروفیات

اور سرگرمی میں کافی دلچسپی کا ثبوت دیا اور جلسوں میں کثیر تعداد میں شریک ہو کر ان کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے رہے ہماری کابینہ کی دوسری کامیاب سعی محترم اساتذہ اور طلباء جامعہ کے تعلقات میں ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کرنے کی رہی۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے محترم اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر ابونصر اقبال صاحب قریشی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب مولوی سلطان الدین صاحب مولوی ہارون خانصاحب شروانی۔ ڈاکٹر مظفرالدین صاحب قریشی اور ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کے شکرگذار ہیں کہ ان حضرات نے اپنی مصروفیات کے باوجود ہماری اس تمنا کو عملی جامہ پہنانے میں بڑی مدد فرمائی۔

یہ سال ہائے گذشتہ کے مقابلہ میں اس وجہ سے ممتاز خیال کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے پروفیسر حضرات نے تین ماہ کے قلیل عرصہ ہی میں کئی مرتبہ انجمن اتحاد کے پلیٹ فارم پر تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور سال کے بقیہ پروگرام میں آئندہ بھی ایسے کثیر مواقع کا امکان ہے کہ ہمیں قابل اساتذہ کا تعاون انجمن کے معاملات میں حاصل رہے گا۔ جامعہ کے طلباء قدیم و طلباء حال کے خوشگوار تعلقات کی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ اس علمی برادری میں خلوص بڑھانے کی مختلف تدبیریں ہماری کابینہ کے زیر غور ہیں۔ ان میں سے ایک ایسے مخلوط مباحثہ کی اسکیم بھی ہے جس میں جامعہ کے قدیم طلبہ حصہ لیں گے اس کے علاوہ یوم جامعہ کے سلسلہ میں اس سال بعض ایسی مصروفیات کا اضافہ بھی زیر غور تھا جو اس قدیم برادری کو کہ بظاہر جامعہ سے علحدہ ہو جاتی ہے لیکن اصل معنوں میں کبھی بھی علحدہ نہیں ہوسکتی۔ مادر جامعہ کے آغوش سے قریب تر کردیا جائے۔

انجمن کے تقریری جلسوں کا نظام نامہ شایع ہو چکا ہے۔ اور اس کی سختی کے ساتھ پابندی کی جارہی ہے۔

مباحثی جماعتیں اس سال نظام کالج کے جشن طلائی کے موقع پر اردو انگریزی مقابلے منعقد کئے گئے تھے ہماری مباحثی جماعتوں نے بھی ان میں شرکت کی اور اردو تقریری مقابلہ میں اول آنے کے صلہ میں سالار جنگ رولنگ کپ کے مستحق قرار دی گئی۔ اس کے علاوہ اردو مباحثی جماعتوں نے جناب احمد خانصاحب سال سوم جناب ابوعلی خانصاحب سال سوم۔ محمد عمر صاحب مہاجر سال چہارم اور انگریزی میں جناب پدمنا بھ چاری متعلم ایم۔اے انفرادی انعامات کے مستحق قرار پائے۔

کھیل ان مصروفیات اور امتیازی کاموں کے ساتھ ساتھ اندرون خانہ کئی قسم کے کھیلوں کا حسب سابق معقول انتظام کیا گیا تھا تعلیمی مصروفیت اور دماغی محنت کے بعد برادران جامعہ جب انجمن تشریف لاتے ہیں تو ان کے لئے سب سے زیادہ مفرح جگہ کھیل کے کمرے ہوتے ہیں طلبا کی ایک بہت ہی کثیر تعداد انجمنوں کے کھیل سے مستفید ہو رہی ہے۔

اس وقت انجمن میں پنگ پانگ - فنگر بلیرڈ - شطرنج - ڈرافٹس اور اسی قسم کے بعض دلچسپ کھیلوں کا باقاعدہ انتظام ہے

انجمن کا کتب خانہ بہ نسبت سالہائے ماسبق انجمن کے کتب خانے نے بھی اس سال اعلیٰ کارکردگی کا ایک نہایت ہی نظر افروز نمونہ پیش کیا ہے۔ اب تک ۴۰ کتب حصہ انگریزی اور ۱۲۵ کتب حصہ اردو میں اضافہ کی جاچکی ہیں۔ اور تقریباً اس سے دگنی کتب خرید کر اضافہ کی جانے والی ہیں۔ کتب خانہ سے تقریباً ۲۰۰ برادران جامعہ مستفید ہو رہے ہیں۔ دارالمطالعہ میں آنے والے روزانہ اخبارات و رسائل کی فہرست حسب ذیل ہے۔

اردو اخبارات و رسائل :- رہبر دکن - پیام - مدینہ - جامعہ - نگار - ہمایوں - کیم - شاہکار

انگریزی اخبارات و رسائل :- ہندو - بمبئی کرانیکل - ورلڈ ریویو - اسکیٹر - پنچ - جان لنڈن - انڈین ایکانیمسٹ - انڈین ریویو - اسٹیٹس مین نیشن - نائنٹین سنچوری - دی مانچسٹر گارڈین -

انجمن کی عمارت ہم اپنے نائب معین امیر جامعہ قاضی محمد حسین صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے انجمن کی موجودہ جگہ کو بالکل ناکافی محسوس فرماتے ہوئے قدیم کمروں کے متصل مزید دو کمروں کا انتظام فرما کر انجمن سے اپنی علمی دلچسپی کا ثبوت بہم پہونچایا - ہم اپنے محبوب نائب معین امیر کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ ان کے دو کمروں سے انجمن کی مشکلات میں بہت کچھ کمی ہوگئی کیا عجب کہ ہمارے محترم سرپرست کی مزید توجہ سے انجمن کی یہ شکایت بالکل رفع ہو جائے۔

ملازمین انجمن اس سال انجمن کے ملازموں میں ایک چپراسی اور ایک اہلکار کا اضافہ کیا گیا۔ مدت سے کتب خانے کے لئے ایک علٰحدہ چپراسی کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی اس کے علاوہ ایک ہمہ وقتی کلرک کی موجودگی دفتر کی تنظیم کے لئے ناگزیر تھی - ان دونوں نئے ملازمین کی تنخواہ بھی انجمن کے بجٹ سے دی جاتی ہے۔

مجلس انتظامی مجلس انتظامی اس دوران میں پوری پوری تیزی سے مصروف عمل رہی چنانچہ اس وقت تک ۱۲ انتظامی جلسے ہو چکے ہیں۔

بجٹ اس وقت تک انجمن کے بجٹ سے مفصلہ ذیل رقوم متذکرہ مدات سے خرچ ہوئی ہیں۔

(۱) انتظام دفتر سے خرچ " " " " " ماعہ ۱۱ر

(۲) صادر و طباعت " " " " " ۵ر۶پ

(۳) کتب خانہ " " " " " ۱۰ر ۱پ

(۴) کھیل	۲ر ۵
(۵) متفرقات	۲ر ۵
	۲ر ۱۰ ۱/۲
جملہ خرچ تین ماہ کا	۱۰ر ۱/۲

شکریہ

آخر میں میں تمام اراکین کابینہ۔ صدر انجمن۔ مولوی وحید الرحمن صاحب خازن اعزازی و نائب معین امیر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی دلچسپی کی وجہ سے انجمن نہایت گرمجوشی کے ساتھ مصروف عمل رہی۔ مجھے پورا پورا وثوق ہے کہ آئندہ بھی ان تمام حضرات کی ہمدردیاں انجمن کے ساتھ ہوں گی میں مولوی محمد بن عمر عفا صدر انجمن کا خاص طور پر ممنون ہوں۔ اگر صاحب موصوف کی عملی دلچسپی میری معاون نہ ہوتی تو میں اس رپورٹ کے پیش کرنے کے قابل نہ ہوتا۔

ابو الخیر صدیقی معتمد انجمن



Mr. M. Y. SALEEM, B. A., (Osman)

Managing Editor and Editor of Urdu Section.

scientific learning that has ever appeared in India. It is a great honour for any institution or government to entertain forty-two Fellows of the Royal Society on one day. We were also greatly privileged to hear Sir Arthur Eddington and Sir James Jeans. The other events, a little dimmed perhaps by the splendour of the first, were the All-India Economic Congress and the Road Congress. The former was especially of interest to the University and it is with satisfaction that we record that Hyderabad economists played a great part in the discussions.

College News.

The present year has been one of great importance in the history of the University. Our degrees have been recognised by three English Universities, Oxford, Cambridge and London. This should be a source of satisfaction to all members of the University and we shall be interested to see whether it has any influence on the attitude of other Indian universities.

We offer our hearty congratulations to Moulvi Abdul Haq and Mrs. Sarojini Naidu upon whom Allahabad University conferred its honorary degree of LL. D. during its jubilee celebrations. We are particularly gratified at this recognition of Moulvi Abdul Haq's services to Urdu scholarship. We have just learnt that Dr. Raziuddin Siddiqi had been awarded the Education Minister's Gold Medal for the best paper contributed to the journal of Academic Science, Allahabad, during this year. We hasten to offer our congratulations.

At its last convocation the University conferred honorary doctorates upon four eminent persons Maharajah Sir Kishen Pershad, Sir Tej Bahadur Sapru, Sir Mohammed Iqbal and Dr. Rabindranath Tagore. In honouring them, the University honoured itself.

This year has been almost unique in the number of opportunities it has given us of meeting distinguished personalities from outside the State. The visit to Hyderabad of the delegation of the British Association to the All India Science Congress brought into our midst the greatest body of

I may illustrate this truth in this way; two persons fall in love with each other and each imagines, nay more than imagines, feels deeply to the inmost core of his or her being that other would remain for ever and ever the same attractive, charming and obliging person—a beauty that will be a joy for ever. Of course all married people know that this is not in reality the case, that change overtakes sooner or later, generally much sooner than imagined, and not always for the better. And yet at the time of falling in love, this idea of possible change, though intellectually it may be perceived as a fact or rather a possibility, is not and cannot be felt as a reality, but the feeling and the entire soul's reaction ***at the time*** and for the time being proceeds on the the basis of eternal youth, and eternal beauty. Waves echo the ocean; moments reflect eternity.

Ir has been well said that man proceeds to acquire wealth as though he will never know old age and death. This Illusion of Eternity, granting that it is not an objective fact, is a very powerful and abiding factor in our life. I wonder if it is an intimation of immortality, akin to those famous and profound intimations, of which Wordsworth sang in one of the sublimest of English Odes and in the moving little piece so touching in its pathos and simplicity "We are Seven". It seems to me that here is a positive approach based on felt experience, felt not merely by isolated individuals but by widest commonalty, to ideas of God and Immortality. The cultivation of this sense of God and Immortality is the highest inspiration that human nature is capable of and the firmest support in all its trials and tribulations. May this sense be an abiding and growing regulation of your lives, and may you all conduct yourselves and act as Immortals in the hands of the almighty.

C. R. Reddy,
Hon. D. Litt., M.L.C.

and new situations are adequately faced. Enthusiasm which cannot survive the impact of facts and the test of realities is mere froth which betrays shallowness of the soul. You must have heard of the strike fever, which seems to have seized some of the students in British India. I trust guidance by teachers and parents will not suffer impairment in this Dominion as it has to some extent in the provinces outside. A sense of modesty is more often a truer sign of profundity than assertiveness and dogmatism. Socrates was called wise, because he claimed that he was only a lover of wisdom and not its possessor like the Sophists. Owing to this very modest manner in which he rated his own deep knowledge and wisdom, he has been elevated to the throne of Philosophy. Nor like the Athenians be volatile and lovers of change for its own sake. Those who grow from within, as a result of their felt needs and experiences and struggles, change more slowly than imitators of foreign fashions and the latest developments of Europe. A love of novelties and hollow echoing of other people's latest revolutions in the economic or political field, ignoring the fact that these revolutions are the products of ***their*** history and ***their*** conditions, does not bespeak a sure aptitude for real enduring progress or its safe foundation.

The felt presence of the Eternal is the most sustaining power for righteous conduct. It is not necessary to have recourse to supernatural arguments to prove that such a felt presence is a positive fact of life.

The great Philosopher Spinoza taught us to conceive things ***Sub-species eternatatis.*** He was a Pantheist like the Adwaitees of the Hindu fold and the Sufis of Muslim. Whether this Eternal is an objective fact or not, a little reflection will show that it is an almost permanent subjective feeling, a form of perception, as the Philosopher Kant would have put it, and therefore, at any rate, a fact for us.

field where no contentions are possible and in which harmony and identity of interest so naturally prevail. How that may be achieved is a problem to be solved, but I do not despair of a solution. We must re-unite the broken threads of history and restore unity of spirit. To mention a possible instance, if in the matter of Sanskrit and Telugu publications to be brought out by the Dominion Government, the agency of the Andhra is invoked, it will be readily accepted as a duty and honour.

Graduates and students. I heartily congratulate you on the degrees you have obtained, which mark, I beleive, a high standard of real and practical knowledge, for which you ought to feel deeply devoted to the munificent patronage of His Exalted Highness. I hope going through a college and graduating will not fill you with an undue sense of self-importance. Reverence to your elders is a quality which you cannot dispense with so easily or so soon in your careers. As an English writer of great power has put it, "remember thou art a chicken just hatched with the shell still on thy head", the shell I suppose being represented by the Academic cap. Life's sterner trials are ahead of you and they cannot be faced without a serious course of apprenticeship in the school of experience and under persons of ripe wisdom. Even politics to be an useful pursuit cannot dispense with the necessity of apprenticeship. Alexander the Great is credited with the saying "for my physical life I am indebted to my father but for my spiritual to my teacher". I wonder if that sense of reverence for the teacher is as strong today as it should be and as it has been traditionally amongst us. "It is not enough that you have gone through a college" as Mr. Chapin put it. It is more to the purpose "if a college has been through you" *i.e.*, if you have acquired not merely knowledge but the disciplined faculties by which new discoveries and inventions are made

Members, rich in literary qualities and more attractive to the general reader and the regular students than translations however good can ever be. Then will Urdu reach the fruition of its potentialities as a medium of modern education, and in reaching that status enable all the sister languages of India, by example and helping hand, to reach equal heights of value and importance.

There are certain fields of modern scientific research—pure and applied—which are in my opinion possible only for the Osmania University to organize in view of the heavy finances involved. Only the generous and enlightened Government of His Exalted Highness can find the moneys required and the moral enthusiasm. For instance a laboratory for Atomic Physics. If such institutes are established the Osmania University will even now and immediately become an All-India attraction to researchers in science and applied science, the Nalanda of modern scientific culture. When we realise how discoveries in Agriculture and applied Chemistry have redounded to the fabulous prosperity of Western countries and how the field of developments in this direction is by no means exhausted and nature still calls for exploitation, the contribution that the Dominion can make to the cultural standing and the material progress of the country appears to be boundless in its magnitude.

I would like to say one word before passing on to address the graduates more directly. It is not enough that the Dominion should cast an eye of kindly favour, love and benevolence on the Andhra University. Even unions of hearts and the grace of love has to be institutionalised in marriage as otherwise it would work havoc on society. So also the present gracious contact between His Exalted Highness' Dominion and the Andhra Desa will have to be given an institutional form in the cultural field—the one

college buildings known to India and memorable triumphs of Indian architecture—are designed with Akbar-esque imagination in a Hindu-Muslim style, being an original and impressive combination of the Saracenic and the Ajanta models. They are a visual demonstration of what could be achieved by a happy blend of the two civilizations.

I seem to be carrying coals to Newcastle. Yesterday at a lunch I suggested that Hyderabad should do pioneer work in another field by establishing a Domestic Science College of University grade teaching upto B.Sc., B.Sc., (Honours) and the M.Sc. standards. I was informed by Miss Pope and the Vice-Chancellor that they had already a fully drawn up scheme which has been approved by the Faculty. If this College on really uptodate lines is established, it will be a big institution, most useful and also of scientific and cultural value and the only one of its kind in India.

Ancient books deserve no less attention than ancient monuments. In 1927 I organized an expedition of Pandits for collection of Telugu manuscripts in the Dominion and within a short time they brought back over 600 Palmirah-leaf books. Whereas in the case of an ancient monument people have to go to the locality where it is situated to enjoy the sight, the books can go where the people are and their reach is larger and more facile. I am happy to be able to say that Government have already thought of this and are considering measures for organizing publications of this kind.

The Translation Bureau of the Osmania University has already developed into a general publications department. Your Pro-Vice-Chancellor is fully alive to the need of bringing out original treatises embodying the lectures delivered and the researches conducted. In a few years there will be books impregnated with the personality of the Faculty,

There is one point which I have for years felt to be one of the defects of Indian administration in general. Women's progress and women's needs have not received the attention due. Their education, general as well as special, such as Domestic Sciences and Arts, the extensive organization of separate hospitals for women and children and a widespread system of Women's Technical Schools for teaching, child-welfare and hygiene, first-aid, values of foods, scientific cooking, dressmaking, laundry, music and painting; and in the higher collegiate grades of education, Sciences and application of Sciences required to make the home efficient, all these must be organised; and I would even recommend the organization of a special department for these purposes. Unless for a half century at least such a department is organized to function, the necessary motives and pressure for providing funds and promoting these measures will not be forthcoming.

In pride and fullness of heart as an Educationist I beg to congratulate the Sovereign, the Government and the Dominion on the success achieved by the Osmania University. The band of young, accomplished and enthusiastic teachers composing the different faculties are a team which the greatest Educationist in India would be proud to captain. The researches accomplished and going on and the investigations in the theoretical and applied fields of Science including Zoology, Physics, Chemistry and Civil Engineering and History augur not merely an All-India but an international future for the Osmania. To be the first to recognize an Indian language as a fit medium for University culture and to have made the University founded on that principle a centre of modern research, these are the accomplishments for which India must be eternally grateful to the Dominion.

It is a matter for profound national gratification that the grand buildings of the Osmania University—the grandest

which not merely Hyderabad but the entire country could take legitimate pride. As an Andhra, I may be permitted to rejoice specially in the fact that its location bears a Telugu name "Adhika Metta" meaning the supreme height, whilst the capital of the Dominion itself is in the Telingana; and we Andhras are proud that we are the location for all the metropolitan activities of this great Dominion.

The chief credit for the organisation of the Osmania University on lines of courageous originality belongs, if I may recall a historical fact within my personal knowledge, to my Right Hon'ble friend Sir Akbar Hydari and I trust that it won't be regarded as a sign of vanity and that most incurable of all vanities—senile vanity—if I recall how I was consulted by Mr. Hydari as he then was, frequently during the inception of the scheme and more especially in regard to making Urdu the medium of instruction, which I strongly supported. I remember the pride that Mr. Hydari took in the Translation Department which he instituted and the way he used to draw my attention to the various publications, and how I on my part felt that whatever was possible in Urdu today would be equally possible in Hindi, Telugu and every other Indian language the very next day and that therefore the Osmania University was making no local but an All-India contribution of the highest and most fundamental value to our culture. I have no doubt that this originality of outlook, breathing faith and confidence in the future of Indian languages and culture, well actuate and is actuating the various departments organized here and that research and creative activities will in consequence find memorable illustration.

The way in which this University is fostered by His Exalted Highness and the Government should be an object lesson to every person and to every Government in India.

people also, whatever their creed and mother-tongue, whether Andhras or Mahrattas or Muslims, should take a patriotic pride in the Dominion and see to it that its integrity and historic personality are maintained and promoted. I would want the people of this Dominion bound in mutual love and in common loyalty to His Exalted Highness to promote the economic prosperity and the cultural advancement of the State and to become, in finer measure than now, a voice in their own right, which will carry its message of hope to all India and evoke echoes of admiration from the world outside.

The Dominion has a great mission to fulfil in justice to its own history as well as the future of India. It is the custodian of the Moghul tradition of Hindu-Muslim Unity and their partnership in the secular field of citizenship. The greatest safeguard of a constitution is not its form, but the identity of interest between the Rulers and the Ruled and their devotion to the good of the State and its progress and strength, for a progress which does not increase the strength of the race is no progress but a disease leading to decay and degeneration. The mirror of Hyderabad must reflect the light of Akbar the Great all over India.

Already through the Archaeological Department the Dominion has done sublime service to ancient Art and Sculpture and has acquired an international status as a guardian of Indian culture.

I expect Hyderabad to be a firm promoter of University education in all its Departments. It is to me as to all Educationists a matter of the deepest gratification that the Osmania University, which has struck an independent line of its own and has added a new note of impressive grandeur to our system of University education, has been a success, in

posts in the Golconda State. One of them was Gopanna, the immortal Ramdas of Bhadrachellam fame. Even today visitors to Golconda are shown a particular room in the Fort as having been the scene of the imprisonment of Ramdas for having embezzled State moneys in order to beautify the temple at Bhadrachellam and decorate the holy images with costly jewellery. The legend has it that Rama and Lakshmana appeared before Tana Shah in the guise of the messengers of Ramdas and paid him the moneys due, and that Tana Shah, realising afterwards the Divinities in human form that had appeared before him, blessed his good fortune and praised the Almighty in ecstatic joy for the great favour shown to him - an instance of how closely Hindus and Muslims began to blend into one spiritual shape. And Tana Shah's name has passed into the large receptive catalogue of Hindu veneration.

To have become in ever increasing measure the confluence or Holy Sangam of Hindu-Muslim civilization must serve as an inspiration for greater achievements in the future and I have no doubt that the present policy of His Exalted Highness and his Government under the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari is steadily and broad-mindedly marching towards that unity of the dissevered soul of India, which is our goal.

It is now, as I said before, almost exactly 30 years since I first visited Hyderabad as the guest of Mr. Hydari. Impressive as Hyderabad then was, it has beaten the most optimistic anticipations of progress by the achievement of the succeeding years. Today from every point of view, Hyderabad is in the van of substantial moral and material progress in India and may be regarded as one of its Flag-bearing States. But the increasing association of the people with the Government must be pursued steadily and the

synthesis. Pothuluri Veerabrahmam, who caught the Islamic spirit of Monotheism and its social democracy, fiercely denounced caste among the Hindus—"What caste shall I describe myself as belonging to, to these worldly men and fools? My caste is co-extensive with Universe." The Mahal at Chandragiri situated about 40 miles from my native place of Chittoor, reveals the influence of Muhammadan architecture. I am told that the corridor of Ibrahim II's tomb at Bijapur is essentially Hindu in style.

Addanki Gangadhara Kavi dedicated his ***Tapati Samvarana Upakyanam*** to Ibrahim Kutubshah of Golconda and, in his description of the Court of Ibrahim, he refers not merely to the ambassadors of the Gajapathi and Narapathi Monarchs, but to the Poets versed in the eight languages and to the Pandits who were authorities in the Vedas, Sastras and Puranas. Ibrahim becomes in Telugu ***Mulk Ibha Ram*** and he is described as being very fond of listening to the Epics and Legends of Hindu India. It is of peculiar interest to note that the first poem written in ***pure*** Telugu, without any admixture of Sanskrit or derivatives from Sanskrit, namely ***Yayati Charitra***, is dedicated by its author Ponniganti Telganna to Amir Khan, an officer of Ibrahim Kutubshah. Malla Reddy, the famous poet and author of "***Shad Chakravarthi Charitra,***" described himself as having visited the Court of Ibrahim Mulk by invitation, and in a laudatory verse compares him to the moon at which the dogs keep braying, meaning rival poets and kings, a verse the spirit of which is more commendable than its poetry.

Akkanna and Madanna are famous names in Dakkani history. They were the Prime Minister and Commander-in-Chief respectively of Tana Shah, the last of the Golconda Sultans. Akkanna's three nephews occupied responsible

co-operation and fraternity. It is a racy product rooted in our soil and deriving its sustenance from that Hindu-Muslim Unity conceived and promoted by Moghul Emperors, like Akbar the Great. The history of Hyderabad is one in which Hindus and Muslims could take equal pride. Hindus have occupied very high places in the administration of the Dominion, both Civil and Military. The armies that fought for its integrity were largely composed of Hindus and more especially, if I may be permitted to say it, Andhras and Reddies. Hindu temples have received full protection and patronage and it is general knowledge that some of the Nizams paid devotion to Hindu Sanyasis as to their own holy men.

The Dominion occupies the heart of India. It is from certain points of view the heart of India, something higher than a mere geographical centre. It has evolved a new civilization, which might properly be called Dakkani civilization, and in later years His Exalted Highness' Government have spent enormous amounts for the preservation of the glorious Buddhist vestiges and sovereign triumphs of art, which are the wonder of the world,—Ajanta and Ellora, rock-out temples decorated with the most delicately drawn frescoes inside, the rock-cutting typifying the strength of giants and the engineering skill of supermen and the frescoes the infinite and delicate grace of the Divine feminine in human civilization.

In tracing the lineaments of this Dakkani civilization, symbolic of what the heart of India would have achieved had it not suffered arrest and diversion, I may be permitted to mentian the special affinities between the Muslims and the Andhras. Architecture and Art took a synthetic turn and even religion did not escape this process of this higher

Waltair, described with what enthusiasm their benevolence has been received by the Andhra public. I venture to think that this generous guardianship, grounded in the ethnical affinities binding the Dominion and the Desa, will be found to be well deserved. I have no doubt that it is based on His Exalted Highness' deep sympathy with the Andhras who form the majority of his loyal subjects. And it is only as a token of that sympathy and its expression that I have been called to be here today.

Hyderabad occupies a most important place in the cultural, the social and the political history of India more especially in relation to the Andhra people. Until the fickle fortune of history brought about the separation, the Ceded Districts and the Northern Circars were a part of this Dominion; and if they had continued to be still a part, Hyderabad would have been almost completely and at any rate in majestic predominance an Andhra State. Eeven today Telingana forms a major portion of the Dominion and the Andhras the majority of the citizens owing devoted and loyal allegiance to His Exalted Highness. The sources of the Andhra history are now within your frontiers. Warangal was the capital of Kakatiya dynasty and it was the watershed from which three streams of history have flown, the great Empire of Vijianagar, the Reddy Kingdom of Kondivedu and Rajahmundry, and the Velema States. In literary history Warangal remains immortal as the scene of the great poet Pothanna's translation of the Bhagwat Purana.

Hyderabad has justified its pride of premier position by the progress it has achieved. It is not a mere imitation of the British Raj or other Western models. It is a Swadeshi product—constitutional Khaddar if you like, woven by Indian hands, fashioned by Indian History and Indian genius, and shot with the colours and glory of Hindu-Muslim

first visited this Capital as the guest of Mr. Hydari as he then was. Having filled myself with the social and cultural delights of this Metropolis, I refilled the cup no less than four times subsequently and every visit enabled me to watch with pride and gratitude the progress that the Dominion has been continuously making. Thanks to the consideration shown by His Exalted Highness and the authorities of the University, I am enabled once again to renew the hearty friendships of old, including those which have their source in my Baroda days and which have been of peculiar and most intimate value in my life. I am thankful that in the evening of my life I have been enabled to occupy this colourful scene.

I beg to convey the cordial greetings of the Andhra University, over which I preside, to the Osmania University which bids fair to become, in a much shorter time than perhaps people anticipate, one of the great centres of learning and research in our country. I shall always treasure the memory of the warm welcome given to me on my arrival by my noble colleague Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, the Pro-Vice-Chancellor and Members of the Osmania Faculties, who, by their cordial reception, however undeserving the particular individual might have been, have shown how alive here the traditions of academic brotherhood are and how actual the idea of a republic of letters is. An Academic fraternity, which knows no creed or community, is no negligible light in a world in which the mists still hang thick and persistent.

The Andhra University is under a deep debt of gratitude to His Exalted Highness, the greatest patron of learning inside and outside the State, and his Government for the practical interest they are taking in its welfare and prosperity. I have already in my Convocation Address at

Convocation Address

Mr. CHANCELLOR, Mr. VICE-CHANCELLOR, GRADUATES, LADIES AND GENTLEMEN:

My first duty is to tender my deep dutiful obligations to His Exalted Highness the Nizam for the gracious consideration shown to me which has enabled me to associate myself with this festival of degrees. I am specially beholden also to my Right Hon'ble friend Sir Akbar Hydari and to the Vice-Chancellor Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur for the honour of this invitation to me which they had initiated. Before I proceed further, I would like to be permitted to offer my most respectful compliments and congratulations to Maharaja Sir Kishen Pershad, the grand seigneur of Indian Statesmanship, on the honorary degree which he has just received at the hands of the University. The Maharaja Bahadur, one of the finest embodiments of our historic culture, was a notable figure and Prime Minister as early as my Cambridge days and the span of time that has succeeded has but enhanced his fine reputation and raised him to a higher pinnacle than ever amongst the illustrious men of our country. Let me also congratulate the poets Rabindranath Tagore and Sir Mahomed Iqbal and the statesman Sir Tej Bahadur Sapru on the recognition accorded to them on this occasion of their pre-eminent standing in the country.

If I am here today, I do not flatter myself that it is due to my individual standing or merit; I am here as Andhra Vice-Chancellor. It is not that I have no personal associations with Hyderabad. It is almost exactly 30 years since I

positive programme of reconstruction with the central aim of increasing production and raising the standard of living. This cannot be done in a haphazard manner; it requires careful study and diligent enquiry into local conditions, and in this difficult task, it will be the duty and privilege of economists to give wholehearted support.

India is at a critical stage in her history. By the long operation of an unsound economic system, the resources of the country remain undeveloped, and large sections of the common people are immersed in poverty and misery. They are no longer in a state of pathetic content; under various influences there has been a popular awakening and great expectations have been roused by the introduction of provincial autonomy and the assumption of government by a party which is noted for its rugged idealism. There is a tide in the affairs of nations as well as of men. If we do not seriously tackle our economic ills at this juncture, great discontent and worse consequences may follow. But if the eleven provincial Governments and the larger States to-day make an earnest effort at rebuilding our economic system on sound lines, the popular awakening may be directed into constructive channels and this country may soon be on the way to solid economic progress. Let it be remembered that any rise in the standard of living of the masses in India will not only increase the economic welfare of a fifth of the human race but will also contribute substantially to the well-being of the world as a whole.

P. J. Thomas,

M.A., B.Litt., D.Phil. (Oxon),

us. We have to rebuild our economic system without destroying the foundations. What Russia sought to do and did in a monstrous way we must do in a peaceful manner. It is for us economists to show the way. If we fail, the masses may be misled by interested propagandists.

There are no short-cuts to economic prosperity. Many people believe that India's purchasing power could be raised overnight by a slight change in the exchange ratio. Countries in desperate plight have been driven to a devaluation of their currencies as a last resort, but the consequences they reaped were not all that they desired. It is chimerical to expect that, in the peculiar rural conditions of India, a slight change in the exchange ratio would raise prices, and that even if prices rise the advantage thereof would reach the ultimate producer without hitting him and the country. In dull times it is desirable to give a push to economic activity, but this can be done more effectively and less injuriously by a carefully devised public works programme. To raise prices somehow is not our aim; recent experience shows that attempts at artificially raising prices may do more harm than good. The causes as well as the effects of changes in the pricelevel are so obscure that the greatest caution is needed in tampering with it. This must be borne in mind by people who seek to raise prices by currency manipulation.

The economic rebuilding of India to-day rests lergely with the provincial Governments and the Durbars of Indian States. They have nearly all the powers needed to remove the maladjustments which keep purchasing power and standard of living at a low ebb. They have already started on the campaign for debt relief and agrarian reform. It is expected that after removing the obstacles which now stand in the way of economic progress they will commence a

United States or New Zealand; because, in my opinion, the social, economic and political conditions of this country are not such as to call for, or facilitate the carrying out of, any such plan. Greater social solidarity, a more complete economic unification, stable political conditions and above all a more solid national character are needed if any such plan is to be put through. We have to go slowly; ours is an uphill task.

Nor can the continuance of ***laissez-faire*** in the economic sphere be justified. International liberalism is recommended as the way out of the present ***impasse*** by a neo-Liberal school of economists, but such a system cannot work until some international authority arises to locate industries and apportion markets in an equitable manner. In the meantime, we need a rgulated economy, which would eliminate the wastes and rectify the inequities inevitable under individualism. The Keynesian approach is of some practical value in solving our economic problem, but even that only shows the way to maintain full employment irrespective of the trend of the trade cycle. Ours is a different problem, and the environment is also different. We have to create employment in a land where under-employment has been normal and to give new purchasing power to classes that never had it. Economic progress has to be worked up in a land where an unjust economic system has led to stagnation. The problem is very complex, and economic theory as evolved in the West can only give us a very general guidance. Therefore we have to develop an economic synthesis of our own, and this work to-day challenges our subtlest brains.

It is true that in the field of currency and exchange considerable help can be obtained from Western theory and experience for shaping policy in India, but this plays only a minor (although necessary) part in the great task before

will also offer a steady market to the products of Western industries. It is true that the imports of ordinary consumption goods have lately fallen much, but the large increase in capital goods will greatly make up the loss. The rapid rise in recent years in the imports (*inter alia*) of machinery and mill-work—which now takes the first place—is significant and ought largely to allay the fears of Western industrialists about the consequences of Eastern industrial development. Nor is this increase temporary; for with every increase in industrial production in India, there will be a greater demand here for capital goods, both quantitatively and qualitatively. With a rise in the standard of living, there will be a great increase in the demand for high-grade consumption goods also. Thus, eastern industrialization may have beneficial repercussions on Western industry at a time when its local markets are stationary or shrinking. Some of the leading Western industrialists have realized this. Henry Ford was asked at a dinner what in his opinion was the way to a stable world recovery. He took his pencil and wrote on the table-cloth the numbers '160', '350', '400', meaning thereby the potential purchasing power of the vast populations of Russia, India and China. Had this been more fully realized, benevolent trusts like the Rockefeller and the Carnegie might have spent more money on the economic improvement of India.

10. The Prospect.

I have tried to show that the low level of economic welfare in India is due to a persistent under-production which has kept down the standard of living, and that production can only be increased along with an improvement in distribution. For this, a complete rebuilding of our economic edifice is necessary. I do not recommend a Gosplan, not even a sectional plan like that lately carried out in the

times. In 1798, Robert Malthus alarmed England by expounding the 'revolting ratios' of population and food supply, but when he was forging his theory, England was forging ahead with a technical efficiency the like of which had never been known before, and in spite of his gloomy forebodings, England came to maintain a rapidly growing population on a rising standard of comfort. India's position to-day is in many ways like that of England in the time of Malthus. Industrial production has started, but there is still much misery and a low standard of living, and many are alarmed at the growth of population. The first advances in economic development are the slowest, but once the foundations are laid, the pace will quicken. Population has lately been increasing fast, but "a growing population with growing resources represents a growing market".[10] India's greatest wealth to-day is its large population, and our duty is not to control births, but to increase the health and productive efficiency of our population and thus utilize our labour force fully, so that the mass standard of living may be raised and along with it the economic welfare of the nation.[11] When productive activity quickens, India's large population will be found to be a great asset. It is significant that the largest increases in population to-day are taking place in Russia, Japan and India. With a substantial rise in the standard of living, the rate of population increase is bound to slow down, as has lately happened in the West. Therefore those who want a smaller population in India would do well to concentrate on the all-important task of raising the standard of living.

When India's purchasing power rises, our growing population will not only be a boon to our home industry, but

10. Dr. T. E. Gregory, in Hubbard's *Eastern Industrialization and its effects on the West* p. 365.

11. See my paper 'Is India Overpopulated'? *New Review*, March and April 1936.

a balance between agriculture and industry in order that we may avoid some of the evils rampant in industrial countries. Secondly, our agriculture itself must be a balanced one. That is to say, the diversified cropping which is already a feature of our agricultural economy must be maintained intact and wherever possible there must be a balance between food-crops and other crops. In America, where crop-specialization has been pushed to extremes, a diversification of crops is now sought as a bulwark against slumps. Thirdly, there must be a balance between the different industries so far as possible. The production of an article like cotton cloth or sugar need not be concentrated in one province or area. The indiscriminate springing up of factories must not be permitted ; recent tendencies in the Indian sugar industry clearly point to the need for State regulation. The location, size and labour conditions of new factories must be prescribed carefully in the national interest. It would be disastrous to leave industry to the play of unbridled individualism. When protective tariffs are imposed, the State must see that the conditions of production and employment are such as to increase the purchasing power of the primary producers and labouring classes. Otherwise, industrial production might lead to more evil than good. In all these matters, careful co-ordination by the State is essential.

9. The Menace of Growing Population?

Considering the economic trends in the West, India's large population and its recent increase need not cause alarm to us or to other countries. After the Industrial Revolution, population increased rapidly in the West; and although not immediately, an increase in the ***per capita*** standard of living also followed. Between 1801 and 1901, the population of England and Wales rose from 8.8 millions to 32.5 millions, but production and national income increased many more

of our cotton, 53 per cent of our jute and 49 per cent of our linseed are exported, but even these cover only 7 per cent of the area, and a good deal more of these commodities will be used up at home when productive activity in this country quickens. Our position is therefore comparatively strong and it is essential that we should maintain this position intact by regulating our production mainly according to internal requirements. In the past, India set too much store on external trade, and this involved a comparative neglect of internal trade. This was disapproved by economists like Ranade in the last century, but the lure of overseas markets was too powerful to resist. Now that this demand is slowing down, it is time we reshape our whole commercial policy. No doubt external trade must still be our anxious concern, but our productive energy must in future be directed more with reference to internal needs and requirements. Absolute self-sufficiency is not a suitable goal for any nation, not even for a subcontinent like India with all her varied resources. We have to pay our dues abroad by means of our export trade, and even if these diminish, we shall need various goods from outside and we must exchange them for the produce of our labour. The present reckless drive for self-sufficiency will not only weaken world economy but may undermine the foundations of civilized economic life.

India must aviod both the extremes. In other words, we must have a co-ordinated economic system within the country so that we may not be hit when foreign trade fails. Firstly, there must be a balance between industrial and agricultural production. The extreme dependence on agriculture must cease and a larger proportion of people than the present 10.2 per cent must be able to draw their sustenance from industrial occupations. Not only in the whole country but in every province and even district, there must be

At this juncture, India's interest lies in safeguarding her trade with a few steady markets and in developing the internal demand. In order that we may have secure markets, we must (1) improve the quality of our produce by adopting better methods of production and processing, (2) modernise our marketing methods, and (3) enter into trade agreements with our principal customers. It is worth our while, in particular, to secure an increasing hold over the markets in Great Britain (which has been our steadiest market) and the Dominions (whose future possibilities are great). However, a sub-continent like India will always have to depend largely on internal demand. In future, this dependence may unavoidably become more complete, and fortunately, India has a large potential market within the country. Our population is already large and has lately begun to increase rather fast. Our internal market can be greatly extended by increasing the purchasing power of the masses on the lines suggested above.

8. *A More Balanced Economy.*

In view of the tendencies just described, it must be considered fortunate that, unlike some other primary producing countries (*e.g.* Java, Australia), India has not evolved a productive system too dependent on external markets. In the 19th century, a growing demand arose for our primary products, and a large increase in the production of rice, wheat, cotton, jute, and oilseeds took place. But fortunately no part of the country has specialized in the production entirely of export staples; in almost every area there is a wise mingling of food crops with 'cash' crops. Nearly all our cereals, pulses and sugar are consumed at home—and these crops cover 82 per cent of the total cultivated area. The crops raised chiefly for export are tea (84 per cent), coffee (58 per cent) and rubber (82 per cent) but they occupy less than ½ per cent of the total area. It is true that 59 per cent

day this is being threatened by the growing practice of bulk-handling and the more extended use of paper bags in place of the gunny. India is to-day the largest grower of tea, but its culture has lately been spreading apace and Russia now threatens to flood the world with cheap tea. The chief outlet for our raw cotton is Japan, but that country is trying to make itself independent of Indian cotton. Recent developments abroad have weakened the position of India's cotton and this has already caused some anxiety. Further, India's competitive position among primary producers is not strong, due partly to our high production costs and partly to our neglect of quality. These tendencies are not such as to encourage optimism about the future of India as a producer for the world market.

The declining trend of population in Western Europe is another feature which ought to cause some concern. Till lately, "the rising tide of general consumption supported by increasing population and improving standards of living in the rest of the world always came along to float the producer's ship off the shoals of temporary maladjustments".[9] But now that population is fast declining and autarchy becoming rampant, demand in Western countries for food and raw materials is bound to slow down, and world trade may become stagnant. The population of Western Europe increased rapidly in the last century, when production was also growing fast; but lately the tendencies have changed and a large decline is expected in the coming decades. Therefore, in every way, the prospects of a growth in our exports to Western markets are far from bright.

9. Sir George Schuster's Sir George Birdwood Memorial Lectures (*Royal Society of Arts*. March 1935).

Departments of Agriculture Industries and Co-operation are useful in giving technical advice, but for carrying out the policy in the districts there is no better agency than the District Officer and his assistants. With this purpose in view, the recruits to the civil services must be given a more specialized training than is now provided. The shaping of the general economic policy must be done by the Federal and Provincial governments under the advice of competent general staffs. With such an organisation functioning in the country, economic progress can be quickened and efficiency can be secured without the adoption of totalitarian principles.

7. *India's Policy in regard to Foreign Trade.*

If internal requirements call for an active economic policy, even more pressing is the call from external circumstances. Foremost among these is the persistent tendency to economic nationalism and the drive towards economic self-sufficiency, which to-day are narrowing the scope for India's export trade. Industrial countries in the West are straining every nerve to grow their own foodstuffs and raw materials, partly as a measure of defence and partly with a view to restoring a balance in foreign trade. France which formerly imported much wheat is to-day able to export wheat. Italy and Germany are struggling hard to produce at home synthetic substitutes for various raw materials, and the ablest scientists have been employed by their Governments to achieve this object. India is one of the foremost amomg the world's primary producers, and raw materials form the mainstay of her export trade. In the last century, indigo was one of our chief export staples; it has disappeared owing to the German invention of artificial dyes. Lac-dye and safflower also met with a similar fate. In other cases, rival products are narrowing down our monopoly. Jute has been a valued monopoly of India; to-

> " Agriculture is not merely a way of making money by raising crops ; it is not merely an industry or a business ; it is essentially a public function or service performed by private individuals for the care and use of the land in national interest, and farmers in the course of their pursuit of a living and private profit are the custodians of the basis of the national life."

In India, agriculture is not pursued as a business for making money but is the only way of living available to illiterate persons, and therefore if our agriculturists are to fulfil their high public duty, their business must be placed on an economic footing and must give them ample sustenance. This must be the State's immediate task in this country.

A carefully co-ordinated administrative organisation is necessary for carrying out such an active economic policy. The unit of the reconstructed economic life must be the village, or a group of villages. The village school, the co-operative society and the panchayat must become the three pillars of the reformed rural life. Over a wider area will operate the land mortgage bank. As an improvement in the standard of living is our prime need, the co-operative society must be the pivotal institution and must engage itself in the many-sided activities connected with rural uplift. For discharging such responsible duties, a full-time rural guide is necessary in every village, or at least in a group of villages, and men with initiative and character must be carefully selected and trained for this purpose. There are now various departments interested in rural uplift; a more co-ordinated policy and unified direction are needed if rural uplift is to proceed rapidly. In the present circumstances this is only possible if the District Officer and his assistants are charged with rural welfare as their principal duty. The

the unwary of their rights. Laws were later made to protect the debtor from usurious moneylending, but such laws are easily evaded. Co-operative societies were established for the same purpose, but their mode of working did not suit the habits of the agriculturists, and rural credit has continued to be largely managed by the private lender in the traditional manner. Agricultural Departments were instituted in all Provinces, and subsequently Industries Departments also, but their sphere of operations remained very narrow till lately and improvements in the methods of the ryot and the artisan have so far been very meagre. Since the establishment of the Imperial Council of Agricultural Research, valuable experiments have been carried out, and it is hoped that arrangements will soon be made so that the ryot may profit by them. The benefits of civilized Government have been reaped mostly by urban classes—merchants, bankers, lawyers, professional men and Government servants—and the rural masses still remain steeped in ignorance and poverty.

It is the small producer and labourer that need the protection of the State. Large industries and plantations may be expected to look after their own interests, but the small producer, whether agriculturist or artisan, cannot be left to the mercy of the middleman. The State has a special duty not only to control all moneylending and marketing transactions affecting these classes, but also directly to provide such facilities. Takavi is a time-honoured practice and can be expanded to fulfil a wider purpose, and warehousing facilities must also be supplied by the State. Even in England and the U.S.A., where the farmers are more substantial and resourceful, the State is now taking upon itself responsibilities in respect of credit and marketing. As the Businessmen's Commission of the U.S.A. has pertinently pointed out :—

of India. Owing to an effete economic and social organisation, all the money that the tax-payer pays does not reach the treasury, nor does all the expenditure undertaken by the Government reach the masses. A readjustment of the economic mechanisn is therefore necessary.

A good part of the money required for this new policy must come from loans. The loan policy of the Government in India is very conservative. The result is the comparatively light burden of public debt. But the country is crying for drinking water and roads and irrigation works, and it is necessary to quicken the progress of such productive works. The best time to launch such a policy was in 1933 and 1934, when the depression reached the bottom. This would have enabled Government to maintain purchasing power in a time of dire depression and to carry out works at the lowest cost. The Government was sceptical of it, and the commercial bodies were engrossed in the demand for a return to the 16d. ratio, which was in their eyes the sovereign remedy for all the economic ills of this country. Therefore the few economists who recommended a public works programme were not heeded. There is still need for a reconstruction scheme for slightly different objects.

6. *Need for an Active Economic Policy.*

For bringing about such a reorganisation of our economic life, the Government will have to follow a much more energetic policy. From the middle of the last century, the Government pursued for long a policy of ***laissez-faire*** in economic matters, largely under the influence of current English ideas, and this was modified only when famine or other extraordinary disturbances to economic life occurred. The law and the courts were expected to protect the week against the strong, but, on the other hand, they became agencies in the hands of the resourceful classes to deprive

expenditure as a means of toning down inequalities. At present the bulk of the revenue is spent on security services and their benefits are unequally distributed between the different sections and groups. The defence expenditure may be a great burden to India as a whole, but it is an asset to those Provinces where the bulk of it is expended. Our public expenditure has been bringing about an unfair re-distribution of income between economic groups and Provinces, and this must also be rectified.

We have now come to a stage at which the improvement of economic conditions largely depends on a bold increase of expenditure. As Sir Walter Layton points out: "it should be possible to stimulate production and to increase the welfare of the people by public expenditure designed to give greater economic security (by irrigation works, etc), better physical well-being (sanitation, water-supply, etc.) and education." Taxation for these puposes will not take away money fron the people but will add to their purchasing power in many ways. It is strange in these circumstances to hear repetitions of the Gladstonian maxim about leaving money to fructify in the pockets of the people Kalidasa says that the revenue taken by Dilipa from his subjects went back to them a thousand-fold, even as the vapour from the sea comes back to the earth as fertilising showers.

प्रजानामेव भूत्यर्थं स ताभ्यो बलिमग्रहीत् ।

सहस्रगुणमुत्स्रष्टुमादत्ते हि रसं रविः ॥

This ancient conception of public finance is more in conformity wtih the latest economic theory than 'the penny-wisdom of Gladstonian finance.' One great difficulty in carrying out such a purpose is the leakage both in taxation and in expenditure inevitable in the peculiar circumstances

and various other things are necessary to raise the standard of living. This cannot be forced; but a proper education can do much. Hence the importance of the village teacher and the need for training him, so that he can regain his old status in the village.

5. Amelioration through Financial Policy.

The financial policy of the Government can do a great deal to lighten the burdens on the rural population and to tone down the inequities of distribution. It is generally admitted that the system of land tax obtaining in India is regressive seeing that it takes no account of the tax-payer's ability. It presses too heavily on the small-holder and rather lightly on others; and its burdens are much lighter on certain commercial crops than on cereals. The whole system has been vitiated by the recurrence of booms and slumps. Being based on an average of prices for certain years, the assessments become light in periods of rising prices but heavy in periods of falling prices. In order that these anomalies may be removed, the revenue assessment must be regulated according to the crops grown and the level of prices. A readjustment of the burdens according to ability may not greatly reduce the total collection. Nor need this change be unduly inconvenient for budgeting purposes; if income-tax receipts can vary, there is no reason why land revenue should be the same every year.

Not only land revenue, but our financial system as a whole, stands in need of readjustment in order that it may be approximated to the ideal of maximum social advantage. Various ingrained prejudices and vested interests stand in the way of the adoption of a more equitable system of taxation. This is all the greater reason for using public

economies of the large-scale can be secured for agriculture and handicrafts. Bold measures of colonisation on co-operative lines would greatly relieve rural congestion and middle class unemployment. Not only agricultural colonies but industrial colonies are needed, and the example of Dayalbagh deserves to be widely imitated all over India. In all these ways the labour of the unemployed can be mobilized and an increase in production and national income carried out.

4. *Raising the Standard of Living.*

An increase of national income is not sufficient to raise the standard of living. The experience of England in the first half of the 19th century shows that a large rise in national income may not bring about a ***pro tanto*** increase in economic welfare. Income must be more equitably distributed, so that the masses may have greater purchasing power than hitherto. More of the national dividend must stay with the producing and labouring classes. The system of rural credit and marketing suggested above is calculated to improve distribution as well as increase production, seeing that the producer is himself the labourer in most cases. Better tenancy laws are also necessary; the tiller of the soil deserves our concern more than the numerous intermediaries who have come to encumber the land in a ***laissez-faire*** regime. In industry, statutory provision is needed for assuring to the labourers a minimum standard. A comprehensive scheme of social insurance is needed, and the cultivator must not be left out of it.

Nor is it sufficient to distribute income equitably; we must also see that it is used for better living. The level of living of even well-to-do rural folk is generally very low. Cleaner houses, a more varied diet, better use of leisure,

parts of South India and has been found successful. A campaign for agricultural improvement and the adoption of controlled credit is highly necessary. When the agriculturist becomes creditworthy, interest rates will fall, rural credit function properly and the aid of the Reserve Bank will be readily available to him.

Thus by curtailing the price of credit and by eliminating the wastes in agricultural production, we may reduce costs and maximize income. But the increase of income cannot be very great, unless the agriculturist is enabled to use his spare time productively. It is well known to those who have the least acquaintance with the rural parts that only those agriculturists who have a second string to the bow are able to save anything. It is therefore necessary to devise suitable subsidiary occupations for each area and to give facilities for pursuing them.

Some people believe that all these improvements are only possible by following Soviet or Fascist methods. A totalitarian State would destroy the valuable cultural and spiritual foundations of India and would subject this country to a drab materialism. No doubt a much greater discipline is needed if our people are to advance economically, and a certain amount of compulsion will also be required as a temporary measure; as a British statesman said, it is 'better to sacrifice a certain amount of liberty for a reasonable amount of security'. But this can be done without stamping out freedom. In my opinion, the co-operative method is best suited for improving Indian economic life. Of course, its operations must be extended over a wider sphere than mere credit or consumption. There is great scope in this country for co-operative production, by which many of the

rural purchasing power, the scope for industrial development is extremely limited. On the present basis of consumption, India is rapidly becaming self-sufficient in regard to a good many articles. For raising rural purchasing power, agricultural production must become more efficient and the distribution of agricultural income must become more equitable.

The low productivity in Indian agriculture arises chiefly from certain imperfections in the system of land tenure, rural credit and marketing. By bringing more land under irrigation and by introducing improved methods of agriculture and cattle-breeding, production can be largely increased in India. The use of improved seeds and manures, consolidation of holdings, and the use of electricity will greatly help oț make production efficient. For long-term credit, the land mortgage bank must be the chief agency. The high cost of seasonal credit can be reduced and wasteful marketing methods eliminated by the introduction of a system of controlled credit, operated by the co-operatve societies under the careful supervision of the Government. The real obstacle to making credit cheap is not merely the moneylender or merchant, but the ryot himself with all his wasteful habits and improvident ways of living and borrowing. Only by resorting to the harsh methods of the professional moneylender can loans be recovered from many of the agriculturists. Therefore in order to help the ryot, we must cure him of his improvident ways; but this will take time. In the meantime, we must give adequate relief to the burden of debt and devise a system by which loans will be given almost entirely for productive purposes, and repayment will be provided for through the co-operative marketing of the produce raised. Thus credit must be linked up with marketing. This will reduce the cost of credit and enable the agriculturist to increase production and obtain a larger part of the product. A system of controlled credit has been tried in

No doubt, a certain number of key industries will have to be conducted on the mass production basis in large factories with all the up-to-date equipment, but in the case of ordinary industries nearly as much efficiency can be secured in small units, especially if chief electric power can be distributed and provision made for efficient marketing. Recent hydro-electric developments and improvements in transport enable such scattered units to obtain the external economies which hitherto were available ony to large factories. It is the cherished aspiration of our best minds that this country must be saved from the moral and physical ills resulting from industrialism, and Mahatma Gandhi's lead in this respect may with advantage be accepted in other countries also. Machine has had the better of man; it must be brought under stringent control.

That an efficient industrial development is possible on this basis has been demonstrated by Japan, where the bulk of the industrial labourers are employed in small production units. Japan's largest export industry, silk-reeling, is carried on in little workshops all over the country, or in homes during leisure hours. The chief industrial asset of Japan, as of India, is labour. In fact her resources are scantier than those of India, but by mobilizing—and perhaps exploiting—her large labour force, she has built up a thriving industry and an expanding foreign trade. Even in Europe—especially France and Germany—small industries still play a large part in the economic system. In Germany half the number of industrial workers are employed in handicrafts.

(*b*) ***Agricultural Improvement.*** However rapid our industrialization may be, the majority of people in this country will have to draw their sustenance from agriculture. Further, industrial development in this country is necessarily dependent on agricultural improvement. Without a rise in

(*a*) ***Industrialization.*** We will take industrial production first. A good many persons think that the immediate need of India is the rapid expansion of large-scale Industries. Few will deny that the present economic system of India is overweighted on the agricultural side and that a larger proportion of the population must be made to depend on industries, but all will not agree that wholesale mechanisation will solve our problem. On the mass production basis, all the requirements of India in the way of finished goods can be met by a few factories congregated in one or two centres, but on this basis we cannot give employment to a fraction of those who need work. Textiles, sugar, iron and steel goods—these are the consumption goods needed by this country in large quantities. In these, we now produce almost enough to supply our internal market, and yet all the industrial establishments employing more than twenty persons have absorbed only an infinitesimal part of the large labour force in this country. Consumption may increase in future, but judging from the rate at which labourers have been absorbed in the past and considering also the fast grawth of technological improvements, the prospects for full employment in this country on the mass production basis are very gloomy. There are also other circumstances which must be taken into account. The workers whose labour is now wasted are primarily agriculturists, and, on many grounds, it is not advisable to transplant them from their rural habitat to crowded cities. Recent village surveys in South India have disclosed the fact that more of the artisan classes, being deprived of their hereditary occupations by cheap imports from abroad, have lately changed over to agriculture, thus increasing the pressure on land. These people, being tied to land, may not migrate to factories; factories must be brought near them.

still the principal problem; we have a large potential market for all kinds of consumption goods and therefore production must be increased, in order that there may be more goods and more purchasing power to buy them. Further, the producer in India whether agriculturist or artisan largely supplies his own labour, and to that extent, distribution has a narrower scope than in the capitalistic agricultural or industrial systems. Indeed a better distribution is necessary between the producer and his sleeping partners (landlord and moneylender) if production is to increase. Yet, as an American economist says about his country: "We are not interested in maintaining a static situation in which the total income, even if equally distributed, would be altogether inadequate; we are interested rather in producing a dynamic situation in which increasing quantities of newly created goods and services would become available for every one".[8] This is much more true of India than of America. We have so small an aggregate income to be distributed that all talk of equalization is somewhat premature. Social justice is needed, but its claims must not be so urged as to deflect us from our main purpose.

Further, in devising the plan for rebuilding our economic system, our national genius and cultural heritage must also be taken into account. A steam-roller or automobile will do its work equally well in Berlin or Bombay, but certain economic or social systems found suitable in the West need not to be so far us, as the social fabric of this country is materially different frdm theirs. Our attempts at increasing production and improving distribution must take all this into account. Our agriculture and industry must develop in accordance with our own social and economic environ-

8. Moulton: *Income and Economic Progress* (1935), p. 83.

common people and it is in the interest of all concerned to satisfy them in some way.

Therefore, from every point of view, national or international, social or economic, selfish or altruistic, it is necessary to raise the standard of living of the Indian masses to a higher level, and this must be the prime consideration in our future policy.

3. *The Increase of Production and Purchasing Power.*

How is this to be done? The standard of living depends on income and its utilization; income depends upon production, which in turn is the result of the utilization of labour and natural resources. Therefore in order to raise the standard of living, the labour now wasted and the material resources lying idle must be mobilized for productive activity, and the fruits of such activity must be equitably distributed. Throughout the country, especially in rural areas, there are workers who are unemployed or inadequately employed during a large part of the year. Further, their labour is not efficient enough, and too small a part of of the fruits of their labour goes to themselves. This inefficient system of production must be set right, and in doing so, the present inequitable system of distribution can also be rectified. A larger production and better distribution,—this, in short, is ***the*** problem of India, to-day.

It is clear from the above that our economic problem is somewhat different from that of most Western countries. Many of them have developed their productive resources to the utmost, depending on foreign markets, and some are now trying to curtail rather than increase production, as those markets are proving unsteady and as population is on the decline. To many of those countries the problem is chiefly one of distribution. For us in India, production is

ments. This has made them bad producers as well as bad consumers; for in the absence of equitable distribution, there cannot be an efficient system of production.[6] Thus a vicious circle went on operating all the time and has committed havoc on our economic system.

Not only has this baneful system kept India poor and undeveloped; it has also upset the balance world economy.[7] Had the purchasing power of the teeming millions of India and China been higher, economic internationalism would have functioned more harmoniously and food-stuffs would not have been destroyed in one part of the world while the other part was hungering for food. Nor is this ***impasse*** likely to be rectified without an increase in consumption in Asiatic countries.

There are still some people in India who, on one ground or other, disapprove of an increase in material comforts. They forget that the large numbers of people who are below the poverty line and a good many of the job-less educated persons are not asking for comforts but for enough to satisfy elemental needs. It will have to be conceded that for the 'good life' which Aristotle postulates as the object of political society and even for the attainment of the higher spiritual ends, a modicum of material comfort is essential. ***Primum est vivere, deinde philosophare***. Further, the interests of social security to-day require that the economic condition of the masses in India should be improved. The yearnings for a better life have lately spread among the

6. Cf. "from the want of a proper distribution of the actual produce, adequate motives are not furnished to continued production." (Letter of Malthus to Ricardo, 7th July, 1821).

7. Cole, G. D. H., *The Intelligent Man's Guide through World Chaos*, pp. 50-1.

As the savings of the country were so largely hoarded, labourers found little opportunity at home and sold their labour abroad, an such unfavourable terms and with such undesirable results as to make Indian coolie labour an object of contempt. Nor had educated persons any chance for suitable employment, and those who received education in the new schools crowded into the government services or became lawyers. It must be admitted that the influx of British capital into the railways, jute mills and tea plantations of India from about 1860 did something to relieve the persistent paucity of purchasing power in this country. But such investments slowed down during the war and have almost ceased since. Year after year, increasing numbers of eligible persons have been sent out by the Universities, and with all the elaborations of the administrative machinery, the Government have found it impossible to employ them all. Thus has arisen the serious problem of unemployment among educated persons, a problem in some ways more alarming than the under-employment which is keeping down the standard of living in rural areas.

The state of things explained above seems to lend support to some of the familiar under-consumption theories. Too large a proportion of the income derived from production has been going to the capitalist classes, while the producing and labouring classes have been living on the subsistence level. Unfair tenancy conditions, unjust loan transactions and inequitable modes of marketing have been instrumental in bringing about this condition. The result has been under-consumption, which in turn has led to under-production. Owing to the largely unproductive use of savings year after year, little increase of investment has taken place, and the common people have been always under-employed and have been living on minimum require-

nounced in this way, and the purchasing power of the masses continued to be low.

Had the people who obtained the bulk of the profits from agriculture and handicrafts invested their earnings in productive enterprises, the economic system would have functioned better. This is what happens in all advanced countries, including Japan. In 1868, when Japan was opened to foreign trade, the landlord and trader put their savings into productive enterprise and thus the country developed rapidly. But in India, the habits of moneyed persons have not been conductive to productive activity. They bought gold or lands or gave out money at high rates of interest to needy persons—all more or less sterile pursuits. Year after year, a large part of the trade balances in favour of India came in the form of gold or silver mostly for hoarding purposes. Between 1835 and 1925, as much as Rs 1,300 crores or 52 per cent., of our merchandise balances were converted into gold and silver, and thus got sterilised. Such an unproductive use of the annual surplus was hardly calculated to increase employment or circulate purchasing power. Further, the classes in whose hands the profits accumulated were those noted for their parsimonious ways of living. As a well-known English economist wrote in 1820, "the principles of saving, pushed to excess, would destroy the motive to production".[5] This is particularly so when savings are converted into gold or lands. In Bombay and elsewhere, a few Indian capitalists ventured into industry long ago, but the growth of such enterprise has been slow and the type of industrial organisation adopted was not the most conducive to the national welfare.

5. Malthus, *Principles of Political Economy* (1820). p. 8. 9.

world, but our economic and social system denied them the right of obtaining in society the position they deserved, and the fruits of their industry went into the pockets of middlemen. Thus the bulk of the purchasing power generated in the course of production remained with the employing classes, and the masses were kept in a miserable condition.

With the dawn of modern economic conditions in India—a money economy, statutory rights in land, registration of of money claims, laws of contract and civil procedure and courts to administer them—the lot of the agricultrists only became worse. Their credit increased when land laws were enacted, but facile credit proved a curse to most of them. As Gide puts it, 'credit holds up the landholder as the rope holds the hanged man'.[3] Landholders freely used their credit to borrow, mostly for non-productive purposes; but repayment was dificult and the new law courts, unlike the old panchayats, gave all facilities to the creditor to recover his claims. Thus land alienation became common and the condition of the agricuturists became worse. The new laws and courts were no doubt suited to a commercial society but they proved injurious to our rural population.[4] With the increase of foreign trade after 1860, towns grew in size, an urban middle class arose and professional men carved out largr incomes, but the rural masses who made all this possible benefited little by it. The balance of trade in favour of India went on increasing year after year, and much money flowed into the country, but the bulk of it went into the pockets of merchants, moneylenders, and other middlemen. The unequal distribution of income, already a feature of the Indian productive system, became even more pro-

3. *Political Economy*, (Archibald's Edition), p. 394.

4. Thorburn, *Muhammadans and Moneylenders* (1886), pp. 73-92; Calvert, *The Wealth and Welfare of the Punjab*, p. 123.

cost price for the last 100 years, if one takes into account the proper elements of costs'.[1] The position is worst in India, because here the middleman makes profit not only by handling agricultural produce but by advancing money to the agriculturist on unconscionable terms. Contrary to the expectations of the British administrators who carrried out the early land settlements in India, a large number of middlemen have come to posses rights in land and therefore claim a share of the income arising from it, with the result that the share of the actual tiller has become small, especially in parts where the competition between cultivators is keen. From this meagre share, the ryot has to meet the claims of the moneylender, who may be the landlord himself, and in many places all this sharing takes place on the threshing floor itself. In the ryotwari areas, the Government too gets a good slice of the income from land. What is left to the cultivator is hardly a living wage, and he has soon to borrow for maintaining himself and family. Thus even in normal times, the agriculturist is in want and in debt; and when crops fail or cattle die, he has to mortgage his land, and mortgages generally end in loss of land. Thus the position of the ryot is like that of 'a man standing permanently up to the neck in water, so that even a ripple is sufficient to drown him'.[2]

Nearly the same conditions obtain in the handicrafts; and the artisans are everywhere steeped in poverty and debt. India formerly possessed weavers and other artisans whose skill was unsurpassed, but even they had to work under conditions of semi-slavery for a bare pittance. The muslins and chintzes they made were the marvel of the

1. *A World Agriculture* (Royal Institute of International Affairs), p. 260

1. Tawney, *Land and Labour in China* (1932) p. 77.

economic activity are therefore available in ample measure, and yet the resources remain untapped and man remains poor. For this state of things, various causes have been assigned. In my opinion, it is due to two factors: (1) inefficient and inadequate production and (2) inequitable distribution. These two causes interact on each other at many points. Owing to technical inefficiency and a colossal waste of labour and resources, Indian production is at a low ebb, and therefore the share of income available to each person is also very small. India needs much more of consumable commodities if the standard of living of its teeming millions is to rise to a satisfactory level. The purchasing power needed for effecting this increase of commodities must be generated in the productive process itself. But the productive system of India is vitiated by many serious evils. It never distributed purchasing power equitably and it has been clogged by an unjust system of distribution. Too small a share of the purchasing power resulting from production has been going into the hands of the producing and labouring classes and too large a share into the pockets of certain classes which are economically sterile. This needs some explanation.

In India, the producer, whether he be a cultivator or an artisan, depends on moneylenders and traders for capital and marketing, and the nature of the bargain is generally such that he seldom gets any reasonable share of the fruits of his labour. All over the world, even in Soviet Russia and the U.S.A., agriculturists obtain a much smaller portion of the national income than their labour entitles them to. The agencies that trade in agricultural produce obtain with less effort a much larger share of the income from land. Sir Josiah Stamp says that 'the world as a whole and over a given length of time has almost certainly been fed below

the matter of sugar also. A distressingly low standard of living has been persisting in this country for a long time.

It has lately been customary to impute the economic ills of India to the trade depression. In many countries, especially those narrowly specialising in certain kinds of industry or agriculture, there has been a severe setback in production, trade and employment; but in India, on the other hand, the years of the depression coincided with a large expansion in industrial production, thanks largely to the Government's tariff policy. Since 1928-29, the production of cotton piecegoods has increased by 89 per cent, sugar by 1016 per cent, pig-iron by 213 per cent, and steel by 151 per cent. Nor has export trade fallen, in quantum. There has been a large increase in the exports of raw jute, raw cotton and oil-seeds, which are the mainstay of our commercial agriculture. The increase between the post-war period and 1936-37 was 50 per cent in cotton, 67 per cent in raw juite, and 380 per cent in groundnut. No doubt the terms of trade turned against India by a large disparity between export and import prices (22 points) between 1929 and 1931, but the disparity got narrowed down to 4 points in 1936-37. All this helped in maintaining purchasing power in the country. Rural debt is still a serious problem, but it was crying evil even in 1928, and no degree of recovery will wipe it out. It can only be cured by a reconstruction of rural economy. Therefore, the problem of India, to-day, is not merely one of recovery, but of solving our perennial problem of proverty and a low standard of living.

2. *India's low standard of living is largely due to Inefficient Production and Inequitable Distribution.*

India has abundant natural resources and a large labour supply to utilize them. The two prime essentials for

country almost all our sugar and matches, about 83 per cent of the cotton cloth and a large proportion of our iron and steel goods. In 1920, India imported cotton piecegoods worth about Rs. 58 crores and sugar worth Rs. 15 crores, but in 1936-37, the import values of these goods came to only Rs. 13 crores and Rs. 23 lakhs respectively. Nor has this industrial advance been achieved at the expense of our agriculture; in food-crops, production has kept pace with the growing population and in 'cash' crops like sugarcane a large increase of production has taken place.

In spite of all this advance in production and trade, the economic condition of the masses still remains unsatisfactory. With all the increase in production, labourers in organised industries still number only 1·6 millions or less than ½ per cent of the total population. Our information about income and standard of living is inadequate, but we have enough evidence to show that living standards, even of urban labourers, remain very low. According to a recent report of the Bombay Labour Office, certain classes of industrial labourers consume the maximum of cereals allowed by the Famine Code, but less than the diet allowed by the Bombay Jail Manual. Sir John Megaw estimated that about 41 per cent of the people of India are 'poorly nourished' and 20 per cent 'very badly nourished'. This is no wonder, seeing that the average rural incomes in India are between Rs. 50 and Rs. 70 per annum and that even in our cities there are classes of labourers whose monthly income does not exced Rs. 10. In a country like India, any rise in the standard of living is bound to be reflected in the consumption of such articles as cotton cloth and factory sugar. Between 1913-14 and 1936-37, the ***per capita*** consumption of cotton piece-goods ranged between 13 yards and 16 yards per annum, and there has been no definite improvement. The same tendency is more or less seen in

The Central Problem of Indian Economy

Ladies and Gentlemen,

I am thankful to the Indian Economic Association for choosing me to preside over its deliberations this year. Twenty years ago, I had the privilege of attending the first session of the Conference held at Calcutta. It met in a room in the Calcutta University Buildings and not many persons were present. Since then the Association has grown in number and influence, thanks to the solicitude of our older economists, some of whom I see before me here to-day. A momentous step in self-government has lately been taken in the Provinces of India, and the Association is expected to give the lead in economic matters to these Governments. It is for persons of riper age and mellowed wisdom to give such a lead. I shall only perform the ***nandi*** by giving a brief analysis of what I consider to be our fundamental economic problem to-day.

1. The Problem of India is not merely one of Recovery

The most distressing feature of India's economic position is that in spite of the large increase in foreign trade and industrial production in the last seventy years, there has not been any appreciable improvement in the standard of living of the masses. Before the War, India depended on Lancashire for about 75 per cent of its cotton cloth, and nearly all the refined sugar, matches and iron goods consumed here came from outside; but to-day we produce in this

Many learned philosophers and religious men of this age are of the opinion, that throughout the world people are becoming more or less materialistic and their morality and spirituality are not developing with their material development. People are generally irreligious; they think religion as the "opium of people". The age of science may have done away with religious persecution, torture, slavery, and evils of olden times. But it has created new evils which are at least as bad if not worse than the old ones. Religious wars have given birth to economic wars, domestic slavery has given place to factory slavery.

The age of science has made modern peoples time-slaves. The watch and clock have become their gods. And this time-slavery has made them restless and neurotic—thus making them incapable of proper moral and spiritual development. That shows that they have got no moral or spiritual goal before them.

S. K. Bakshi

Senior B. Sc.

deprived of their work, now, they are passing their lives half-fed and half-clothed. Moreover, the health of those men and women who work in factories and mines is destroyed.

Numerous inventions and discoveries instead of putting an end to wars, have increased their speed and made them more dangerous. Life is not safe in the modern age of science. Many innocent girls and boys, men and women are breathing their last in the present Sino-Japanese and Spanish civil wars.

Religion and science both aim at providing something that people want. Both are ways of obtaining results, but their methods are different. The religious man worships, the scientific man enquires.

The ideal of blind faith lost the supreme value which it had maintained earlier. In the course of the necessary growth to clear selfconsciousness of the mind of the modern world, that ideal seemed to involve an inner contradiction. Mere faith is not sufficient by itself; it has an end to attain. The end is for faith to become seasoned with intelligence. Accordingly a transformed ideal, the ideal of reflective faith normally arises. A praise worthy character is now contemplated as one becomes acquainted with the rational grounds of conviction. It is but an obedient response to the injunction of St. Paul to "give a reason for the faith that is in you;" that God exists, for example, is accepted as certain, but it is important to see why belief in his existence justified. For the assumption with which the age began, it is important to seek a reason; but if the reason cannot be found, the seeking becomes irrational and the foundations of all faith are jeopardized anew. Thus in the age of science, superstitions and blind faiths have no place.

Life and Religion in the Age of Science

The modern age is the age of science. It reigns supreme in the world. It has produced wonder after wonder and an endless pageant of discovery and invention have dazzled people's eyes. Nature herself has yielded in submission to science. The evidence of this function of science is noisily thrust upon us in the railway, the telegraph, the radio, the aeroplane, the automobile and a still more startling extension is promised us by the preliminary experiments with television. By the aid of science, the impossible will be made possible. It has added immeasurably to the comfort, ease and convenience of humanity. It has lessened the drudgery of man and life has become easier for millions. "Science has restored eyes to the blind and hearing to the deaf. It has lengthened life and minimised danger, it has controlled madness and trampled on disease". In the world of medicine it has achieved a remarkable progress and has improved surgery beyond imagination. In short, the age of science has brought along with it innumerable comforts to the lives of human beings.

When we think of the infinite benefit of science, we forget the evil which attends it. It has its own peculiar dark side. Life is often not so comfortable as it is thought to be. It has made men lazy. It is the chief cause of unemployment, a problem which is engaging the best minds of the world. Big machines have replaced millions of workers, and destroyed the cunning of their hands. Being

suit. We thanked Prof. Kapa once more for the hospitality shown us and for his kindness in taking us round the city. We slapped the necks of the Martains present—this was the fashion of welcome and leave-taking—who slapped ours in return. We said with one voice, "Give our respects to the Chief Martian" and opening the door of "Mariam" we entered it. We waited for the return journey. Dr. Roy first switched on the invisible ray. Then he pushed a button controlling the explosives chamber (this acted as a Space Gun) which emerged out of the outer cylinder. We strapped ourselves as before to the walls of the inner cylinder. Dr. Roy pushed a lever which set fire to the explosives in the Space Gun and the next moment we found ourselves to be blown sky high.

"We sailed through the air with the greatest ease, like the daring young man on the flying trapeze". The flight was uneventful and we landed on the Earth near the Space Gun house. And what happened next was a nightmare to us.

Readers, you may picture to yourselvss, the crowd roaring itself hoarse. Prominent among these shouts were:—"Bravo", "Well Done", "Three Cheers", "Congratulations". One familiar voice said, "Shabash", another "Wah! Wah".

Just imagine a battery of cameras clicking at you from all angles and newspaper men clamouring for news. But, finally, we found ourselves carried shoulder high from the Begumpet observatory to Seethapalmandi and back from Seethapalmandi to the Begumpet observatory, and by the time we reached home, evey joint of our body was aching and called out for rest.

Syed Wasif Azam

during which to interview the Chief Martian, so I would like you to take me to his residence." We thanked Dr. Keuntz and proceeded with Prof. Kapa to the Chief Martian's house.

We were shown into a kind of visitors' room where there was a Television receiver with which to interview the Chief Martian. Prof. Kapa returned and informed us that we could talk to the Chief. Dr. Roy said, " As it is something official and important, I would request you gentlemen to wait for me a few minutes outside." Prof. Kapa took me with him down to the car where we waited for him. Dr. Roy returned after an hour. From his face I could conclude that the interview must have been very pleasant and profitable, for he wanted to secure some commercial rights on Mars. " Have you secured them?" I asked. "Yes," he replied, " the Chief Martian is a jolly good fellow, Prof. Kapa. He was very polite and considerate towards me. Well, we must return to our rocket now. I have to go back to arrange for a transplanetary service between Mars and the Earth. I have secured some radium deposits here and in return we are giving you an equal value of coal mines on the Earth." Prof. Kapa said, "That is good; then I shall be seeing you soon. Come along now, I will take you back to your rocket." Dr. Roy replied, "Thanks very much, but why do you trouble yourself so much." "No, it is no trouble at all I received you and I must see you off" said Prof. Kapa.

We took our places in the car and soon arrived at the gates. We donned the oxygen masks and the thick suit. Prof. Kapa opened the gates and climbing the steps we emerged into the open once more. We found the Martians on guard wearing oxygen masks the Martian can stay for a short time only on the surface without a mask-and a warm

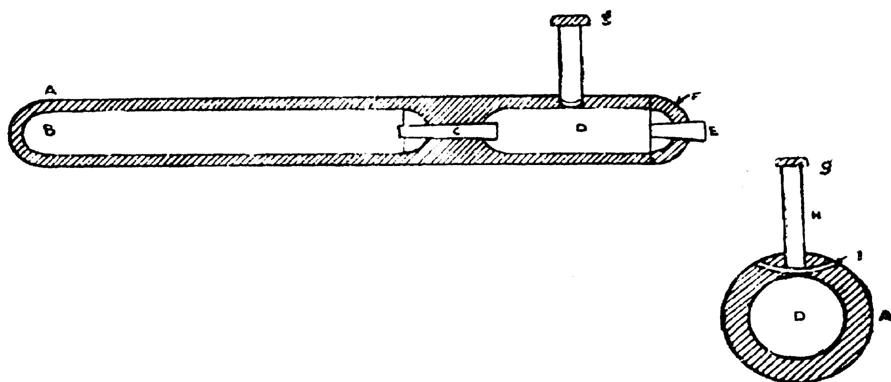
"Well," he continued, "I will take this one near you for explanation." We turned round tosee a huge machine about 7 ft. high and 10 ft. long standing on six legs. The legs resembled inverted nails, though much thicker in the stem and broader in the head. The metals used in the construction of the body of the robots were Kensium, Marsanium, Turnium, Pentium, Sorus, etc. This robot was made of Kensium though there were others of many other metals They used metals which could withstand radium rays, and, in fact, every kind of ray that could possibly be used against them in Jupiter. Dr. Keuntz said, "Once we find out which ray is being used we can wear a suit of such metal as is safe from the effects of those rays and then coming out of our rocket we can give battle to the inhabitants of Jupiter." The main body of this robot was rectangular and its head was covered with lenses and the Tele-eye. Dr. Keuntz brought a ladder and propped it against the platform which the Martians had left round the robot. We climbed on to the platform and Dr. Keuntz took of its cover or radiator. We looked into a jumbled mass of fantastically designed machines and contrivances for driving the robot which was quite beyond our comprehension. Dr. Keuntz didactically proceeded to explain its mechanism but we stopped him. Dr. Roy said, "What is the use of explaining when we can make neither head nor tail of what you are saying ?" And we got down from the platform.

Prof. Kapa began, "Now, Sir, shall we visit the flats of Martians ?" Dr. Roy replied, "I am afraid, Prof. Kapa, I haven't much time to spare. I have got only two hours

About an inch or so from the mouth of the bârrel was a button connected to a stem about one and a half inches long. To the lower end of the stem was a semi-circular piece of Kensium band (see national figure). A Kensium stopper is supplied to plug the hole in the detachable head. When in use, it is taken off and inclining the gun a little—if the gun were kept horizontal the liquid radium would flow out of the tube—the button is pressed. It presses the tube containing radium and some radium spurts out of the barrel and it discharges rays which have a parabolic flight and fall near the objective with a dazzling light and explode. On releasing the button, the tube sucks in radium from the container.

Dr. Keuntz next took us to the Robot building section of the laboratories. Dr. Keuntz said, "The various stages the manufacture of a robot are too tedious and puzzling to be explained as well as understood in a short space of time, so I will show you a completed robot". He led us through a brilliantly lit passage. I looked here and I looked there, but I could not find the source of light anywhere. The passage led to a big hall in which there were many curiously constructed contrivances. Dr. Keuntz said, "These are robots." "What," I cried, completely taken back by the curiously constructed contrivances. "I I I I—b-b-beg y-your p-p-pardon." I managed to stammer out. He asked "Why, don't you have robots on the Earth?" Dr. Roy replied, "We have, but our robots are shaped more like ourselves." "I see ! so, that is why you were so surprised."

admit the radium container. After being bored, they made the closed end of the cylinder spherical in shape.



A—Barrel of Kensium
B—Radium container of Kensium
C—Nozzle of Kensium
D—Tube of animal hide (see below)
E—Stopper of Kensium
F—Detachable head
G—Button
H—Stem
I—Semi-circular piece of Kensium

A detachable semi-circular lid with a hole in it was being made for the open end. The radium container was 9" long and 1.5" in diameter. It is very similar to the ba rel. It has also a detachable head. After filling it with liquid radium at 960° C, the detachable head was screwed on. A small nozzle of Kensium was put into the hole in the detachable head of the radium container. The nozzle was connected to a tube made of the same material as the gloves worn by the Martians. I asked, "Dr. Keuntz, do you get this material from trees?" He replied, "No. This is the hide of an animal which lives in the neighbourhood of the Radium deposits and is well adapted to bear the radium emanations." The tube had a small hole bored in it which came in juxtaposition with the hole in the detachable head of the barrel.

your case. So we hope to conquer them by means of the Radium Guns. In another section of this factory we are preparing robots for fighting the enemy. They are to be controlled from the 'rockets' by means of television and wireless." The manager received us and was introduced all round as Dr, Keuntz.

In the first section of the factory, we came across a number of Martians at work on the outer covering of the Radium Gun. I tested one of them and found it to be very hard ; it was black in colour and the colour was permanent. I asked Dr. Keuntz, "Pray, excuse me, but I would like to know something about this metal." Dr. Keuntz began "This is a metal found near the radium deposits. It resists the ravages of radium emanations for a considerable period. The blackness is in the metal itself and not coloured as you might suppose it to be. This blackness is very suitable because it has the power of stopping the radium emanations and, since radium is used in liquid form in guns, it controls the radiation of heat. It is called Kensium, after its discoverer, Dr. Kens."

The barrel or outer covering of the gun is just like a test—tube in shape though not in size. Its mouth is small, about the size of a pencil. The gun is about a foot long and two inches in diameter. The Martians were making cylinders of Kensium out of big blocks and then smoothing it. In another part of the room, the cylinders were being bored to

clothing for us, and after treating it with some chemicals, we use it in the walls of our workshops to make them sound-proof and fire-proof". I had a chance of seeing this animal when we moved on to the Research Laboratories. The way led by a farm and on this farm a number of them were grazing. They are a cross between a rhinoceros and a hippopotamus and are about 5 ft. high and 7 ft. long. They have short tails, short legs, small ears, big eyes, long noses, with a short cone-shaped tusk. They run very fast and are difficult to catch.

We next passed by the Research Laboratories. Prof. Kapa said, "We are building a rocket here by means of which we hope to reach Jupiter". This place was the most guarded of all, even more closely than the Power House. The martian engineers who were making it were considered very precious and the death of even one would mean the wreck of their plans, for it would take many more years to build the rocket. We requested Prof. Kapa to take us in but he replied, "No one is allowed to enter the laboratories except the engineers. I am also not allowed to enter. Only those who have a pass from the Chief Martian can enter." We were disappointed, but there was no helping it.

Meanwhile, we were approaching the arms factory on the outskirts of the city. Radium Guns are manufactured here. "Though there are many fights taking place here," said Prof. Kapa, "yet we use the Radium Gun only as a last resort." "But," I asked, "where is the necessity for manufacturing so many radium guns, when a few hundred will do?" He said, "You see, our theory is that Jupiter is inhabited by a very hostile race whose civilisation is millions and millions of years ahead of ours, and probably more in

engineers during the day and two during the night were required. They controlled the consumption of Bunseum and if necessary conducted some minor repairs or the oiling of some part of the dynamo with the oil of an animal. Since the 'rocket' workshop and the Television Exchange were the two most important departments in the city, I found the Power House to be very zealously guarded. The Power House was surrounded by a wall built of a shining, hard metal—though, not so hard as Marsanium--known as Arsium. This metal is very durable and would be quite capable of withstanding battering rams and even bullets and cannon balls, if there were such things on Mars.

We then passed on to the storage department, situated at some distance from the Power House but very near to the Martians' flats. Two things struck me as model of Martian civilisation during my visit, and these are the iron discipline controlling the Martians and their wonderful organizing capacities, rather, the organizing capacities of the Chief Martian. No one has ever seen his face, not even his personal assistants. While the Martians are at work, their wives come and take a week's rations with them. They take the rations, sign a book and go away happy and contented. The manager of the Stores informed us as to the nature of the food of the Martians. "It consists of a kind of cereal, taken with milk from trees". I was much surprised and asked, "Do trees yield milk on Mars?". He said, "Yes! the trees are grown and cultivated by the young boys and girls whose duty it is to gather milk from them". Dr. Roy said, "I would very much like to taste it". The manager asked one of his assistants to bring some milk. We tasted it or rather we drank the whole lot of it, because it was so sweet and well flavoured. The manager continued, "They eat the flesh of an animal named "Kaukutra" which also yields an oil used in engines. Its hide is used to make thick

night Martian's shed just opposite the flat and flash a picture on to the television screen of the scene of disturbance in his shed. The alarm wires are connected not only to his shed but also to the Emergency Unit, next door to the Television Exchange. The emergency Martians make for that particular locality in the fastest electric car. The secret service Martian, meanwhile, keeps the law-breakers at bay with the Radium Gun. The erring Martians are caught easily and they are brought before the Chief Martian who is the supreme judge and sentences them accordingly. There is little or no danger from the other Martians who are civilians, traders, architects, etc., because they are under the eyes of their chiefs during the day time, while, at night, they are watched by the secret service agents. The chiefs of these various departments are chosen by the Chief Martin himself". Thanking the Director for all this valuable information, we drove on to the Power House.

The Power House was situated in the middle of the city and housed the gigantic dynamos which supplied the television apparatus and other workshop engines with power. The dinamos, we were told, were made of a metal called 'Marsanium' and we found this to be ten times as hard as 'Manzelonite'. The manager informed us that the making of such dynamos took endless trouble, energy and patience. The fuel of these engines was an oil (Bunseum) found in the oil fields of Mars. Its vapour had a smell very similar to that of coal gas. It is lighter than petrol. But, were told that, whereas other oils are found in abundance on Mars, there is a great scarcity of this particular oil and they, therefore, use it only for the dynamo supplying power to the 'rocket' workshop and the Television Exchange. For other workshops they use another dynamo, using inferior oils as fuel. The dynamo using Benseum worked day and night, and to drive this two

us, for the Martians' knowledge of the cosmic rays was considerable and on that account I thought they must have turned out some creditable work. Television had replaced the telephone. The Martians holding a conversation could see each other. We entered a big room where a number of television operators were sitting with a pair of ear-phones over their ears. In front of each were two screens with silvered surfaces and beneath each screen were knobs with numbers on them. The director explained that, when two Martians were speaking, their faces would appear on the screens, automatically focused by the adjustment of the knobs in accordance with the numbers given.

Their conversation could, of course, be heard by the operators. This was one example of the wonderful organization of the Martians. They were controlled by an iron discipline, which the average Martian feared very much more than the assistants of the Chief Martian. I asked, "Why are the Martians not allowed privacy?" The Director, Dr. Serum, replied, "If we did give them privacy, they would turn traitors in the twinkling of an eye. In order to eliminate the possibility of an organised revolt, we employ our operators from the Secret Service. A Secret Service Martian tracks all Martians in the workshops. For every five Martians, there is one Secret Service Martian who is himself working in the same division. All six of them leave for their flat after working hours, and, during their leisure hours, they are under the constant vigilance of another Secret Service Martian. This Martian is on duty throughout the night, while the workshop Secret Service Martian takes rest. As soon as the five working Martians enter the flat—this is generally 7 o'clock—the day - Martian gives over charge to the night-Martian who goes about the flat setting up the television alarm wires. These wires, if disturbed, ring a bell in the

He led the way down the stairs after allotting the task of guarding "Mariam" to four of his followers. We entered a brilliantly lit rooom which was warmer than the atmosphere above and where breathing too was easier. So, we took off our oxygen helmet and our thick suit. He said, "This is the capital of Mars. We have only seven cities left now and each has a population of about 2000 men and women". Dr. Roy asked, "May I have the honour of knowing your name?" He replied, "Most certainly. I am known as Kapa—Professor Kapa you know!—and am one of the personal assistants of the Chief Martian. But, shall we start now" Dr. Roy then introduced me, and the three of us moved to a very nice stream-lined car. We were told that it was controlled by electricity. Professor Kapa switched on the electric dynamo and putting the car on its course he locked its steering-wheel, thus doing away with all difficulties pertaining to the driving of a car. He then gave out instructions to the various directors and managers concerned to prepare to receive visitors.

Professor Kapa then began, "I congratulate you on your most successful flight, Dr. Roy, and still more on your wonderful invention." Dr. Roy, replied, "I thank you for it, but you must know that building such a thing is not so easy." He was far too wary to fall into the trap of revealing the mysteries of his rocket, for he knew that, if he did so, the Martians with their superior intellectual powers would make use of it to invade the Earth and carry off human beings as slaves. We were nearing the first of a number of huge workshops.

This was the Television Exchange. Indeed, Television here was in a much more advanced state than on the Earth. We were received by the Director of the Exchange who took us round. The television room was of particular interest to

We unstrapped ourselves and put on oxygen masks and special warm suits, for Mars was very cold ond oxygen scarce. We opened the door and stepped out on Mars—perhaps the only human beings who had ever set foot upon the planet. We found the land to be strangely desolate, absolutely devoid of trees or vegetation and with no signs of life of any kind whatsover. According to Dr. Roy, Mars was inhabited, but of habitation we found no sign, at least, on the face of it there was none. Suddenly we heard a deep purring noise as of some machinery in motion, and right in front of us in the soil a deep cavity opened, the soil sinking and sliding to one side. There were steps leading down, and upon these a number of queer creatures were climbing with the agility of cats. They were the Martians.

A queer type of people were they indeed. They had heads twice as large as ours but absolutely bald. They had a pair of huge ears and their eyes were as big as tea-cups giving one the idea that they were quite ready to jump out of the sockets. Their noses were long and thin. Their lips were thin but firm and they had strong square jaws which spoke of a determination and courage not to be questioned or trifled with. They had thick necks and big, broad chests but small stomachs. They had long legs and hands. They wore only loin cloths made of the hide of an animal, and they wore some kind of rubber and were also encased in rubber boots.

One of them, perhaps their leader, wore a bracelet of a metal unknown to us. He led the party towards us and Dr. Roy addressed him in the Martian language with which I had become quite familiar. The Martians had sent a rocket which had fallen on the Earth and in it we found an invitation to Mars couched in their own language, with a dictionary of pictures representing words. The Martian replied courteously and undertook to take us round the city.

A Visit to Mars

I stood with my friend, Dr. Roy, in his Space Machine, "Mariam". The "Mariam" consisted of a bullet-shaped, cylindrical rocket, about 60 ft. long by 15 ft. wide. It contained another cylinder which rested on gigantic springs to withstand the concussion of the Space Gun and a severe shake up on Mars. The inner and outer cylinders were made of a new metal discovered by Dr. Roy which he named 'Manzelonite'. It is harder than anything on the Earth. He also discovered a ray which made both cylinders transparent, and this greatly facilitated steering because he could see other objects clearly.

We strapped ourselves to the walls of the inner cylinder by means of three leather straps, one across our feet, one over our stomachs and another across our chests, leaving our hands free to manipulate the instruments and steer the machine. The time given for clearance was one hour, and this was quite sufficient for us to strap ourselves and dispose of other necessary prelliminaries.

Exactly at 11 A.M. (G.M.T.), we were shot out into space. This is done by reacting certain explosives in the Space Gun. The speed of the Space Machine is five times that of light (speed of light is 186,000 miles per second); so it took us less than a minute to reach Mars (Mars is 48,000,000 miles from the Begumpet Observatory), and there Mariam landed. The shock was scarcely felt inside, perhaps on account of the springs and the speed which had been controlled by Dr. Roy.

Did you discover who my friend is? God is great but he has not created being but he came from the work of a man. It is a book. You can feel it, here, very near to my heart, in my pocket.

Md. Mahmood Hussain
V Year (English)

despised and I "beweep my outcast state and curse my lot" —at such a crisis there comes my friend with a twinkle in his eye and a smile on his lips. And lo! a free man with renewed fervour and renaissant hopes, I take my leave of my colleague.

When in the darkness of self-delusion I go astray, my friend comes with a torch in his hand. Evil has thrown her net, her grisly gang waits ready to pull it, I stand with one leg in, a step more and I am trapped,—but I feel the presence of my friend. I am saved.

I care not for anybody. Let the poor die of hunger, let their children be frozen for want of rags. If any body is poor it is his own fault or his father's. Why should we trouble ourselves and disturb our peace. Let the authority of providence who made them all, be disputed. I have no belief in these puerile laws which in the name of humanity appeal for these abominabe things. Beggars are impostors. The meek, why should I help them, the weak, why should I succour them. What have I to do with the losers! Have I any hand in their bereavements, let them not sympathise with me when I lose.

So thinking, I sit as if ready to pounce on him, whoever he may be, that comes before me. My eyes are hideously red, my hands beat the table, and the magnified echo equally matches with the thunderbolt. Some one arrives on the scene, but who is he? My friend. My strained veins are loosened, the delirium of festered thoughts passes away, my heart is melted, the impurities are burne and the temper flows out with the tears. Like a true needle I turn towards the magnet of my friend.

One Of My Friends

We have become inseparable. I doubt whether you would agree with me in calling it a being. It has length and breadth, height and weight, volume and colour, even class too. My friend is very handsome to look at and extremely noble to look into. If you try to discern my friend's interior, you will be wonder-stricken, your mind will be saturated with glory and life unfit for any criticism. In demeanour my friend is gentle towards everyone, alike to a king and a peasant, to a boy of nine and to an old man of ninety, to a haughty Mussolini and to a benevolent Friar Laurence.

I befriended my companion long ago. Now his countenance has grown weather-beaten and rough, his colour is changed. You can see crow's feet on the whole of his body, but I can assure you that the spirit remains unaffected by time or tide.

My friend can please you when you need pleasure, can add more to your happiness when you are already in it, can console you when you lose something, can cool you down when you are hot tempered, can incite you when you are dull, can wake you up when in dishonourable sleep you lie, and can encourage you when you are disheartened.

I am driven and reproached, rebuked and rejected, every door is shut upon me, and every way barred; I listen to nothing, but harsh and unkind words, I look at nothing but mishaps and dismay. I am disdained, disparaged and

Yet I maintained an optimistic attitude, and became a social being. This optimism caused me to suffer more. A multitude of men who were themselves living in a prison came to me for diversion demanding consolation at the cost of my life. Even to that I consented expecting that my grief would be consoled in the company of their grief, but I could not find that serenity which I sought. It was my folly to hope for a return to my former state. I am grieved the more to hear the remarks of those non-smokers, who question my behaviour and character; had they pitied me, I should have realised that commiseration comes out of nobility, and reprobation out of insincerity.

I have such long experience of your inscrutable heart, and inconsistent brain, that it seems preposterous to believe any more in your wisdom. It was because of fashion that you selected my company, and your affection is all pretence. There are many who assure me of the constancy of their habit, so much as to call it adoration, but I am confident that even an obnoxious liquor could replace me, and I may suffer desuetude at any moment. I was denied the esteem that I deserve. I was made a plaything as if I did not possess a heart, and had no feelings.

I live hoping that your lips will never betray me. I burn anticipating that my ashes will be significant in making you realise the ways of true love. Such is my sacrifice— it should not be customary to make sacrifices only at the altar of virtue. Alas ! I am said to have stained your fingers, and spoiled your lungs. Are such criticisms to be expected of one who is dear.

Mustaba Yar Khan,

(Senior Inter)

Nicotiana Responds

I know well the human discrepancies in the recognition of values. I know well the human criteria. Yet I am thankful for the compliments that I have received, the very fashion of which assures me that they have come from a misconception either of myself or yourself.

I was flourishing in an undiscovered land, fighting an innocent struggle for existence, cautious of my career but unconcious of my doom. I was untouched ; even the lips of my flowers were virgin, as my innocent insect friends never thought of polluting them. But I was drawn out of that secure obscurity by one who is perhaps called a hero amongst you. All the sublimity of my life was tainted, by bringing me into a widerness of selfish souls, who are also self-concious like religious men. Was it fair on your part—dubious architect of your own fortune—to pollute the innocence of one's destinies? How unfair of you to be indifferent to my flöwers—the result and termination of my life. Am I to live but to see my flowers disdained, and my leaves burned.

It was not only a change, but practically an end. I was assured that it would be for the better. I was assured of the propagation of my fame. It was my vanity to have anticipated a luxury in fame, but a blatant publicity is my lot. Since then I have always regretted the narrowness of human assurance. Anyhow the colourful days are gone. I suffer so rude a process, as to lose my shapeliness, and the very essence of my life is burnt to ashes. Such is you devotion, lord of creation.

its revenue on armaments. In Japan today militarism is a religion, perhaps the only religion that is accepted by every good Japanese citizen, old and young. Thus we see that the political atmosphere of the world is darkened by war clouds and a world war, more fierce and destructive than the last great war, is imminent. In it, all the nations of the world will be involved and the whole world may sink deep into the unfathomable abyss of terrorism, and barbarism and disorder will prevail in the world.

The tendency of the nations today is such that they innocently plead for peace and at the same time prepare for war and, as a matter of fact, it seems that peace cannot be restored unless it is supported by strong armaments. If all the nations of the world grow strong scientifically then the world will be safe from the nuisance of war.

Alla Yar Khan,
IVth Year B. Sc.

and infinite sea of knowledge and erudition. He has a hunger that grows more ravenous as he feeds it.

From time immemorial the world has produced many great scientists of outstanding ability and fame and it will give birth to many more.

But science has contributed more to the modern methods of horrible and nerve-racking warfare, at the same time it has increased the amenities of our life. The achievements of science which have created new means for the devastation and anihilation of mankind have produced havoc in the political world.

The two biggest continents of the world are in the throes of war. The year 1936 will be a memorable year for Italy in which she swallowed up the age-long, independent Ethiopian Empire.

Again in the same year, civil war broke out in Spain and this sanguinary battle is continuing to this day. The war-torn West has affected the Orient and the spirit of war has penetrated to China and Japan. So in July 1937 the Sino-Japanese war broke out in the Far East. Since 1935 the world has seen three undeclared wars. Now blood shed and terror are rampant and humanity is massacred like brutes. Japan is rejoicing over the fact that she is blowing up innocent woman and children and other non-combatants. In a moment the innocent children playing in the fields, men working in the mills and factories and women and mothers feeding and nursing their children are reduced to ashes.

The strength of a nation is directly proportional to the extent of its armament. A country well equipped with machine-guns, aeroplanes, poison gas, arms, ammunitions and a strong navy, fearlessly challenges the other countries and each year every country is spending a large proportion of

The World We Live In

" For sluggard's brow the laurel never grows.
Renown is not the child of indolent repose."

The advent of the twentieth century brought into the realm of science many novel things and this scientific age is replete with various inventions and discoveries. We are breathing in a scientific atmosphere. The world and especially the European world has made great progress in the field of scientific learning. It has progressed a lot; it is progressing and it will do so in future.

The glorious achievements of science have left the world spell-bound and they have produced consternation and amazement in the hearts of men. If a man of the eighteenth or nineteenth century came to life, he would be awe-struck at the marvellous progress of his fellow men. Indeed, we do not need to call up a dead person when a villager of the twentieth century, who has not seen the outside world will serve our purpose as well.

The natural instinct of man is for an inquisitive search for truth and knowledge. Man, who is the head of all creation is endowed with such a natural gift that he has attained mastery over land, sea and air.

The more he knows, the more he desires to know. The field of his research is vast and limitless. He says that he is like a man gathering pebbles on the shore of a huge

'Why is my own and who is not when I am invited by all,

When my lord is awakened within myself.
Which is my hall ?'

No poet has till now been able to take the universe as his own. There is a strain, unheard of before, of universal love, which is ringing in the lute of the poet.

In his "Provat Sangit" we find the importunity of the poet to unite the universe with himself :—

'I shall pour the fount of mercy down
I shall break the stone wall down' etc.

In "Manashi", too, we find the same importunity :—

The dewdrop screams to quench the thirst of the earth,

The world knocks at the door of Rabindranath everyday.

He says, "every atom calls me". "From all sides in this wide world thousands, and more hands knock at my door."

What an acute perception! Tagore has been creating a wide imaginary world of equality and friendship with mankind in its entirety. We know not when his imagination will become a reality.

Shanker Mohan Lal Mathur,

B. A. (Senior), Osmania University.

Vaishnana literature, Shelley, Byron, Swinburne and Browning in English literature. Tagore will be the last person to deny the blessings of western education.

Rabindranath is the great idealistic poet. He sings of the sorrows of mankind. There is universality in all his poems. He tries to break down the barrier between heaven and earth. He tries to bring close the far away and very close, the nearest.

In a particular poem of his, we find how he realised the infinite in the finite. In his literature we find him trying to make the endless appear within the limit. He shows how the endless is akin to the limited in the following lines:—

'Conception desires to take its own form,
The form wants freedom in conception,
The boundless desires to the assimilated with the limit,
The limit wants to lose itself amidst the endless'.

In his 'Praktor Porisad' the poet has bridged the chasm which separated the Sanyasi from the household. The Sanyasi was ultimately united with the household, and the boundless was mingled with the limited.

The same idea he expressed in his old age :

'Deliverance by renunciation is not of mine,
Amidst strings without number in great glee
I shall enjoy the taste of deliverance
Filling up the earthenware of this earth over and over again
Of varied scented hue'.

The cosmopolitanism of Tagore is unique and can seldom be found in any other poet. He expresses the idea :—

The Poetry of Tagore

The deep mystery which hid itself in this known world has been explored by Tagore. We attain the goal, through his poetry, where the hungry human soul has attained the peak of perfection by being united with its desired objects. Deep down in the human heart there is a keen feeling of separation of which we find echoes in the poetry of Rabindranath Tagore.

How the Lord of the Universe has mingled His existence with the mass of the varied beauty of this world, how men noticing His revelation as years roll by, are eager to be united with him—these things are still dim and obscure to us. Tagore has opened the doors of our hearts and has explained all these happenings. The purpose of the Lord's advent in the midst of the world is clear to him. The poet causes us to understand that he whom we try to keep aloof, is dearer to us than one who is close by.

The life of Rabindranath is a drama of four acts. The first begins from the ninth year of his life, up to the composition of 'Provat-Sangit'. The second begins from the composition of "Chobi-o-gun" up to his forty-fifth year. This is the most glorious part of his life. The third commences from the forty-fifth year of his life up to his sixtieth year when he composed "Gitanjili", 'Gita Malya', 'Balaka' etc. The fourth begins from the sixtieth year of his life, when he composed "Purabi" and "Mahooa".

A great deal of influence was exercised over Tagore by Kalidasa the Sanskrit poet, Chandidas in

Climbing upon the bund I plunged headlong into the dark water. I did not know how to swim and the impact of my face and chest on the surface of the lake left me unconscious. In a few moments I came to and all I recollect is the going down of my body to the bottom and the going up of something out of me to the world beyond. Just then my head struck a rock, and the next moment I was up in bed, my heart still thumping with the remembrance of the night mare and of my death.

The sound of my head striking the rock was again heard —it was a knock. "Is that you Shanker ?" I asked. "Yes Sir, your morning cup of coffee, Sir."

S. M. Abbas,

No. 166, IVth Year B.

was going, I went on walking, my brain perplexed and my mind filled with the horrors and difficulties that would ensue. I was thinking of my constant failures in the same examination for the last four years and of how that affected my relations and friends. My younger sister had passed her exam. and had received a scholarship, my younger brother had entered government service, and I was the only unfortunate member of our little family who depended upon my parents. Although able to afford bread for an idler, my father had talked to me sometime before the exam, and had said that if I did not pass this year he would have me turned out of his house to earn a living for myself.

Apart from all this, the remarks of my friends and relatives haunted my thoughts, and the unlimited flow of satiric statements they would direct towards me after hearing of yet another failure. My heart sank at the prospect of wrath at home and comment wherever I went. I was thinking of escaping from these difficulties somehow but no definite plan had yet taken shape when my running into a tree awoke me from my deep meditations. It had grown dark and I was unable to trace whither I had wandered. A flickering flame ahead of me turned my steps towards itself. On getting close I found it to be a little stone structure built in the form a small temple with a wick burning in front of a stone striped with varied colours. This temple was situated on the outer side of a tank bund.

Not a sound was heard in this lonely place. My brain worked fast and I planned my deliverance from the world and its miseries, from my home which gave me comfort only when the examination approached, and from my friends who cared not to look upon one who had been so far left behind in the struggle for existence.

A Dream

The first day of our examinations had passed, and I lay on my bed reading the text book, as was usually my method of perusal. The very first paper had been spoilt. I took up the book on which the next paper was to come with the more concentration, but the worry about the day's bad luck could not but come in between my own self and the book I read. I got more and more confused as my train of thought led me to undesirable presumptions.

The night was fairly advanced when in the midst of all confusion and perplexity I found myself plying my way with difficulty among a large body of students heading for the university on a hot and sunny afternoon. All faces wore smiles but I knew the return journey would be a mixed affair of smiles and tears—we were going to see our results that were to be announced that afternoon.

The mob stopped in front of a big notice board, and one after the other the students satisfied themselves with a look at it. I pressed into the first row pushing with vigour all those who blocked my way. The board was full in my view and I searched for my name all through the columns. My heart beating fast, I realized as I read the last name, that I had failed in the exam.

The world darkened in my eyes. I rushed out of the thick gathering, and, with tears in my eyes, walked along a pathway. Not knowing or caring to know which way I

and philosophy. Deeper than this we catch new streams of industrial revolutions, machines, the great inventions whose sources and laws we have still to discover.

Is this all idealism or realism? If so has evolution in every field of life really brought progress? And are we to hope for the realisation of that one Being or power which has pushed life slowly onwards, towards more life, more mind, more power and more happiness? We hope to see that greater and fairer creation of which we have been dreaming so long.

What more evolution will bring before the world in the near feature is not known. Change is the order of the day though the current of evolution is slow but steady. It cannot be stopped; ours is simply to bow, and the wave of evolution may pass on. To put the whole thing in a nutshell in the words of Huxley, "It is not enough to hope or fear the rising of new forms, but we must concentrate to uphold the forms and ideals which have been hither-to the basis of human life and progress"

V. K. Purohit
(Senior Inter)

Darwin opened a wide field for research; there are thousands of fossils still to be studied. This many sided theory of evolution has many riddles to solve. It has given much opportunity to idealistic thinkers to revise their relation to the real world. It has brought before in the world new possibilities for the future.

All organisms are pushing towards a great change and progress. This is the age of human unrest; we are moving in a changing world. In other branches of scientific knowledge, evolution has brought about a new state of affairs altogether. It has showed us the study of sociology, by which we can learn and trace the growth and development of human life. It shows us how man adjusts himself according to his surroundings——social, political or economic. We hope that the so-called social evolution may bring better days; the success to which we have already reached is known. The great war of 1914, the Italo-Abyssian war, the civil war in Spain, the Sino-Japanese war, the doings of men in high places in Russia and Germany have opened our eyes. We at once desire peace --a better political evolution.

We are seeing glimpses of the new revelations of science, which have traced the growth of organic life. Man who has discovered many secrets of nature for the benefit of the world is paving the way to a high plane and hopes to rise still higher. This is all the latent influence of evolution. It tends to elevate the human race.

At such melting points many 'isms' are raising their heads and playing great havoc in the world. The development of the human brain has come to the stage of, to be or not to be; great, thinkers of the world have left their own ideals for a great wrestle; and which ideal will turn the balance is doubtful. This is how evolution has influenced even ethics

the great struggle for existence. It is seen in nature that new species are produced while old ones disappear. In nature there is rapid multiplication and it is seen always that the offspring vary slightly from the parents and they always exceed the parents in number. If this huge increase were not checked the world would have no space to hold them. Some organisms die before reaching naturity they kill each other to have their own place. Nature also destroys some of them. Thus the vast increase is checked. Only those that are hale and healthy live and those that are weak and not fit will perish. This is how Darwin sets forth his assertion of "survival of the fittest" on which rests his evolution theory.

His theory of evolution has shown the world the idea of struggle for existence and the idea of natural continuity and the idea of the advancement of life step by step. Although it deals with the single branch of science (mainly the development of all organisms) at the same time this motive power has infused the idea into other fields of thought. It is with this theory only, that great scientists and other leaders of thought are diverting their energy to trace origin and growth in all the organic world. It has brought a great revolution in biology, thousands of animals and plants have been classified under the head of this theory only.

The theory was studied in the development of life at different stages in different aspects. From the results of this only, he suggests that the present human being is the result of thousands of years of evolutionary advancement. He tries to prove that the ancestors of the present human beings were monkeys or ape-men. Whether it is a fact or fiction cannot be discovered. Many critics have given different opinions, and they will always do so. This much can be proved that with the evolutionary process we find the greatest progress.

Evolution.

The greatest change that is taking place in every field of life is evolution. It is not in one thing, one organism but in the whole universe that this change is taking place there is change in body, mind, energy, idea, and even in each cell of the body. This vast change that is taking place in all the organic and inorganic world is really a great question.

Life is not fresh but always springs from the pre-existing state. So cities and nations, as well as other organisms, whether plant or animal have their cycles of birth and death; and out of death alone comes fair and fresh life.

The idea of progress from a lower to higher form of existence is not a new one. From time immemorial the life of the race is pressing towards a great change and reconstruction. We live in a peculiar and critical character of the age. It is a period of immense and rapid change. Nature knows the perfection towards which it moves and the greatness of which it is capable.

At such a time a Newton of Biology, Darwin brought his great theory of evolution into the world. His theory has shed a flood of light over the whole scientific world. It was the result of his many years of practical experiments, his burning desire for science, above all, his great and patient research that his "Origin of Species" was brought before the world. He proves in it the gradual development of all organisms, whether plant or animal. He has shown in it that there is keen competition between all organisms in

for the opportunity you have kindly given me to stand before you today but I am afraid that I am not in a position to do full justice to the subject because the Secretary, in spite of my request, did not inform me of the exact date of the lecture. Therefore I request you to excuse my inability and judge kindly my extempore talk." (If anybody cares to search his pockets, I am sure, copious notes can be found). Thus he goes on shifting all the blame to the head of the poor Secretary and taking all credit to himself.

Thus emerging from all odds, the Secretary's last effort will be to conduct the Union day celebrations successfully. But even there he is not allowed to carry off the laurels. After all, one worthy friend is certain to turn up and say, "As a friend, I sincerely advise you to return our subscriptions. Do you know that I at least, did not get a single cup of tea in your wonderful Social Gathering?" Another will remark, "To give the devil his due, I drank only a dozen cups of tea, but I am sorry to say, sufficient sugar was not put in it. After all, the Secretary should keep a strict eye on all such grave matters".

What a responsible job? And what a thankless one for the unfortunate Secretary. Let him console himself that—

"Honour and shame from no condition rise,
Act well thy part and there all th'honour lies".

"Socrates"
M. A. Class.

"I say, by-the-by, when do you mean to hold the installation ceremony and arrange debates ? Well, if you delay, you will be condemned for being idle"—will be the threatening words which a secretary may often hear, perhaps even on the day of his taking charge. His fate and office lie in everybody's hand and he is in constant fear of all. He is everybody's servant and nobody's master.

If it is held this week, will you propose a subject for debate ?" requests the Secretary.

"Oh ! Heaven forbid ! We come to the debates not to work but to amuse ourselves."

"In what way ?" will be the question. "Don't joke at my expense. Why, we giggle, and amuse ourselves at the tomfoolery of our venerable college orators who come to the platform with all the pride of a Cicero or a Demosthenes, and not knowing what or how to speak prove themselves to be baffoons in a circus. What will the audience in a circus derive from those lobby spirits ?

Of extraordinary meetings and more important than those, the public lecturers much can be said. Yes, their benevolent condescension and extempore erudition are worth mentioning. Generally the speakers hardly understand what amount of help the secretaries render them by giving them a chance to address distinguished gatherings where they may earn a name for themselves. Yet they trouble the secretaries by asking them to come over once to discover the subject of their lecture, another time to let them know the chairman, a third time to remind them of the date and the hour and lastly to convey them to the hall in a taxi.

In the end, do you know what the lecturer usually does in the Address Hall ? At the very outset he prefaces his speech thus :—"Ladies and Gentlemen, I must thank you

Mr. Secretary

"Hullo, Secretary! Congratulations, when can we expect a party?" will be the first salutation of friends after the election day.

"Thanks, and why should I give you a party?" will be the reply.

"Then, is it for nothing that we elected you Secretary? You earn all the name and popularity in the College because of our votes."

Thus is he obliged to everybody, and in trying to please all displeases every one. This will be the beginning of the end of his dreams. But if he really understands the duties and responsibilities of his office (which in fact, is not always the case) brushing aside for a while his dreams of popularity, he must at once enter into the real work. Without assuming superiority over the students (in truth, he puts on airs and thus becomes unpopular) he will serve everybody and have a pleasant word to say to everyone.

"Good morning, Secretary Sahib, how goes the world with you?" may often be an ironical question put to him.

"Why round and round. Thank you for your kindness."

Absurd. (The Secretary is startled and stares at him thinking that something unnatural has happened either in his conduct or in that of the world.) Not at all extraordinary if it goes topsy-turvey with a secretary" will be the reply.

whereas no pack contained a queen that had then on !—A mischievous friend suggested that he would look so if they were removed and he was angered; but if it is just to call a spade a spade, it would be equally so to call a queen a queen, eyeglasses or no eyeglasses.

Then there is a gander who floats like a swan and was furious when he was called a duck.

Then we meet a nabob who reminds us of the elephant in its infancy, when, according to some fairy stories, it has not grown its trunk.

Then the another finds that he has brought in almost all those personalities whom he knows to be famous and that his writing has come to an end.

S. M. Abbas,
IVth Year Class.

Then there are two brothers one of whom goes east while the other goes west, but the twain meet in the hearts of their common admirers—a pretty place to live in all by oneself, but not to share with another.

Then there is a young man who has grown too tall for his appearance and is hence called "the double-storied beloved."

Then we come accross several pairs of young men, always together when they have no classes, also when one has not—the other comes out of his own—and each leaving the other as far as his classroom and returning from his own to find him when the period is over : this in the case of both being obliged to attend.

Then of such, one deserves mention whose name only would serve our purpose : it is called "the international pair", but the pity is that the admirer is a fresher whereas the admired is in the B.A. class and has never had any experience of being really appreciated.

Then a list of the heroes end and a list of such as are popular for their peculiarities begins.

Then there is an old woman, so called for his sympathetic habit of adopting and protecting teasable newcomers; who is proud of his wisdom but always makes of himself a big fool; who is hooted on the platform but never fails to make his appearance at a big gathering; who is always defeated in pingpong but seldom fails to bet; who is over zealous in politics but is ignorant of his own policy; who is obstinate and is never willing to be corrected.

Then a story is told of a student who complained because his brother was called the "queen of spades", and he ridiculed the idea arguing that his brother wore spectacles

Then an example of " nearness ceases to attract " is set by a good looking young man of the second year class, who has thought it wise to mingle freely with the admirers to attract their attention towards him; and his aloofness and reserve of last year, which made the crowd stare at him as he stepped down from his uncle's car to walk the distance to his class, has disappeared, much to his own satisfaction, perhaps;—still he would never be disregarded by those who admired him then, and still do, but are yet far away from his favours. Once those are granted the interest fades.

Than there is a comely young boy who has been repeatedly warned by his admirers not to walk in the hostel corridors in a shirt barely reaching his hips, and heaven only knows whether or not the last warning and the suggested punishment in case of disobedience has done any good.

Then we come across a young man whose slanting cap would never conceal his curly hair; he apreciates distant admiration but rejects closer ties; is always rapt in thought—often gloomy and full of pessimism, and talks seldom; he shared a room, when in hostel, with a prominent figure well known for his late rising in spite of his early call, for his rejection in a certain competetive examination in spite of his strenuous labour, and for his bringing upon himself the opprobrium of a nickname in spite of his suggestion of the same for some other person ;—he is a cock, but crows too late.

Then there are a number of second classes, to give a detailed list of whom space does not permit ; and it must suffice to say that they always try to attract—even more so than the members of the first list—but naturally fail, and the greater the distance kept from them the less is the substantial loss : they make their admirers pay for their comforts and reward them with scorn.

Personalities

The college bell rings and a stately form emerges from the liberary doorway followed by aclatter of footsteps. Then each individual of the group rushes forward so that he may be the nearest to the handsome young boy renowned for his straight and slim figure, uncapped head, erect neck, raised chin, graceful gait and dancing steps, and cheeks hopping with every. Then all eyes, near and far, turn towards him to trace his way to the Biology Department. Then at every bell this demonstration is repeated until he disappears into his classroom—and whispers ensue, and petnames and nick-names fill the atmosphere.

Then a mischievous set of seniors passes the window where he sits and hands over to him a verse one of them had composed overnight, or calls his name aloud that he may turn and they may have a chance of meeting his steady gaze, and of winking before it is too late.

Then a host of others is standing at the adjoining department teasing another boy who has already had one year's experience at the institution and who was sure his day would pass with his first academic year; but that is not so, for, one day or one year, beauty will always be admired, and distance and lack of intimacy always have a great fascination. Then he leaves his classroom at the end of the period with a little dark boy, and the hunters begin their game. Then a shower of tiny bits of stone falls on the curly white and a shower of heavy ones falls on the not-at-all-respectable black.

The time is ripe, now, to take steps to promote a system of complementary production and co-operation of Central Banks for an international co-ordination of credit. Future economic policy should discourage the less and encourage the more efficient forms of production in each country. Thus the world can realise its long cherished desire of obtaining an economic equilibrium and everlasting peace.

In short, there is no reason to despair of. The centuries that followed the fall of the Roman Empire were a far worse experience than any-thing we are facing to-day. The duty of every citizen is to keep up his spirits, try to rehabilitate the position of man and ameliorate the condition of the dumb masses. He should co-operate in defence of justice and peace, learn to sacrifice himself for his fellow-beings and foster the spirit of inter-nationalism. Thus equipped we are in view of a bright future which would weld together the separated brethren. And brotherly love would bridge the gulf of difference between nation and nation; peace and prosperity would reign and make the world a 'fit abode' for humanity.

Muslehuddin,

Hyderabadad-Deccan.

federal bond would take the world half-way towards an ever-lasting peace. "It is not necessary to convert all the nations of the world to free trade and world controls, before world controls are established. At most Britain, the United States, Germany, France and Russia need be converted" says Mr. H .G. Wells. The league should include all the States of the world and its members, specially the Great Powers, must be prepared to make sacrifices for its sake, refer all important issues to it and agree to abide by its dicisions. This can be achieved more successfully by a system of education well devised to create the international habit of mind among the peoples of the world. Thus equipped the league can work wonders by its work in the economic field with its economic organisation which would serve to rehabilitate it in the eyes of the world and go a fair way to establish peace and prosperity. Time is, now, to exert its influence and benefit by the trend of modern economic events.

FUTURE PROSPECTS

Certain tendencies of the present-day-world may indicate the direction in which the world economy is moving. The world has abandoned its policy of 'Laissez faire' but still there are ever widening circles of free trade. The inter-imperial conference of Ottawa marks a tendency of the Common wealth of Nations towards lowering the tariff walls within its dominions. America has realised the folly of sticking to the 'New Deal' and it is not opposed to internationalism. Japan and Germany, in order to promote external trade, are ready for international co-operation. France is following in the foot-steps of Great Britain and is craving for peace and internationalism. Above all the interdependence of the financial mechanism of the world itself would sooner or later make for an international agreement. All the existing circumstances suggest that the competitive system, in future, may be tempered.

THE REMEDY

Nostrums proposed for this economic crisis are man and the solutions offered by economists are different. Some put forward an earnest and sincere plea to overhaul our economic structure and condemn the evils of the industrial system. The real remedy, however, lies in the complementary system, the cancellation of war-debts and the willingness of the creditor nations to buy and to lend. Organised labour, minimum of work and maximum of wages, can eliminate the evils resulting from the unequal distribution of wealth and unemployment. Delayed marriages and free influx of immigrants, on the basis of mutual understanding into countries with large tracts of land, may put an end to the problem of over-population—a potent cause of war. The restoration of the relative freedom of trade by lowering tariff walls and co-operation between the central banks to stabilise the value of gold, would lead to the solution of the gold standard problem and unbalanced trade. The external and the internal consolidation of the 'sterling group,' would have the effect of helping the world in proper economic thinking and the stabilisation of an international gold standard would be conducive to economic prosperity and world peace.

Last but not least are the resolutions adopted at the Paris Congress of the International Chamber of Commerce—the stability of exchanges and the lowering of tariff barriers. These resolutions, if translated into action, would dispel the clouds of economic depression and root out economic nationalism which has been the bane of human society.

The lasting peace of the world depends upon treaty revision and the restoration of the prestige of the League of Nations. Not only should it be strengthened but the covenant recast on the lines of a World Federation. "A federation of world shipping and over-land transport by a

remained unbalanced. The National Industrial Conference Board announces that the number of unemployed in the United States rose in may, 1935, to 97,11,000, a increase of 5,10,000 over the total in May 1934.

Is it not strange that over-production should starve the world and make the problem of unemployment more acute; that the dazzling progress of science and the astounding increase in wealth should render humanity penniless?

The penetration into the root cause of this grave situation and the careful diagnosis of this debilitating malady besetting every nation and the finding of proper remedies would restore the world to its healthy condition. What is that malady? It is Economic Nationalism.

THE VERY WORD—ECONOMIC NATIONALISM—

Conjures up an idea of a spirit detrimental to internationalism, destructive to humanity and suicidal to the world itself. In this new economic craze the interdependence of world economic order has been ignored. To provide for economic self-sufficiency at any cost seems to be the most popular of party cries at the present moment.

The spirit of economic nationalism is reflected in post war currency depreciation and state support to develop internal as opposed to the external trade; in the abandonment of the gold standard and the substitution of a managed currency to solve the problems of foreign exchange. The tendency of the United States and Great Britain to raise prices by depreciating the external value of the dollar or the sterling and failure to return to the gold standard make it obvious that nationalism is the dominent fact of the present economic life.

Revolutionaries in different countries of Europe became disgusted with democracy and have begun to make experiments in methods of more rapid and more direct action. They have no regard for public opinion. Half Europe is ruled by dictators who scoff at democracy and create a servile type of humanity.

Dictatorship stands for subjugation while democracy is based upon freedom; dictatorship breaks heads while democracy counts them ; while democracy stands for force of argument, dictatorship stands for force and tyranny. But with all its vices dictatorship is gaining ground because the modern dictators have adopted new methods of attracting people. 'The countries under the heel of modern Caesarism' says ***Bailor***, "have developed a new psychological insight : they know that morons in glittering uniforms, parading in fatuous swagger, are a more convincing appeal to the youth of the country to join its colours than any cogent and reasoned presentation of political exigencies.

Economic depression hangs like a blight upon the world which is in its ever tightening grip. The failure of the world economic conference forebods an evil day. The gold standard has been abolished and this has shattered the monetary system and as a consequence fluctuations in currencies have have led to unbalanced trade. War debts have compelled the debtor nations to produce more and consume little which has brought about over production.'

The recent report of the economic committee of the League of Nations on "The Present Evolution of Agricultural Protectionism," proves that the present policy of the world has created artificial price differences which hinder exchange, has interfered with the normal functions of international trade and tended to prolong depression. The budgets of France, Italy, Germany and the United States have

them has no parallel in their history. The Nazi movement has become the terror of Europe, it over-took Austria and poor Dollfuss succumbed to its onslaught.

Look at the Chines nation struggling for liberation and trampled down by Japan then a member of the League, by the signatory of the Kellogg Pact, by the only civilised nation of Asia. Although the revolutionary doctrine of communism has gone deep into every stratum of the Chinese Government and the wrecking of the South Manchurian Railway track under Japanese protection proved the last straw, yet the Chinese action never amounted to any violation of or inter-meddling with the Japanese rule, nor was it any encroachment upon its territory. But Japan, the great nation of the so called civilised world would not tolerate the least interference; it dealt its neighbour a fatal blow, bombarded its population and laid waste its towns. Not satisfied even with massacre, the blood thirsty monster—Japan—has spread its gready mouth to engulf the whole of China.

Again the rabid monster of nationalism reared its head and one more country of Europe is under its thraldom. Mussolini, under the pretext of civilising the Abyssinians, laid his hands upon their country. His actions are in flat contradiction of the ideas on which the League is based. He mobilised his forces and trampled to dust the sons of that land.

Pacifistic France, one with Italy in denouncing the resistance offered by Abbyssinia, has affirmed the principle of aggression. In the absence of collective responsibility, the efforts of Britain to save Abyssinia from the iron clutches of Mussolini were fruitless.

tactics. We have become lovers of Mammon and the golden principle of 'low living and high thinking' is no more. "Inflated with success", says Rudolph Eucken, "we have become the mere tools and instruments of an impersonal civilisation which rides rough-shod over nations and individuals alike, ruthless of life or death, knowing neither plan nor reason, void of all love or care of Man".

The fundamentals of civilisation-service of humanity, self-sacrifice and fear of God have paled into insignificance before the glamour of materialism. Bolshevik Russia, a devotee of the all-devouring Mammon, has no faith in religion. "Banish God from Heaven", is the national cry. Germany, because of her crushing defeat in the Great War has renounced her faith in Christianity. "Only through the complete renunciation of Christianity will the German people achieve the unity which it needs and which would have saved it in the trying days of 1918," says General Ludendorff. Italy cares more for her expansion than her religion, and feels no compunction even in slaughter to gain her ends.

Other aspects of the world are still darker and call for a separate elucidation. The world has, at present, been rent ascender and divided into numerous small water-tight compartments by high tariff walls raised between nation and nation. Instead of transcending the barriers of nationalism, there is an ever-widening gulf of difference between man and man.

The revolutions of modern times have been generated by political or economic forces. The Nazi uprising has been fired and dominated throughout by race hatred. Crushing disabilities imposed upon the Jews and the galling limitations heaped upon them signify a reversion to the intolerance and barbarism of the Middle Ages. Never was Jew-hatred preached with such vitriolic fury and the calamity which befell

What Man Has Made of Man!

The world in which we live is drifting fast towards the Slough of Despond, but Ferrero affirm "The modern world is great, rich, powerful, wise : it can boast of having created the most humane civilisation in history In spite of all the defects with which we can reproach ourselves, never in history have the relations between men and classes been so full of a spirit of kindliness and justice." How far is this true? Are we soaring high towards etherial spheres or falling back to our ape-like ancestry in atavistic retrogression? Alas! the latter seems to be the case.

Behold the march of the times and the irony of fate : human beings preying upon one another some rolling in luxury whilst others, groan under the pinch of poverty. The great powers are armed to the teeth ready to pounce upon one another as birds of prey and only waiting for an occasion. World expenditure on unproductive things is enormous and national wealth is being squandered on armaments. The great nations have been madly seized with this hysteria despite the alarming numbers of the unemployed. All the efforts at ending war seem to be wrecked before the selfish motives of man and an ever growing desire for capturing new markets.

MODERN CIVILISATION :

Our civilisation has lost its real charm and value. The interior of the so called civilised man is far different from his exterior and politics have become synonymous with

can be utilised not only for ushering a new era in Hyderabad but also for their effective representation in life.

We should not expect a millennium waiting for us but do our best towards the creation of a new and more perfect world.

Mohammed Bin Omer *B.A.* (*Osmania*).

of the world should be a fight between capital and labour at our very door and should rouse us to the help of the oppressed against the aggressor, from a moral sense of duty. If there is no need of making students conscious of the political developments taking place in his own country and if there is no necessity for him to be alive to the important questions of public importance on which not only his future but the welfare of the whole country or nationality depends, then the books on politics should be set on fire, and newspapers banned.

There seem to be nothing so objectionable as imparting a similar education to boys and girls knowing well and believing for certain that they have to fulfill different responsibilities. Education must be adopted to serve the needs of students' community and not the community itself be made to adopt itself to a system of education. It should be a matter of grave concern to the authorities concerned that the number of girls going to schools and colleges is seven times less than that of boys. This state of affairs is highly unsatisfactory, for in the making of modern Hyderabad educated and enlightened women are of as much importance and signifcance as men.

Changes cannot be wrought in any country by doing nothing while hoping for the best. It is necessary to come down for lofty intellectual heights of philosophic contemplation to survey the practical difficulties of the children of the soil; and it is equally essential for the students themselves to realise their own vitality and dynamic potentiality absolutely dependent upon unity, consciousness and solidarity, which

pleasures of a student's life while a few border on boisterous vociferation and hilarity displeasing to a sense of propriety. Though irresistible chains of brotherhood bind us together yet there is no genuine feeling of sacrifice of that sensation of all being in the same boat which helps human beings to rise with one voice, to fight with one mind and adequately to safeguard their rights.

Gradual westernisation in costumes, habits and thinking seem to be the most glaring defects of modern education, giving birth to an imitative and slavish mentality, marking a regrettable departure from all that is best in eastern civilization and culture. Demonstration of religious indifference, showy ignorance of long practised ethical codes and light treatment of names held sacred in the religious world are the germs that are stealthily poisoning the student's life. This is all the more pitiable in face of the frantic efforts of repentant Europe at moral and religious resuscitation.

This is a time when deeds of heroism and patriotism have taken the place of sweet lullaby and fairy songs over infant's cradles in Europe. At school and out of school, children are made to understand the rise of Il Duce, the Fuhrer and Stalin by means of simple stories and charming songs. With the increase in age comes in the explanation of the economic and political docrines of democracy and dictatorship. By the time they become young they are able to grasp the currents and cross-currents of the sea of politics, intellectually and spiritually alert to political problems, and capable of associating themselves with what they conscientiously believe to be right and prepared to sacrifice their all at the national call. The fight between Fascism and Bolshevism, Imperialism and Communism in any part

as a scheme inaugurated with the best of intentions but with the worst of results.

The students themselves cannot escape censure for their fortitude and suicidal indifference towards such essentially momentous problems on whose solution hang their future prospects. It is one of their most sacred duties constantly to revert to them without fear of criticism or thought of favour.

It is indeed painful to expose the apathy and unconsciousness of responsibilities, and the tragedy of indifference silently eating into the very vitals of students' lives. We have no definite aim of education to lead us through thick and thin, like a guiding angel beckoning from high. A young student goes through the routine of a prescribed syllabus as a hack, dreadfully approaches the examination hall to get rid as early as possible of what the teachers have directed him to cram; secures a degree if he is fortunate, not by his initiative or resourcefulness but by the art of photographic reproduction. No sooner does he wear the gown, then he forgets all about Sciences and Arts! The course of time sees him swelling either the rank of educated unemployed or toiling over a heap of files in some dirty corner of an ordinary office under an officer who has never been to a college in his life; making a laughing stock of himself by ignorance and inexperience and brooding over those years of life when he had no anxiety for the morrow or any thought of future. Marriage comes to the relief of the dulness of office-boredom but brings in its train inordinate expenses, inextricable cares, dominating debts. The time of retirement finds him disgusted with service, tired of life and wearily waiting for death.

Our social life has become more or less lethargic. Most of us live a life of seclusion away from the activities, joys and

(and who more often creates hatred of rather than interest in a subject) nor taxed his brains in finding out the peculiar bent of mind of the pupil in charge, often commits a fatal mistake which leads to disillusionment, where he heaps curses on his choice, teachers and the system of education itself ! Many students have fallen a prey to this fundamental error of our so-called system of education which has outgrown its utility and efficiency.

The machinery of limitation in absence of a collateral arrangement for the proper consumption of not a few outcasts from the temple of learning, is bound to do more harm than good ; for only a limited number of them can join the college classes and the rest are left to their own fate. Government offices slam their doors against their faces, parents chide them for having wasted time, money and energy over useless pursuits ; and society does not lag behind, sneers at their miserable plight. Their education neither equips them to earn a livelihood nor helps them in any profession. Absence of agricultural, industrial and technical education prepares them for nothing but government services, for which they are whole-heartedly condemned for no fault of their own. Had the government started vocational training before launching this experiment, they would have been harassed neither with the problem of unemployed educated people nor the spasmodic cries of disapprobation raised from platform and the press against the universally condemned policy of limitation of higher education as the students interested in machinery and industry would naturally flock to various callings, leaving those who are so gifted to plod the labourious way of academic honours. The policy of discouraging University education without making paralled arrangements for the consumption of students in practical departments of life will go down in the history of education

Hyderabad Calling

I feel a wave of enthusiasm running through my body when I hear somebody speaking, "Hyderabad calling", on the microphone of H.E.H. the Nizam's Broadcasting Station. Yes, it is Hyderabad calling in unequivocal terms to the spirit of enlightenment and regeneration in the youths of the country. But the youths appear to be shrouded in callousness. They are bankrupt of that spirit whose flames have saved tottering countries, whose bursts have given life and vigour to paralysed nations. They seem to be unconscious of the great responsibility which they owe to their country, their families and themselves. With the exception of a few sporadic flickers of misguided zeal ending in smoke there is nothing but calmness on the surface where these should be heaving currents. They are like a sheep without a shepherd blindly led anywhere and everywhere by insidious propaganda without scrutiny or analysis, or even considering the pros and cons.

Schools and colleges do not prepare them to face the grim realities of life. They are accustomed to live in a fool's paradise. The school career which generally imparts colour to the tastes and aptitude of a student in sufficiently advanced countries, and strengthens his sense of judgement in determing subjects for specialisation, ignominiously fails to render the requisite service for us. The immature mind of a young student brought up under the educationally unconscious minds of parents and under the tutelage of a teacher who has neither devoted his attention

LOOKING 'FORWARD'.

But Iqbal does not fall into despair. He believes that the Islamic humanism is still a living force and will work for freeing the outlook of man from geographical limitations, and that "it is itself destiny and will not suffer a a destiny". He feels that Europe is gradually realising the initial mistake it made in trampling over the moral and religious convictions of Christianity and resolving itself into a set of mutually ill-adjusted states dominated by interests not human but racial and territorial. He feels that even these mutually ill-adjusted states are to-day subconsciously feeling the need of a federated Europe, feeling the need of a unity which the Christian church organisation originally had given them, but which instead of reconstructing in the light of Christ's vision of human brother hood, they considered it fit to destroy under the inspiration of Luther. Iqbal, therefore, feels certain that as the modern world will pass through the throes of its own civilization and see its own handwork shattered by its own hands piecemeal will it betake itself to the humanism that should prevail to unite mankind.

Till then he would insist that wherever even a semblance of that humanism exists, whether in the East or in the West, and by whatever name it goes by, it should be preserved, at all costs, as a noble heritage of mankind.

In the materia medica of the West are but sweet
narcotics.
The heated discussions at Peace conferences,
Are but the camouflage of capitalists.
Thou takest mere illusion for a garden,
O thou fool! a cage for the nest"!

The above outburst is due to the fact that the democracy of the Western states of Europe does not fit into his humanism. Nor has he any gentle word for the Communistic order of life in Soviet Russia, or for Fascism or Nazism. Marx, he thinks, would like to idealize equality of bellies, and Nietzche, the inspirer of modern Germany, would exult at the elimination of the weak. Even the League of Nations, he thinks, is a society formed to parcel between themselves the shrouds of dead bodies. Iqbal's humanism would have none of these. He fully recognises the immense value of the sciences that Europe has developed. But he bewails the fact that the human touch is lacking. In moments of trial, they betray humanity, in the name of territorial nationalism! He also would heartily appreciate the life of action which characterises Europe, but is grieved to see that action does not express itself in the universal good of all mankind. His faith therefore holds anchor in the humanism he identifies with Islam; and even when he looks at the condition of those who are the recipients of this heritage, viz., the Mussalmans of Arabia, Egypt, Syria, Turkey, and Iran, he fails, to see that humanism existing in their midst in any striking form. The European sense of nationalism has cast its snare so powerfully all round that he fears that it may racialize ***even their outlook.***

and soul is the humanism of the Semitic land, standing midway between the East and the West, the humanism which has given to the world a Christ and a Muhamme humanism that brushes aside all barriers of colour and race and country that stand in the way of the fullest fellowship between man and man all over the globe.

PRESENT DEPRESSION.

It is under the searchlight of this humanism that he looks at the world and ponders over its problems. The talk of nationality in India seems to him but a hollow talk. The basis for that common moral consciousness which alone could bind a people is absent here, he thinks. India is to him Asia in miniature, a congerie of caste units showing no inclination to remove the divisional basis of their several group-lives and sink their respective individualities in a composite larger whole. He thinks that true democracy cannot thrive on a foundation such as this. The formation of a common moral consciousness calling for social equality which is the essence of a nations; demands a price, which Iqbal thinks, the people of India are not, at this moment, prepared to pay.

Under the same searchlight, he looks at Europe, and the sight fills him with grief. Says he in the '***Khizr-i-Rah***'.

"The democracy of the West is the same old organ,
Which strikes the selfsame note of Imperialism;
That which thou regard'st as the fairy Queen of Freedom.
In reality is the demon of autocracy clothed in the garb of democracy.
Legislature, reforms, concessions and rights

And to me, at every stage of his poetic growth, he has appealed pre-eminently as a humanist. Humanism serves as a perennial background to all his utterance. Sometimes it is so pointedly in the fore-ground that it will be sheer unkindness not to recognise it as the mainspring of his genius. If, as in the spiritual vision of his ***Jawidnama***, India interests him, if it pleases or displeases him in this or that aspect of its life, it is because he allows himself to react to it as a humanist ; if he feels distressed over the present day condition of the Muslims all over the world, it is his humanism that feels afflicted ; if Europe to-day looks to him a wilderness of aggressively selfish nationalities, it is the humanism in him that revolts.

Iqbal stands for all that is beautiful in life and holy and of good report : and he is anxious to see the world fashion itself out under its living inspiration. He wants to see human life take a stand on its own human dignity, and set itself free from narrow tribal, racial, class or territorial temptations, and evolve a brotherhood extending to the ends of the earth which howsoever distributed into groups by the exigencies of time and space should hold together a common moral conciousness, and be linked to each other by the ties of common humanity. That is the order that he would like to see established on earth and to which he has dedicated all his Muse.

Iqbal's humanism is a matter of conviction to him. As a student of world history he has been inspired by humanistic movements throughout the ages. His writings reveal the influences of the classic humanism of the West, glowing in the course of history into Christian impulses; they reveal also the influences of the humanism of India, and even of ancient Iran. But the humanism that has captured his mind

"THE HUMANIST"

People have called him by all sorts of names. It is so easy to give names—without knowing! Some call him a communalist, a reactionary. Some go a step further and use better language! They say that he started as an Indian nationalist and developed into a pan-Islamist; they even call him a champion of aggressive Islam.

Gentlemen, if you belive me, Iqbal will outlive the momentary use of all these terms, because none of them really reflects the truth about him. As every young man, he at first liked the Immediate. That is the feeling of every one who passes from childhood into adolescence and from adolescence into youth; it is the Immediate that attracts. Knowledge and life are at this stage circumscribed, and one begins to think that the best in life is in himself and in that which he finds near about him, and he idealizes his own home and he fancies that the rest of the world is of no consequence and is necessarily of an inferior order. So has it been with Iqbal. Before he grew into manhood, he sang of India. That was a time when a wave of nationalistic thought was mildly touching the intellectual classes in India; and Iqbal sang of the land of his birth and of the beauty that he fancied it possessed. And then begins his manhood. It opens its eyes in the atmosphere of Europe. The time of manhood is one of experience, of adjustment of values, and this experience he brings with him as he returns home. And then follow reactions to this experience pushing him forward into a state of maturity. If you want to understand Iqbal, you have to bring the whole of his life under review. You cannot cut him into sections and subject him to indifferent evaluation under the stress of unkind political catchwords.

I have tried to understand the mind of this poet and have followed, at times, a very searching line of analysis.

day. Only recently, I had occasion to dwell with him for a little while under the same roof at Lahore and catch something of his look and listen to something of his plaintive morning note. What is that look like and that note? Try to review his entire poetic output in one quick glance and you can visualize somthing of that look and inwardly listen to something of that note even from here.

The look is that of a political mystic born to poetry. The note is the note of humanism drawing inspiration from the eternal verities of human life. Wearied in body, and weariness reflecting itself from every feature of his countenance, he retains that glance of his eye which has kept him company all through his life, the glance of a political mystic piercing into the dark spots on the life of nations to comprehend a life to come, a life of emancipation for humanity from the self-imposed shackles of social, intellectual, economic and consequent political thraldom. That is the glance of Iqbal. Now note the voice that proceeds from him. A malignant disease of the throat has rendered that voice somewhat hoarse of late; but its hoarseness cannot conceal the sharpness of the painful ring that it strikes echoing all round the disturbance gathering in his soul by the fearful reaction of his external world divided into jarring political creeds, born of narrow racial or territorial nationalism bent, as he thinks, on its own destruction. That glance of his eye and that ring of his morning voice will live in his poetry to warn and inspire the coming generations because the glance is rivetted on the primary weaknesses of human nature, selfishness, and greed, and exploitation of the weak, and because the voice speaks but the truth which alone will save human life, the truth as handed down to him by a successive order of sages and prophets who have worked for the unification of the human race.

mediate interest and I propose to give you only a synopsis of it.

'POLITICAL MYSTICISM'.

I have used the expression 'Political Mysticism' to designate the effect Iqbal has left on me. That expression, I should think, sums up his contribution to world thought at this moment, and I have no doubt in my mind that posterity will judge and remember him by that contribution. It points to an eternal message of life such as has always dwelts in the very soul of nature; and holds out an ideal of corporate life for mankind such as is so sorely missed at this hour every where.

I know, in this great gathering there must be scores of men and women, who have read the poems of Iqbal times out of number and they will bear me out that the poet is spiritually averse to speaking out his mind in clear matter of fact language. In the ***Jawidnama*** he himself confesses:

> This artifice of words is of no avail;
> It does not at all express what my heart contains.
> I have disclosed many a secret;
> But one there is which words never sustain,
> The more I speak of it, the more intricate it grows.
> The word and its sound drown it into deeper obscurity.
> Catch it from the glance of my eye!
> Catch it from my plaintive mornig note!

So, you and I have to catch the meaning of his painful music, his poetry, from his own look or from the plaintive half suppressed note that goes out from him every morning the moment he opens his eyes to the realities of the opening

Iqbal and World Order

Addressing a distinguished gathering on the Iqbal Day held at Hyderabad-Deccan on the 7th January under the presidency of His Highness the Prince of Berar, Dr. Syed Abdul Latif said:—

Iqbal is not merely a great poet but a great philosopher; and I have wondered whether I could lay emphasis on any one of the two roles more than the other. There was a time when I read his poetry with enthusiasm and tried to catch its strains and follow him into the depths of his feelings or soar with him along the flights of his imagination or fancy. But that was when I could feel poetry for its own sake. As years have advanced, interest in life's poetic expression has had to demand something more than mere aesthetic self-satisfaction. And there have been moments when I have tried to catch the strains of his philosophy as well, and to look at the world, its history, its problems, its very future through the inspirational vision that his philosophy has supplied. That poetry I could still feel to-day and the voice of that philosophy still hear; but sectional approach to him seems for me now well-nigh impossible. The two are so inextricably intermixed that his utterance appears to me neither pure poetry nor pure philosophy. It is a mixture of the two blended into a political mysticism transcending them both. And so, as I look back at this hour on all his poetic achievements and inwardly wade through the entire range of his poetic experience, what picture of a poet does he flash across my mind? What does he stand for through all his utterance? That is the subject of my im-

2. 'The individual composed of contradictory characters like a mythological monster'—that is the object that Pirandello prefers to study.

3. Quotation from Pirandello: 'We are all drops on the brink of the river of life, splashed out of the eternal stream, permanently fixed in death. For a little while the movement of the eternal river continues within each separate drop of water, but soon the movement subsides, the flame cools, the form shrivels, and at length all movement ceases. We have achieved death. That is what we call life ?,

Until that hour I knew nothing of Pirandello.

If any reader of this magazine is interested in such coincidences, let him at once get that remarkable book by the aviator J. W. Dunne, called ***An Experiment with Time*** in which the author shows how his dream-images which related to the near future were about equal in number to those which pertained to the immediate past. And why only in dreams ? he asks.

E. E. Speight.

More Coincidence

On a morning of Christmas ten years ago, a hundred miles worth of Hyderabad, I wrote the follwing lines.

O, if men only knew how wide the bounds
Of life attain, how vast our liberty,
How far beyond the incarcerating rounds
Of human reason nature makes us free,—
How little way our meagre efforts count
Within the eternal,—but a drop of spray
That threads the sunrays by the ceaseless fount
Of all creation, falls and melts away,—
Then would the soul pass unto revelation
As never dreams of a new birth foretold,
Each heart encountered we should know a nation
Greater than any of the worlds of old,
And on the waves of tumult find our rest,
Safe as the seabird, strengthened for high quest.

The same day I motored back to Hyderabad, passing a along the nineteen miles of new jungle road from Ganpur to Wadiaram, and in the evening I was reading an article by Daniel Rops on Pirandello, in which the following passages occur.

1. It is not two people, but ten, a hundred, a thousand different personalities, that the writers of to-day feel stirring within them.

The postman brings a letter from a friend
Gathering strength in Kashmir; at the end
This piece of information.

'Thanks for you inquiries. My poor wife
Has been bedridden all this year. Her life
Is one long tribulation.

Two days ago there came a wire to say
A baby boy was born; So any way
Four sons willl gather round me.

Four sons are mine; it makes me feel so old
And yet I am so young.' What he had told
So simply did astound me.

What could they mean, those things that in one hour
Invaded me, compelling with such power
The secret springs of wonder?

Had they been five or seven in a trice,
No miracle. But four things falling thrice
Is a new kind of thunder.

E. E. Speight.

Coincidences

What can they mean, these mystic answerings
Of circumstance,—there strangely congruous things
That seem so accidental?

Julian Huxley, entertainingly,
Declares the steps of evolution three,
Material, vital, mental.

But my rebellious thought insists on four,
Matter, then life, then mind, and still one more,
Soul, with its dream of Heaven.

And yet I feel such symmetry is wrong,
Too squarely tower-like to stand for long;
There should be five or seven.

Idly I turn the pages of a book
And am arrested; pityingly I look
On words that throb with sorrow.

'A mother had four sons who went to fight
On different fronts, and all were shot one night
And died before the morrow.'

The selfsame day the selfsame anguish wrings
Her lonely heart four times; four times the wings
Of death above her hover.

And yet they pass, leaving her worse than dead,
Stricken with pain of life, uncomforted,
And never to recover.

the dormant spirit of Indian Muslims than has been generally recognised. Dr. Iqbal is a poet with a mission and he has infused a dynamic energy into the hearts of the Muslims of India. May he be spared long to serve the cause he so dearly cherishes !

Before concluding we offer our hearty thanks to all the contributors of this issue, and especially to the past students of this university. We hope that more will come forward with original and intresting articles for the next number so that the English section may really be representative. All articles are welcome. They should normally be of a journalistic nature and limited to about a thousand words. It will greatly assist in the production of the magazine if the contributions are ***type written on one side of the paper only.***

EDITOR.

Hyderabad Civil Service.

We were sorry to learn the results of the recent Civil Service examination. We should like to see greater facilities for coaching for the examination and hope that candidates from this university will meet with better success next year. In connection with employment in the public services generally, we are grateful to our Chancellor for his promise to see that Osmania graduates are fairly treated in the matter of appointments. We attach great importance promise and wish to make it clear that we do not ask for preferential treatment but for equality only.

The Hostels.

We feel very happy to see our esteemed Pro-Vice-Chancellor, accompanied by the professors, paying occasional visits to the dining hall and thus giving the students an opportunity to come into contact with him.

In this connection we may be permitted to say that we feel the need of a provost, or some similar official so that all the hostel functions and activities may be made unified under his guidance.

Contributors to the present Number.

Our ex-adviser to the English section, Professor E. E. Speight, at our request has kindly contributed two poems for the current issue, for which we offer him our sincere thanks.

Our thanks are also due to Dr. A. Latif, formerly Professor of English, for the article which he has contributed on "Iqbal and World Order" which was read in the Town Hall at the occasion of the "Iqbal day" under the presidentship of Prince Walla Shan Nawab Azam Jah Bahadur. "The Iqbal day" was a gracious tribute paid to the world renowned poet, Dr. Iqbal, who has done more to awaken

Editorial.

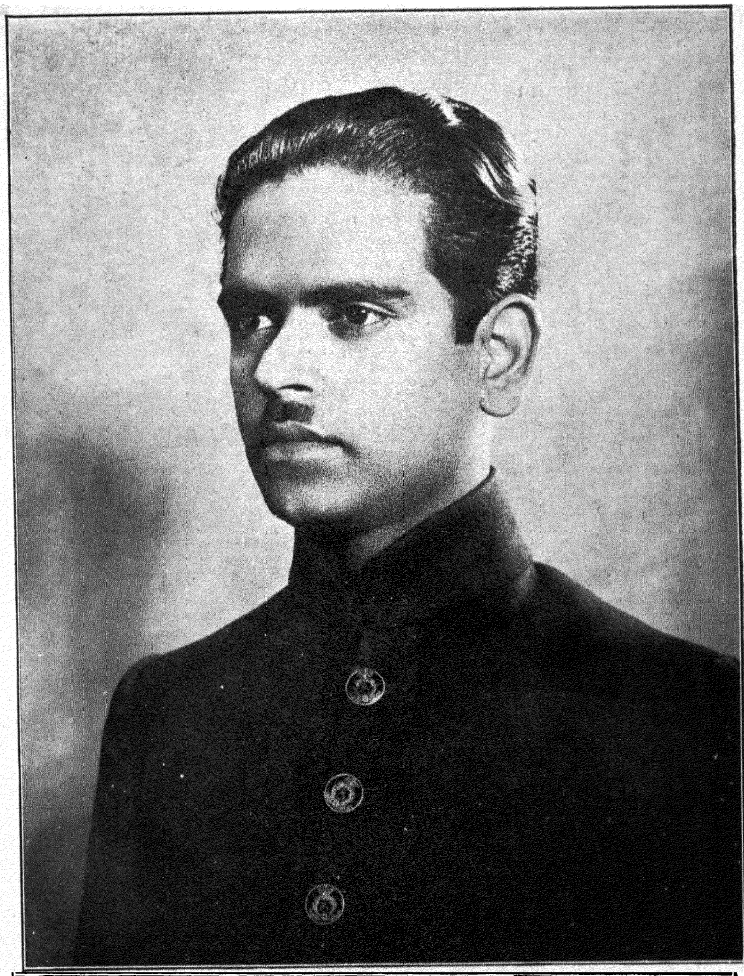
It is difficult for the editor of a College Magazine to collect articles for issue within a prescribed time especially when the examination is fast approaching. Thanks to the co-operation that was extended to us by all we could collect a fairly good number of articles for the present issue.

The Union.

For the first time in the history of our union, due to some slight misunderstanding, an attempt was made to move a vote of No Confidence in the present ministry, by some members of the cabinet who subsequently resigned. After many efforts and considerable disorder the movers withdrew the motion. We sincerely sympathise with the members who resigned and congratulate the ministry on the success which it achieved at this critical juncture.

Sports.

It is a pity that the standard of sports is day by day going down, and we request the authorities to take immediate action to stop this tendency. Some suggestions may not be out of place. The captains may be made members of games committees, so that they may explain their requirements and propose beneficial measures. Facilities might be given to the day students and some concessions with regard to attendance might be shown to sportsmen. We feel that such measures would have a good effect.



Mr. Mohamed Bin Omar
B. A. (Osmania)
President, Osmania University
Student's Union.

CONTENTS.

The Osmania Magazine

Vol. XI **Nos. 1 & 2**

Annual Subscription.

		Rs.
From Government	.. .. ..	12
,, Universities, other Institutions and State Officials	..	8
,, General Subscribers	.. ..	6
,, Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms	..	5
,, Present Students, Osmania University	..	4
,, Abroad	.. ..	Fifteeen Shillings.
,, Old Students, Abroad	..	Ten Shillings.
,, Single Copy	.. ..	Two Rupees.

Note:—Registrations and V.P.P. Charges Extra.

Can be had of :

OSMANIA MAGAZINE OFFICE,
OSMANIA UNIVERSITY.
HYDERABAD-DECCAN.

THE

OSMANIA MAGAZINE

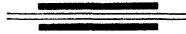
BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.



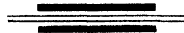
EDITOR

M. A. JABBAR, B.A., (Osman)

JOINT EDITOR

PADMANABH, B.Sc., (Osman)

Vol. XI 1938 Nos. 1 & 2



Printed at

THE OSMANIA PRINTING WORKS,

87-E & 87-F Kingsway, Sec'bad.